قیام امام حسینؑ کا جغرافیائی جائزہ

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"الحمدللہ الذی جعلنامن المتمسکین بالقرآن العظیم وبنبیہ

و اھلبیتہ المعصومین علیھم صلوۃ اللہ و الصلوۃ المصلین نتبراء من اعدائھم

واعداللہ اجمعین ،قال نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم :ان الحسین مصباح

الھدای و سفینۃ النجات"

پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی یہ حدیث کہ "حسینؑ ہدایت کے چراغ اور کشتی نجات ہیں" مسلم اور متواتر ہے فریقین کے نزدیک متفقہ علیہ ہے۔

یقیناً "حسینؑ" اس تاریکی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کیلئے روشنی کا مینار ہیں۔ ہر دور اور خصوصاً آج کے دور میں ظلمات کے اس بیکراں سمندر میں ڈوبتی ہوئی انسانیت کیلئے ایک سہارا اور نجات کی کشتی ہیں۔ اگرچہ ہمارے تمام آئمہؑ امت کے لئے ہدایت کی روشنی اور نجات کی کشتی ہیں لیکن ان دوصفات و امتیازات کا درخشان تاج جیسا "حسینؑ" ابن علیؑ کے سر پر سجا نظر آتا ہے ایسا کسی اور کے سر پر نہیں۔ اس لئے کہ یہ حسینؑ ابن علیؑ کی ذات ہے جس نے اپنے وقت کے طاغوت اور ظالم و جابر حکمران سے ایسے حالات میں ٹکر لی جب سب زبانیں خاموش، ہر طرف سناٹے کا عالم، امت شعور اور اپنے احساسِ ذمہ داری سے عاری تھی اور تو اور اس دور کی جید و ممتاز سیاسی، علمی و فقہی شخصیات ابن عباس جیسے حبر العلماء، ابو بکر مخزومی، عبداللہ بن عمر، احنف بن قیس جیسے باخبر اور ہوشمند لوگ بھی حسینؑ کو قعود و سکوت کا مشورہ دے رہے تھے اور اس وقت کے ضمیر فروشوں، دین فروشوں، منفعت پرستوں اور عہد جاہلیت سے بدتر جہلاء

کے خلاف قیام کرنے سے حسین ابن علیؑ کو باز رکھنے کی کوشش کر رہے اور پیش آنے والے سنگین خطرات سے ڈرا رہے تھے۔

لیکن جو خوف لاحق تھا وہ پورا ہو کر رہا، لوگوں نے اس چراغِ ہدایت سے روشنی اور ہدایت نہیں لی اور اس کشتی نجات میں سوار ہونے کی بجائے جہالت، آمریت، قتل و غارت گری، گمراہی اور ضلالت کے سمندر میں ڈوب گئے۔

اس چراغِ ہدایت کو بجھا دینے اور اس کشتی نجات سے کنارہ کشی کے نتیجے میں اپنے وقت کا بدترین حاکم آخر کار امت پر مسلط ہو گیا اور اس وقت سے لے کر آج تک بد سے بدتر اور ظالم سے ظالم تر حکمران امت پر مسلط ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ حکمران ایک وقت تک تو اسلام ہی کے نام پر اور اسلام ہی کا لبادہ اوڑھ کر خلیفۂ مسلمین کے نام سے امتِ اسلامی پر حکمرانی اور اسلام کی ریشہ کنی کرتے رہے لیکن پھر بھی غنیمت تھا کہ یہ لوگ اپنے اقتدار کی بقاء و دوام کی خاطر ہی سہی کم از کم اسلام اور مسلمانوں کے نام کو دنیائے کفر پر غالب رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بعد کے دور کے آنے والے حکمران تو ان سے بھی کہیں زیادہ بدتر ثابت ہوئے، انہوں نے تو علانیہ اور برملا اسلام کو بھی خیر باد کہنا شروع کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے ضمیر اور قوم فروشوں نے وطنِ اسلامی سے خیانت کرتے ہوئے اسلام و مسلمین کے مفادات کو بھی داؤ پر لگا دیا اور مغربی استعماری قوتوں کا مسلمانوں پر تسلط قائم کر دیا۔ اب تو وہ کھل کر کہنے لگے ہیں:

"دین انفرادی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اسلام میں حکومت یا حکمرانی کا کوئی خاص تصور نہیں ہے"

اسلام، مسلمانوں اور وطنِ اسلامی سے حکمرانوں کی دوری ہر روز بڑھتی جا رہی ہے مغربی ثقافت کا اسلامی ثقافت پر غلبہ روز بہ روز بڑھ رہا ہے اور امت اس حقیقت کو خوب سمجھ رہی ہے کہ ہم تیزی کے ساتھ زوال و سقوط کی طرف جا رہے ہیں۔

آج بھی امتِ اسلامی پیغمبرؐ کے روشن کئے ہوئے اس چراغ سے آنکھیں بند کئے ہوئے اوراس کشتیِ نجات سے کنارہ کشی کئے ہوئے تاریکی اورگمراہی کی موجوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

عقل وشعور رکھنے والوں اوراہلِ فکرونظر کے لئے لمحۂ فکریہ ہے، دانش اوردانشمندی کا تقاضہ ہے کہ پیغمبرؐ کی اس حدیث پرتجدیدِ نظر کریں اوردیکھیں کہ:

آیا پیغمبرؐ کی اس حدیث کی سند میں سقم ہے؟ یا راہِ حسینی اپنانا ہمارے مفادات سے متصادم ہے۔یا ہم اس حدیث کے مصداق حسین بن علیؑ کی راہ سے بالکل منحرف ہوچکے ہیں۔

حدیث کی سند میں تو کوئی سقم نظر نہیں آتا، یقیناً یہ ہماری ہی کورباطنی ہے کہ جس طرح کل حسینؑ کے دور میں امت پیغمبرؐ کی اس حدیث سے روگردانی کرکے ظلمت اورتاریکیوں کے سمندر میں ڈوب گئی، اسی طرح آج ہم بھی پیغمبرؐ کی اس حدیث کے مصداق حسین بن علیؑ کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، جس کے نتیجے میں ظالم حکمرانوں کے شکنجوں میں تلملا رہے ہیں۔ہماری مصیبت ہمارے اگلوں سے کہیں زیادہ ہے۔

اس دور کے لوگ یزید کو ایک منحرف اورظالم حکمران سمجھتے تھے، اس کی حکومت کو قرآن وسنت سے متصادم دیکھ رہے تھے، وہ لوگ حسینؑ کو اس منصب ومقام کے لئے لائق اورسزاوار سمجھتے تھے لیکن یزید کی حکومت کو برطرف کرکے حسین بن علیؑ کو اس منصب پر فائز کرنے کیلئے جن قربانیوں کی ضرورت تھی اس کی اہمیت اورشدت کو وہ درک نہیں کررہے تھے اورتردد اور کشمکش کا شکار تھے کہ آیا واقعاً یہ مسئلہ اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کیلئے اتنی قربانیاں دی جائیں؟ یا پھر وہ اس مسئلہ کو اورمسئلہ کی اہمیت کو درک کررہے تھے لیکن اس کیلئے اپنے مفادات، اپنا گھربار اوراپنے اہل وعیال کی جان کو داؤ پر لگا کر قربانی دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔بہرحال انہوں نے اس اہم مسئلہ پر اپنے مفادات کو مقدم رکھنے کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں حسینؑ کو تن تنہا اس میدان میں

آنا پڑا اوراپنی اوراپنے قلیل انصارواعوان کی قربانی دینی پڑی اور جو ہدف ومقصد حاصل کرنا چاہا تھا وہ حاصل نہ ہوسکا۔جن لوگوں نے اپنے مفادات اوراپنی زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے حسینؑ کا ساتھ نہ دیا انہوں نے اپنی زندگی میں چندروز کا اوراضافہ کرلیا لیکن اس چندروزہ زندگی میں نہ صرف یہ کہ وہ لوگ چین وسکون کی زندگی بسر نہ کرسکے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ کے لئے غلامی کا طوق ورثہ میں چھوڑ کر اپنی قبروں میں چلے گئے۔

آیئے! اب ذرا اپنے دور کے لوگوں کا جائزہ لیں۔اُس دور کے لوگ کم ازکم ایک تصور تو رکھتے تھے کہ ظالم حکمران کو ختم اورنابود ہونا چاہیے اورصالح حکمران کو اس منصب پر فائز ہونا چاہیے لیکن اپنے اس تصور کو وہ عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے تھے جب کہ آج کے دور کے مسلمان نے اس تصور کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے۔آج کے دور کا مسلمان اس تصور ہی سے عاری ہے کہ حکمران کو قرآن وسنت کی روشنی میں منتخب کیا جانا چاہیے اوراسلامی سربراہِ مملکت کو اسلام سے آشنا اوراسلامی احکام پر پابندِ عمل ہونا چاہیے۔آج کے دور کے مسلمان کے نزدیک اس شرط کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔گویا جیسے یہ شرط ہی لغو ہے۔اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج کا مسلمان قیام وانقلابِ حسینی کے اہداف ومقاصد کے بارے میں کل کے مسلمان کی نسبت زیادہ نابینا اورنا آشنا ہے۔

چنانچہ پیغمبرؐ کی حدیث کہ ''حسینؑ چراغِ ہدایت اورکشتیِ نجات ہیں'' کا مفاد ومفہوم عملی میدان میں نہ اُس دور میں تطبیق ہوا اور نہ آج کے دور میں۔خطیب اور ذاکر بار بار اس حدیث کی تلاوت کرتے ہیں اوراس حدیث کو امام حسینؑ کی عزاداری برپا کرنے کی سند میں پیش کرتے ہیں، یہ حدیث سنتے سنتے ایامِ عزا گزر جاتے ہیں لیکن ہمارے حالات بہتر ہونے کی بجائے بد سے بدتر ہوتے چلے جارہے ہیں، ترقی کی بجائے ہم زوال وسقوط کی طرف جارہے ہیں، ہماری نظریں ''چراغِ ہدایت اورکشتیِ نجات'' حسینؑ کی بجائے اپنے جاہ ومنصب، مقام ومنزلت، مال

وہ دولت اور اپنے مفادات کی طرف لگی ہوئی ہیں، ہم حسینیؑ کشتی اور اسلام کی کشتی میں سوار ہونے کی بجائے اجنبیوں اور بے دینوں کی کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں...... بالکل اسی طرح جیسے اس دور کے لوگ حسینؑ کے عقیدت مند اور حسینؑ کی حقانیت کا اعتراف کرنے کے باوجود اپنے مفادات کی خاطر ''کشتیِ اہلِ بیتؑ'' میں سوار ہونے کی بجائے بنی امیہ کی ''کشتی'' میں سوار ہو گئے۔

پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی اس حدیث کی سند کو تسلیم کرنے اور اس امر کا اعتراف کرنے کے بعد کہ اس حدیث کا مفاد و مفہوم ابھی تک تطبیق نہیں ہوا ہے، صاحبانِ عقل و شعور کے سامنے یہ سوال پیش آتا ہے کہ اس حدیث کے مفاد و مفہوم کو اپنے معاشرے میں تطبیق کرنے اور حسینؑ کو اپنی زندگی کے مسائل میں مشعلِ راہ بنانے اور ایک نئے عزم کے ساتھ ''حسینیؑ کشتی'' میں سوار ہونے کے لئے کیا لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے؟

اس سوال کا صحیح حل معلوم کرنے کیلئے حسینیؑ قیام و انقلاب کی بنیادی ابجد کے مسائل کو روشن کرنا ضروری ہے اور یہ تجزیہ کرنا ضروری ہے کہ حسین ابنِ علیؑ اپنی تحریک کے لئے کیا منطق پیش کرتے تھے اور یزید ابنِ معاویہ اور اس کے حامی افراد اس منصب پر قابض رہنے کی کیا منطق پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حسینیؑ منطق کو واضح اور روشن کرنے کے لئے آج ہمارے پاس کیا ذرائع اور وسائل میسر ہیں؟

قیام و انقلاب امام حسین - کی ابجد اور اس کے بنیادی نکات کا آغاز اس وقت کے خلیفۂ مسلمین یزید بن معاویہ کے اس حکمنامہ سے ہوتا ہے جس میں اس نے والیٔ مدینہ ولید بن عتبہ کو حکم صادر کیا کہ تمام اہلِ مدینہ سے بالعموم اور حسین ابنِ علیؑ سے بالخصوص مجھے بحیثیت خلیفۂ مسلمین تسلیم کراؤ اور ان سے میری بیعت لو۔ یزید کا یہ مطالبہ اس دعویٰ پر مشتمل تھا:

''میں امتِ مسلمہ کا خلیفہ ہوں، جس طرح پیغمبرؐ کے بعد دوسرے خلفاء اس منصب پر فائز ہوئے آج میں اس منصب پر فائز ہوں، اسلام مجھ کو چلانا ہے، اسلامی سرحدوں کا محافظ

میں ہوں، حدود و تعزیرات کو جاری کرنے کا حق مجھے ہے، جمعہ و جماعت کی امامت و قیادت کا حقدار میں ہوں لہٰذا میں کسی کو بھی اپنی حکومت کی مخالفت اور اس کو ختم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ یہ اجازت دے سکتا ہوں کہ کوئی کسی کو میری حکومت کے خلاف ورغلائے اور اٹھائے، جو بھی میری حکومت کے خلاف بغاوت، میری اطاعت کے خلاف سر اٹھائے گا میں اس کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا''۔

یزید کی اس منطق کے مقابلے میں حسینؑ نے فرمایا:

''یہ منصب ...... منصبِ نبوت و رسالت ہے، کوئی بھی فاسق و فاجر، قتل و غارت بپا کرنے والا، شراب پینے والا، علانیہ جرائم کا ارتکاب کرنے والا، مالِ مسلمین کو اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیر سمجھنے والا شخص اس منصب کا حقدار قرار نہیں پا سکتا، حکومت...... اسلام، قرآن اور سنت کی روشنی میں چلنا چاہیے، حکمران کو قرآن و سنت کی حدود میں رہنا پڑے گا، اگر کوئی حاکم اور سربراہ فسق و فجور کے ساتھ اس پر قابض ہو جائے تو اس کو ہٹانا ملت کے ہر فرد کے اہم ترین واجبات میں سے ہے''۔

یہ ہے قیامِ امام حسین - کی منطق کی ابجد اور اس کے بنیادی نکات۔ اس کی روشنی میں کیا آپ ان حقائق کو تسلیم نہیں کریں گے:

۔اس دور میں شراب نوشی کو یزید کے دور کے مقابلے میں کہیں زیادہ فروغ ملا ہے۔ حکومتی پرمٹ کے تحت شراب نوشی کیا اور اس دور کے مقابلے میں کہیں اور کئی گنا زیادہ نہیں؟

۔بے حجابی، عریانی، فحاشی، زنا اور شراب نوشی کو کیا آج کھلی چھٹی نہیں ملی ہوئی ہے؟

۔کیا آج مملکتِ اسلامی میں تعزیراتِ اسلامی اُس دور کے مقابلے میں کہیں اور کئی گنا زیادہ معطل نہیں ہیں؟

۔اس وقت صرف حکمرانوں کا انحراف حسینؑ کے لئے ناگوار اور قابلِ برداشت نہیں تھا"آج تو حکمرانوں کے انحراف کے علاوہ اسلام بھی تحریف کا شکار ہے۔اس وقت حکمرانوں کے انحراف کو نا قابلِ برداشت دیکھ کر امام حسینؑ اور ان کے شیدائیوں نے کہا تھا:

"ان حالات میں زندگی سے موت بہتر ہے اُس کی اصلاح کے لئے اپنی اور اپنی عزیزوں کی جانوں کی قربانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی"۔

لیکن ......آج کیا ملت نے اس مسئلہ کو طاقِ نسیان کی زینت نہیں بنا دیا ہے؟

آج اس مسئلہ کو کوئی اتنی بھی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں جتنی لوگ مستحبات اور مکروہات کو دیتے ہیں۔رہبری وقیادتِ امت کی مسئلہ کا جنازہ نکل چکا ہے'لیکن حسینیؑ چراغ تلے زندگی بسر کرنے والے ہم حسینیؑ عزاداروں کو یہ سب کچھ آخر کیوں نظر نہیں آ رہا ہے؟جب تک اس مسئلہ کو عزادارانِ حسینؑ تمام تر اہمیت اور اہتمام کے ساتھ وسیع پیمانے پر نہیں اٹھائیں گے ۔پیغمبرؐ کی حدیث ......"حسینؑ چراغِ ہدایت اور کشتیٔ نجات ہیں" کا مفاد ومفہوم تطبیق ہوتا نظر نہیں آئے گا۔

اس مسئلہ کو کس طریقے سے اٹھایا جائے؟اس کے لئے کن کن ذرائع کو اپنایا جائے؟اس کا صحیح اور حقیقت پسندانہ طریقہ کیا ہے؟ان سوالات کا جواب تحریر کرتے ہوئے ہاتھ تھرّاتا ہے اور دل لرزتا ہے۔ہمیں مخالفوں اور سیاستدانوں سے اتنا ڈر نہیں جتنا خود اپنے مذہبی حلقوں اور ان حلقوں سے اٹھنے والی چیخ وپکار سے ہے۔لیکن جو بھی ردِّعمل ہو اور جہاں سے بھی ہو ہم بہرحال اپنے دینی وظیفہ کو انجام دیتے ہوئے اس سلسلے میں چند تجاویز پیش کرنے کی جسارت کریں گے:

(۱) حوزہ ہائے علمیہ اور دینی مدارس سے فنِ خطابت اور تقریر سے لاتعلقی'دوری اور اجنبیت کو ختم کیا جائے'طلاب دینی میں امتِ اسلامی کو درپیش ضروری مسائل کو درک کرنے کی

صلاحیت اور ان میں اتنی قدرتِ بیان پیدا کی جائے کہ وہ وضاحت کے ساتھ ملت کو ان مسائل سے آگاہ اور روشناس کرا سکیں۔اس فرسودہ سوچ کو کہ "تقریر وخطابت انسان کو علمی صلاحیتوں اور بنیادی افکار سے دور کر دیتی ہے"اب ختم ہونا چاہیے۔یہ نظریہ کہ "تقریر وخطابت نادانوں اور جاہلوں کا پیشہ ہے" صحیح نہیں ہے نیز انبیاءؑ اور آئمہ اطہارؑ کی سیرت وکردار سے متصادم ہے......

کیا کتبِ عقائد میں "بحثِ نبوت وامامت" کے باب میں یہ نہیں لکھا کہ "انبیاءؑ اور آئمہؑ کو افصح اللسان اور ابلغ البیان ہونا چاہیے"

کیا یہ ذواتِ مقدسہ اپنے دور کے مبلغ اور خطیب نہیں تھے؟

کیا نوابغِ زمان اور مفکرینِ عالم کے بارے میں تاریخ میں یہ نہیں لکھا کہ یہ سب فصیح اللسان اور بلیغ البیان تھے؟

لہٰذا۔ مقررین اور خطیبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا آیات'روایات اور تاریخ سے ناآشنائی کی دلیل ہے۔علم وفکر کو اگر معاشرے اور امت میں نہ پہنچایا جائے اور مدرسہ کے بند کمروں اور لوگوں کے سینوں تک محدود رکھا جائے تو یہ علم وفکر اس خزانہ اور ذخیرہ کی مانند ہے جو زمینوں میں دفن ہے اور زمین پر رہنے والے بھوک اور فقر میں مبتلا ہیں۔حوزہ ہائے علمیہ اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل افراد اصول'فقہ اور فلسفہ کے کتنے ہی باریک دقائق اپنے سینوں میں رکھتے ہوں لیکن اگر وہ قدرتِ بیان نہ رکھتے ہوں تو وہ ایک ایسے گونگے انسان کے مانند ہیں جو قوتِ گویائی نہیں رکھتا۔

ہمارے ملک میں مومنین کے دین سے لگاؤ ہونے کے باوجود اسلامی معارف سے ناآشنائی کی سب سے بڑی وجہ ہی ہمارے علماء وفضلاء کی فنِ خطابت اور تقریر سے لاتعلقی ہے ۔اس کا سب سے بڑا نقصان ملتِ تشیع کو پہنچا ہے۔عزاداریٔ امام حسینؑ میں مدارسِ دینی

اورطلاب مدارس کی لاتعلقی اوراجنبیت کے نتیجے میں ناخواندہ اورکم مایہ افرادحسینیؑ منبر پر قابض ہوگئے اورملت کوقیامِ حسینؑ کے اہداف ومقاصد سے دوراور بے بہرہ رکھنے میں جوکردارانہوں نے ادا کیاوہ اظہرمن الشمس ہے۔

لہٰذاہم تمام علماءبزرگان اوراساتذۂ مدارس سے التماس کرتے ہیں کہ وہ خطابت وبلاغت سے کہ جوورثۂ انبیاءؑ وآئمہؑ ہے دوری اوراجنبیت اختیارنہ کریں اوراپنے مدارس میں فنِ خطابت وبلاغت کے لئے مقام، منصب اورنصاب وضع کریں تاکہ مدرسہ کے طلبہ میں قوتِ بیانی پیداہواوروہ قیام وانقلاب حسینیؑ کے اہداف ومقاصد سے امت کوکماحقہ آشنا کرائیں۔

اس ضرورت کے پیشِ نظرہم مخیّر حضرات سے بھی التماس کرتے ہیں کہ وہ آگے آئیں، جہاں انہوں نے اس سے پہلے سینکڑوں دینی مدارس، مساجداوربارگاہوں کی تعمیرمیں بڑھ چڑھ کرحصہ لیا، عزاداریٔ امام حسینؑ کے فروغ کی خاطربھی ایسے مخصوص مدرسوں کی بنیادڈالیں یااپنے سے منسوب مدارس میں فنِ خطابت وتقریرکونصاب میں شامل کرنے کے لئے اصحاب مدارس سے درخواست کریں کہ وہ ان مدارس میں امام حسینؑ کے خطبات، کلمات، تاریخ وسیرت اورکتبِ مقاتل کے بارے میں درس وتدریس اورتخاطب وبیان کاسلسلہ شروع کریں۔

(۲) گزشتہ چودہ سوسال کے عرصے سے لےکراب تک قیام وانقلاب امام حسینؑ سے متعلق تاریخ، مقاتل اورکتبِ سیرت میں بہت کچھ تحریف ہوئی ہے، بے شمارلغوداستانیں، قصے، کہانیاں، لوگوں کے بے سروپاخوابوں کوکربلا کی داستان بناکرحسینی انقلاب کے خدوخال کومسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسلام اورحسینؑ کے دشمنوں نے اپنی تحریفات کے ذریعہ امامؑ کے قیام وانقلاب کی سمت اورجہت کومنحرف کرنے میں کوئی کسرنہیں اٹھارکھی۔ آج ضرورت اس امرکی ہے کہ تحقیق، تنقیداورریسرچ کےادارے قائم کئے جائیں اوران تمام تحریفات کی تطہیر(Screening) کی جائے۔

(۳) آج کادور مشینی دورہے، ہرشخص غمِ روزگارمیں مبتلااورمصروف ہے۔ اگرچہ لوگ دین شناسی اوردین سے آگاہی کاذوق رکھتے ہیں لیکن کسی کے پاس ضخیم کتابوں کے پڑھنے کاوقت اورفرصت نہیں۔ معاشرے کاپڑھالکھاطبقہ خصوصاً وکلاء، ڈاکٹر، انجینئر حضرات کواپنے پیشے سے متعلق کتب بینی اورمطالعہ کے بعد اتناوقت نہیں ملتا کہ وہ دین شناسی اورحسینؑ شناسی سے متعلق بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کاوقت نکالیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ قیامِ حسینیؑ اورعزاداری سے متعلق تحقیقی مقالہ جات، استفسارا ورجوابات پرمشتمل باوقارمجلّات کی اشاعت کی جائے تاکہ علمی بنیادوں پرنئی تحقیقات اورتجاویزکوعام کیاجائے۔

اس سلسلے میں علماءاوررودمنددانشورانِ قوم کوچاہیے کہ وہ اپنی دینی مسئولیت کوپوراکریں اوراس خلاءکوپُرکرکے حسینؑ کی عظیم قربانی کاصلہ اوراجرِ رسالت اداکریں۔

(۴) ہمارے ملک میں امام حسین ؑ کے کلمات اورخطبات پرمشتمل اورقیام وانقلاب حسینیؑ سے مربوط کتب اردوزبان میں موجودنہیں اگرہوں بھی تونہ ہونے کے برابراس لئے کہ وہ بازارمیں نظرنہیں آتیں۔ اس لئے قوم کے کچھ باصلاحیت افراد ایسی کتب کی دستیابی، ان کی ترتیب وتنظیم اوراردوزبان میں ان کے ترجمہ اورطباعت کی ذمہ داری کابیڑہ اٹھائیں اورحسینؑ کے سامنے سرخرواورعنداللہ ماجورہوں۔

(۵) ہمارے ملک میں مطالعۂ کتب کاذوق افسوسناک حدتک کم ہے۔ اس لئے نوجوانوں کواس کی تشویق اورترغیب دلائی جائے اوراس کے لئے ملک میں جس طرح ذہنی آزمائش کے لئے سیاسی، معاشرتی، فقہی، عقیدتی مسائل پرسوال وجواب کے امتحانات کاطریقہ رائج ہے اسی طرح قیامِ حسینؑ اورعزاداریٔ امامؑ سے مربوط سوالات وجوابات کے ذہنی آزمائش کے پروگرام ملک کی گوشہ وکنارمیں رائج کئے جائیں اوراس پرانعامات بھی رکھے جائیں تاکہ نوجوانوں میں ذوق وشوق پیداہو۔

(۶) قیام و انقلاب امامؑ میں بے شمار سبق موجود ہیں مثلاً:

۔ظالم و جابر حکمران اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کی بقاء اور دوام کے لئے ظلم و بربریت اور جرم و جنایت کے کیسے کیسے مکروہ اور گھناؤنے طریقے اپناتے ہیں اور پستی کی کن گہرائیوں میں غرق ہو جاتے ہیں ۔یا مثلاً:

۔دنیاوی مقام و منصب کے لالچ میں عمر سعد جیسے پست فطرت لوگ حکمرانوں کی کاسہ لیسی اور خوشامد میں کیسے کیسے بھیانک جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور حق و حقیقت کا درک رکھنے کے باوجود دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی مول لے لیتے ہیں۔

چنانچہ ضرورت ہے کہ ان واقعات کو تحریروں اور تقریروں میں مقامِ حیرت اور درسِ عبرت کے طور پر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اجاگر کیا جائے تاکہ عزادارانِ حسینؑ خطیبوں اور ذاکروں کو دادِ سخن دینے کی بجائے اپنی ''خودسازی'' کریں۔

اس کے علاوہ عزادارانِ حسینؑ کو اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ امام حسین-کی راہ اپنے کیلئے صرف امامؑ کی معرفت اور امامؑ کی حقانیت کا ادراک ہی کافی نہیں ہے بلکہ خود میں حرارتِ ایمانی، جذبۂ ابراہیمی اور جراتِ رندانہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ایک ایسی ''حرارت'' ایک ایسی ''رندانہ جرات'' جو حق و حقانیت کی معرفت کے بعد حق کی خاطر جب ''آتشِ نمرود'' میں کودنے کا وقت آئے تو اس امتحان میں نہ آل و اولاد کی محبت آڑے میں آنے پائے، نہ گھر بار چھن جانے کا ڈر۔ورنہ کربلا کی خونی داستان میں بہت سے ایسے لوگ نظر آئیں گے جو حسینؑ کی کماحقہ معرفت رکھنے کے باوجود اہل و عیال کی جدائی کے ڈر اور گھر بار چھن جانے کے خوف سے امامؑ کی نصرت سے کنارہ کش رہے بعض نے یزید کے لشکر میں بھی شمولیت اختیار کی اور بعض نے راہِ فرار اختیار کی۔

(۷) اس وقت اس ملک میں عزاداریٔ امام حسین-شیعہ قوم کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے اور یہ مسائل ایک ایسے ملک میں پیش آ رہے ہیں جہاں نوے فیصد مسلمان رہتے ہیں۔یہ مسئلہ نہایت غور طلب اور فکر انگیز ہے ۔علماء، دانشور، شیعہ، سنی غرض معاشرے کا ہر طبقہ خصوصاً شیعہ حضرات اور عزادارنِ امامؑ بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سوچیں اور فیصلہ کریں:

کیا ہمارے دیگر مسلمان بھائیوں کو حسینؑ پسند نہیں ہیں یا ہماری عزاداری کے طور طریق ناپسندیدہ ہیں؟

ان کو اگر حسینؑ پسند نہیں تو پھر ہمیں چاہیے کہ صدرِ اسلام سے دورِ حاضر تک خلفاء، اصحاب، تابعین اصحاب، علماء، اکابرین، بزرگ، دانشور اور مفکرین کی وہ آراء اور نظریات جو انہوں نے فضائلِ حسینؑ کے سلسلے میں بیان فرمائے ہیں انہیں جمع کر کے سامنے لائیں اور نشر و اشاعت کے ذریعے ان تک پہنچائیں۔

اور اگر ہماری عزاداری کے طور طریق یا بعض رسومات ان کو ناپسند ہیں یا جن سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے تو وحدتِ امت کی خاطر اور استعمار اور دشمنانِ اسلام کے مسلمانوں کے درمیان اختلاف و انتشار پھیلانے کے مذموم عزائم ناکام بنانے کی خاطر بحث و گفتگو کرنا چاہیے اور ان چیزوں کو جن کو ہم نے صرف اپنی انا کی خاطر قومی وقار بنالیا ہے اور جن کے چھوڑنے سے روحِ عزاداری متاثر نہیں ہوتی ہے ان سے دستبردار رہنا چاہیے۔

(۸) امام حسین-کے شیعہ اور عقیدتمند ہر سال ایامِ عزا میں کسی نہ کسی بہانے اور کسی نہ کسی انداز سے حسینؑ کے نام پر خرچ کرنا اپنے لئے باعثِ اجر و ثواب اور اپنے قلب کے لئے باعثِ اطمینان و سکون محسوس کرتے ہیں ۔ان خرچ کی جانے والی رقوم میں یقیناً بعض اخراجات نہایت موزوں اور مناسب ہوتے ہیں اور عقل و شرع بھی ایک حد کے اندر ان اخراجات کو مستحسن قرار دیتی ہے ۔مثلاً بزمِ عزا میں موجود عزاداروں کے لئے غذا اور کھانے کا اہتمام کرنا یا ان میں کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کرنا یقیناً نیک اور مستحسن عمل ہے ۔لیکن بعض اخراجات ایسے ہوتے

ہیں جن سے نہ کسی مومن کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے' نہ یہ اخراجات کوئی فکری یا مادی سرمایہ چھوڑتے میں مدد اور معاون ثابت ہوتے ہیں' نہ ان اخراجات کے ذریعہ کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے اور نہ ہی ان اخراجات کے ذریعہ عظمتِ حسینؑ اور عظمتِ اسلام کا کوئی مظاہرہ ہوتا ہے۔

حسینؑ کے نام پر خرچ کیا جانے والا سرمایہ معقولیت پر مبنی ہونا چاہیے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حسینؑ کے نام پر خرچ کیا جانے والا سرمایہ خود حضرت ابی عبداللہ الحسینؑ کے قیام و انقلاب کے مقدس مقصد پر اور ان اہداف کی نشر و اشاعت پر خرچ ہو۔ مثلاً سیرت و حیاتِ امام حسینؑ سے مربوط کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ان کتابوں کو بطور تبرک تقسیم کرنے پر رقم خرچ کی جائے۔ ایسی کتابوں کو کم قیمت پر فراہم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ عزاداری اور اہدافِ قیامِ امام حسینؑ کو فروغ حاصل ہو۔ امام حسینؑ کے نام پر ایسا بامقصد اور باہدف انفاق انشاء اللہ اجر و ثواب کا موجب اور امام حسینؑ کے نزدیک مورد پسند ہوگا۔

ان تمام تجاویز کو پیش کرنے سے ہمارا مقصد ہرگز ہرگز معاشرے میں موجود معقول رسومِ عزاداری پر تنقید کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو باہدف اور بامقصد بنانا مطلوب ہے۔ کیونکہ عزاداریٔ امام حسینؑ میں وقتی عواطف' احساسات اور جذبات پر مشتمل بے مقصد رسومات دیرپا اور دوررس اثرات کی حامل نہیں ہوتیں۔ شاید ہماری عزاداری اس لئے غیر موثر اور دوسروں کے لئے ناپسندیدہ ہوتی جارہی ہے کہ اس میں عقل و منطق کا دخل کم رہ گیا ہے ورنہ جو عمل عقل و منطق اور دلیل و برہان پر مبنی ہو اس سے کوئی بھی صاحبِ عقل اور ذی فہم اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔

اس لئے نامِ حسینؑ اور قیامِ حسینؑ کی اصل روح کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے ان طور طریق اور رسومات کو اپنانا چاہیے جو زندگی ساز اور کردار ساز ہوں اور ہماری عزاداری اس حقیقت کی آئینہ ہو کہ ہم نے اپنی عملی زندگی میں پیغمبرؐ کی اس حدیث کو رچا بسا لیا ہے کہ حسینؑ حقیقت میں ہمارے لئے چراغِ ہدایت اور کشتیٔ نجات ہیں۔

آخر میں ہم اپنے ذہن میں موجود خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے اور ان کی تنظیم و ترتیب' تزئین و تہذیب کے سلسلے میں برادرِ محترم سید ابرار حسین رضوی کی گرانقدر مساعی پر ان کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ خدا ہمیں اس چراغِ ہدایت کی روشنی میں حقائق کے ادراک اور اس کشتیٔ نجات کے ذریعے ساحلِ نجات تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اگر یہ ناچیز کاوش بارگاہِ احدیت میں شرفِ قبولیت سے ہمکنار ہو تو میں اسے اپنے والدین' عزیز و اقارب' علماء و شہداء اور تمام مومنین و مومنات کی ارواح کے ایصالِ ثواب کے لئے ہدیہ کرتا ہوں۔

والسلام

علی شرف الدین موسوی

۷/ ذیقعدہ ۱۴۱۷ھ

کراچی

تمہید:

دنیا بھر میں ہر قیام و انقلاب کے لئے موسس اور بانیٔ انقلاب اپنی بصیرت' فراست اور تدبر سے اپنے انقلاب کے آغاز کے لئے کسی خاص زمان و مکان کا انتخاب کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جہاں بھی افراد جمع ہو جائیں اور آواز لگائیں وہیں سے قائدِ انقلاب اپنی تحریک کا آغاز کر دے۔ انقلاب کے لئے ہر وقت اور ہر زمین سازگار نہیں ہوتی۔

جہاں تک زمان و مکان کا تعلق ہے تو انقلاب کے لئے اس کا انتخاب اتفاقی نہیں ہوتا۔ اپنی نہضت اور انقلاب کے لئے بانیانِ انقلاب سختیاں جھیلتے ہیں' مصیبتیں برداشت کرتے ہیں اور مناسب زمان و مکان کی تشخیص اور تعین کے لئے انتظار کرتے ہیں۔

البتہ کبھی بیرونی حالات کی دگرگونی کے سبب انقلاب کا پروگرام فاش ہو جاتا ہے

اورہنگامی اعلان کرنا پڑجاتا ہے ۔مثلاً زید بن علی نے اپنے انقلاب کے لئے ایک وقت معین کر رکھا تھا لیکن اسرار فاش ہونے کے سبب انہیں ہنگامی طور پر اپنے انقلاب کا اعلان کرنا پڑا۔اسی طرح مسلم بن عقیل اپنے انقلاب کے آغاز کے لئے امام حسینؑ کی آمد کے منتظر تھے کیوں کہ انقلاب کے لئے وہی وقت معین تھا لیکن عبیداللہ بن زیاد کی کوفہ آمد اور ہانی بن عروہ کی گرفتاری کے سبب قبل از وقت ہنگامی طور پر انقلاب کا اعلان کرنا پڑا ۔یا مثلاً پیغمبر اسلامؐ جب تک سرزمین مکہ میں تھے آپؐ نے مکہ کو اپنے لئے سازگار نہ پایا اس لئے ہمیشہ ایک ایسی جگہ کی تلاش میں رہے جہاں سے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔اسی طرح امام حسینؑ کا قیام بھی اس اصول سے خارج نہیں تھا بلکہ کسی مناسب زمان ومکان کے انتخاب کا محتاج اور نیازمند تھا۔جہاں تک انتخاب زمانی کا تعلق ہے اس موضوع کو ہم یہاں زیر بحث نہیں لاتے اور کسی اور وقت کے لئے چھوڑتے ہیں البتہ یہاں ہم انتخاب مکانی کے بارے میں بحث کریں گے۔

امام حسین -کے جغرافیائی قیام سے ہماری مراد وہ اماکن اور وہ مقامات ہیں جن کا ذکر قیامِ امام حسینؑ کے سلسلے میں آتا ہے' قطع نظر اس سے کہ امامؑ اس جگہ ٹھہرے یا صرف اس جگہ سے گزرے یا آپؑ کے دورانِ قیام ذہضت میں کسی اور عنوان سے اس جگہ کا ذکر ہوتا ہے۔ہم ان مقامات' وہاں پیش آنے والے واقعات اور ان جگہوں کے بارے میں تفصیل سے بیان کریں گے اس دوران ہم اس قیام ذہضت میں پیش آنے والی ترتیب کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کریں گے۔

مدینہ

سب سے پہلی جگہ جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا وہ مدینہ ہے۔مدینہ شہر کا نام ہے اور خود "مدینہ" کے معنی شہر کے ہیں یعنی وہ کسی خاص شہر کا نام نہیں بلکہ وہ کسی شہر کی طرف منسوب ہوتا ہے جیسے:

مدینۂ اصفہان یعنی اصفہان کا شہر۔

مدینۂ کراچی یعنی کراچی کا شہر۔

یا مدینۃ الاسلام یعنی اسلام کا شہر وغیرہ۔

مدینہ کا اصل نام یثرب ہے۔اسی سے اسے "یثربی" بھی کہتے ہیں اور "اثربی" بھی۔یثرب کے لغوی معنی تغیر تو بیخ اور فساد کے ہیں' مثلاً آیت میں کہتے ہیں:

﴿لاتثریب علیکم﴾ (یوسف/۹۲) "یعنی تمہارے لئے کوئی حرج نہیں......کوئی ملامت نہیں"

اس جگہ کا نام یثرب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس مقام کو سکونت کے لئے انتخاب کرنے والا شخص "یثرب" تھا لیکن یثرب کون تھا اس کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے ۔اصل واقعہ اس طرح ہے کہ جب حضرت نوحؑ کی کشتی کوہ جودی پر رک گئی تو وہاں کشتی سے اتر کر اسّی (۸۰) آدمی نکل کر شہر بابل میں داخل ہوئے ۔اس وجہ سے اس کا نام "ثمانین" رکھا گیا ۔کچھ عرصہ بعد نمرود بن کنعان بن سام بن نوح اس شہر پر مسلط ہو گیا۔اس کے ظلم وتشدد سے کچھ لوگ فرار ہو گئے ۔ان میں سے دو افراد کے نام یثرب تھے ۔ایک نام یثرب بن قانیہ بن مُہلائیل بن ارم بن عبیل اور دوسرا یثرب بن عبیل بن عوض بن ارم تھا۔بہر حال ان دونوں میں سے جس کسی نے یہاں پہلے سکونت اختیار کی اس کے نام کی مناسبت سے اس کا نام یثرب پڑ گیا۔

پیغمبر اسلامؐ کے مدینہ آنے کے بعد تک اس شہر کا نام یثرب تھا ۔پیغمبر اسلامؐ نے اس کا نام بدل کر طیبہ (طیبہ وطابہ) رکھا ۔چنانچہ ابنِ عباس کا کہنا تھا کہ اس کے بعد اگر کوئی شخص اس شہر کو یثرب کہے تو تین بار استغفار کرنا پڑے گا۔بعد میں عام لوگ طیبہ کی بجائے مدینۃ الرسولؐ کہنے لگے ۔رفتہ رفتہ لفظ رسولؐ کو حذف کرکے الف لام عہد ذہنی لگا کر المدینہ کہنے لگے ۔کچھ

عرصہ گزرنے کے بعد الف لام بھی حذف ہو گیا اور اسے صرف مدینہ کہا جانے لگا۔ عام طور پر جب صرف مدینہ کہا جاتا ہے تو اس سے صرف یہی شہر مراد ہوتا ہے۔

اس شہر کو پیغمبر اسلامؐ کی میزبانی اور اسلام کے پھلنے پھولنے کی جگہ ہونے کی وجہ سے یا اسلام کی پہلی مسجد مسجدِ نبوی ہونے کے سبب اس شہر کے مختلف نام وضع ہوئے لیکن سب سے معروف نام مدینہ ہی ہے۔ اس شہر کی فضیلت اور اس شہر کے بابرکت ہونے کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی بہت سی روایات ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"جو شخص اس مدینہ کی گرمی برداشت کرتے ہوئے یہاں قیام کرے گا قیامت کے دن ہم اس کے شفیع ہوں گے"

پیغمبر اسلامؐ جب مکہ چھوڑ رہے تھے تو آپؐ نے خدا کی بارگاہ میں دعا کی:

"خداوندا! تو نے مجھے اپنی بہترین زمین سے نکالا ہے تو اب مجھے اپنی بہترین جگہ عنایت فرما"

جب آپؐ مدینہ پہنچے تو آپؐ نے دعا کی:

"خداوندا! اس زمین کو ہمارے لئے جائے قرار دے اور یہاں وسعتِ ارزاق عطا فرما" پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"کوشش کرو کہ موت تمہیں مدینہ میں نصیب ہو۔ جو شخص مدینہ میں مرے میں اس کا شاہد و شفیع ہوں گا"

غرض اس شہر کے بہت سے نام ہیں جن میں مدینہ طیبہ معروف ہے۔

یہ شہر اسلام اور مسلمین کا موردِ عنایت اور مرکز توجہ تھا کیوں کہ اسی شہر سے اسلام کو فروغ ملا اور یہیں سے اسلام کو شہرت بھی ملی۔ اطراف و جوانب سے آنے والے مسلمانوں کو پناہ بھی اسی شہر میں ملی۔ اسلام کے طفیل و برکت سے یہ شہر فرشتگانِ الٰہی کی قدم گاہ بنا۔ اس شہر میں رسول اللہؐ

کا روضۂ مطہر ہے۔

یہ شہر اہل بیت اطہارؑ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ امام حسینؑ کی خصوصی عنایات و توجہ بھی اسی شہر کو حاصل تھی۔ کیونکہ یہاں رسول اللہؐ کا روضہ ہے، فاطمہ زہراؑ کی قبر ہے، امام حسنؑ اور اہل بیت اطہارؑ کی قبور مطہرہ اسی شہر مدینہ میں ہیں۔

امام حسینؑ اور دیگر اہل بیت اطہارؑ کو جتنی زیادہ محبت اور لگاؤ اس شہر مدینہ سے ہے اتنی ہی نفرت و عناد بنی امیہ کو اس شہر سے رہی۔ معاویہ اور یزید کو اس شہر سے نفرت تھی۔ یزید کی اس شہر سے نفرت کی چند وجوہات اور اسباب ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ تھی کہ مشرکین کے دشمنوں اور ان کے نزدیک ناپسندیدہ افراد کو اس شہر والوں نے پناہ دی۔

(۲) پیغمبر اسلامؐ اور مشرکین کے درمیان ہونے والی جنگوں میں اس شہر کے رہنے والوں نے ہمیشہ رسول اسلامؐ کا ساتھ دیا یہاں تک کہ مسلسل اور پیہم ناکامیوں کے نتیجے میں کفار و مشرکین کو حضرت محمد ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

(۳) حضرت علیؑ اور معاویہ کے درمیان جنگ میں انصار مدینہ نے حضرت علیؑ کا ساتھ دیا۔ اور ایک دو افراد کے علاوہ اہلِ مدینہ میں سے کسی نے معاویہ کا ساتھ نہیں دیا۔ معاویہ کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس کے مقابلہ میں انصار مدینہ نے ہمیشہ علیؑ کا ساتھ دیا۔

(۴) پیغمبر اسلامؐ کے زیادہ تر اصحاب اسی شہرِ مدینہ میں رہتے تھے اور وہ خود کو یزید کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔

خلافت کے لئے اگر کسی شوریٰ کا قیام عمل میں آتا اور اہلیت اور صلاحیت کی بنا پر خلیفہ کا انتخاب ہوتا تو یزید کے مقابلہ میں اس شہر میں بسنے والے اصحاب خلافت کے زیادہ اہل

اور سزا وار قرار پاتے ۔اس لحاظ سے یہ شہر یزید کے حریفوں اور رقیبوں کا شہر تھا۔

(۵) مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ بنی ہاشم کا مرکز بنا اور شام بنی امیہ کا ۔چنانچہ یزید اس شہر کو اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ یہ بنی ہاشم کا مرکز ہے اور خصوصاً اس لئے کہ بنی ہاشم کے آقا و سردار امام حسینؑ یہاں قیام پذیر تھے ۔

(۶) رسول اللہؐ کے خلاف بنی امیہ کے دلوں میں جو بغض وعناد بھرا ہوا تھا وہ کسی طور کم نہیں ہوا تھا بلکہ وہ کدورت بدرجہ اتم ان کے دلوں میں موجود تھی اور اس کی وجہ سے وہاں روضۂ رسول کا ہونا بھی ہے؛ جس کا اظہار معاویہ نے کئی مرتبہ کیا۔

غرض بنی امیہ کے لوگ اس شہر کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ صرف پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس شہر سے نفرت، کینہ اور بغض رکھتے تھے ۔اس بغض وکینہ کا واضح ثبوت یہ ہے کہ معاویہ نے مروان بن الحکم اور عمر بن سعید اشدق جیسے بدترین دشمنِ رسولؐ کو یکے بعد دیگرے اس شہر پر گورنر کی حیثیت سے مسلط رکھا اور اس طرح اہلِ مدینہ سے انتقام لیا۔اس کے علاوہ اپنی خلافت کے استحکام کے لئے یزید نے اسی شہر مدینہ سے دہشت گردی اور قتل وغارتگری کا آغاز کیا۔

حسینؑ اور مدینہ

امام حسین -۳ر شعبان المعظم ۳ھ کو نبوت وامامت کے گھرانے میں آنکھ کھولی ۔اس مولودِ سعید کے مراسمِ ولادت پیغمبر گرامیؐ نے خود بہ نفسِ نفیس انجام دیئے ۔اہلِ مدینہ نے پیغمبر اسلامؐ کی زبانِ اطہر سے یہ الفاظ سنے:

"یہ حسینؑ میری روح، میرا قلب اور میری آنکھوں کا تارا ہے، یہ مجھ سے ہے، میں اس سے ہوں، یہ بیٹھیں تو امام ہیں کھڑے ہوں تو امام ہیں، یہ جنت کے جوانوں کے سردار اور آقا و مولا ہیں ......"

اہل مدینہ نے بارہا حسینؑ کو رسولؐ کی گود میں، رسولؐ کی پشت پر اور رسولؐ کے دوشِ

مبارک پر دیکھا، یہ حسینؑ خامسِ اصحابِ کسا ہیں، یہ نہ صرف زہرا =اور پیغمبر ختمی مرتبتؐ کے دل وجان ہیں بلکہ یہ اہلِ مدینہ کے بھی محبوب اور عزیز ہیں ۔

حسینؑ اس شہر مدینہ میں سات سال اپنے جد پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ اور بتیس (۳۲) سال اپنے پدر بزرگوار علی مرتضیٰؑ کے ساتھ رہے جس میں خلفائے راشدین کا پچیس سالہ دور بھی شامل تھا۔۱۱ سال اپنے بھائی امام حسنِ مجتبیٰؑ کے ساتھ مدینہ میں رہے ۔غرض پانچ سالہ کوفہ کی زندگی کے علاوہ اپنی ستاون (۵۷) سالہ عمر مقدس حسینؑ نے مدینہ میں گزاری۔

امام حسینؑ جہاں اہلِ علم وفضل اور اہلِ دانش کے لئے باب مدینۃ العلم تھے وہاں وہ قرضداروں، بے نواؤں اور حاجتمندوں کے لئے باب الحوائج تھے محتاجوں اور قرضداروں کی امیدیں اسی حسینؑ سے وابستہ تھیں ۔بیرونِ مدینہ سے آنے والے لوگ حسینؑ کا در ڈھونڈتے تھے اور پوچھتے تھے کہ حسینؑ بن علیؑ کا گھر کہاں ہے؟ حسینؑ نے حاجتمند اور سائل کو حاجت روائی کے دوران کسی شرمندگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔چنانچہ ایک مرتبہ ایک سائل کی حاجت روائی کے موقع پر امام حسینؑ نے خود کو دروازے کے پیچھے چھپا کر رقم عطا کی تا کہ سائل شرمسار نہ ہو۔یکا یک سائل نے رونا شروع کیا۔امامؑ نے فرمایا کہ مجھے معاف کر دو۔اگر میرے پاس اور ہوتا تو میں تمہیں اور دیتا۔سائل نے عرض کیا کہ مولا ایسا نہیں ہے ۔آپؑ نے میری حاجت سے زیادہ عطا فرمایا ہے میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ ایک دن یہ دستِ جود وسخا پیوند زمین ہو جائیں گے ۔غرض امام حسینؑ اہلِ مدینہ کے لئے جود وسخا کے مرکز ومنبع تھے ۔

۲۶ ر رجب المرجب سن ۶۰ھ کو والئ مدینہ ولید بن عتبہ کو معاویہ بن ابوسفیان کی موت کی خبر ملی ۔ولید بن عتبہ بنی امیہ میں سب سے زیادہ اہلِ علم ودانش، فہم وفراست کا مالک، صاحبِ حکمت اور مدبر سمجھا جاتا تھا۔ولید کے والئ مدینہ ہونے اور خاندانِ بنی امیہ کا ایک معزز فرد ہونے کی وجہ سے بنی امیہ کے زعیم ورئیس اور خلیفۃ المسلمین معاویہ بن ابی سفیان کی موت اس کے لئے

کچھ زیادہ ہی افسوس ناک تھی۔اس کے لئے یہ خبر زیادہ پریشان کن اس وجہ سے بھی تھی کہ نئے خلیفہ یزید نے اپنے باپ معاویہ کی موت کی خبر دینے کے ساتھ ساتھ ولید کو اس امر پر مامور کیا تھا کہ وہ حسینؑ بن علیؑ سے ہر صورت میں بیعت لے اور انکار کی صورت میں ان کا سر کاٹ کر اس کے پاس بھجوادے۔اس حکم نے ولید کو ایک عجیب دوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا' گویا اس کے ہاتھ میں ایک دودھاری تلوار تھما دی گئی تھی۔ایک طرف یزید کا حکم تھا جس کی تعمیل میں اس کے اقتدار اور اس کی خاندانی حکومت کی بقا کی ضمانت تھی جب کہ دوسری طرف امام حسینؑ جیسی شخصیت کے قتل کے نتائج بھی اس کی نظروں کے سامنے تھے۔وہ دیکھ رہا تھا کہ اگر وہ حسینؑ کو قتل کرتا ہے تو تنہا اس کے لئے نہیں بلکہ قتلِ حسینؑ کا گھناؤنا جرم بنی امیہ کے پورے خاندان کی ہلاکت کا سبب بن جائے گا اور حسینؑ کا قتل بنی امیہ کے کفر و شرک اور اسلام دشمنی کو بے نقاب اور طشت ازبام کر دے گا۔

ولید یزید کا خط سامنے رکھ کر اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ دونوں صورتوں میں سے کون سی راہ اختیار کرے۔سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ یزید کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے اور حسینؑ قتل بھی نہ ہوں۔یزید بھی اس سے خوش رہے اور حسینؑ کے خون سے اس ہاتھ بھی رنگین نہ ہوں۔وہ سوچ رہا تھا کہ یزید کی حکومت کو استحکام بخشنے اور اس کو خوش رکھنے کے لئے کس طرح خوش اسلوبی' خوش کلامی اور احترام کے ساتھ حسینؑ کو آمادہ کرے۔لیکن کافی غور و خوض کے باوجود وہ کسی نتیجہ پہ نہ پہنچ سکا۔اسی فکر و پریشانی کے عالم میں اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ اس سلسلہ میں مروان بن الحکم جیسے جہاندیدہ اور عمر رسیدہ شخص سے مشورہ لیا جائے جب کہ وہ بنی امیہ کے خاندان کے مصالح کو بہتر طریقہ پر سمجھتا بھی ہے۔مروان اگر چہ ولید کا حریف و رقیب تھا لیکن "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق نہ چاہتے ہوئے بھی ولید نے اپنے حریف مروان کو مشورہ کے لئے دارالامارہ میں بلایا' معاویہ کی موت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تنہائی میں اس مسئلہ کو مروان کے

سامنے رکھا اور اس سے مشورہ طلب کیا کہ یزید کی مطالبۂ بیعت کی خواہش کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے۔

مروان ایک طرف تو امام حسینؑ سے انتہائی عداوت اور بغض و عناد رکھتا تھا' دوسری طرف خلافت اور گورنری کے لالچ کی وجہ سے وہ یزید اور ولید دونوں کا بدترین حریف تھا۔اس سے کسی نیک اور صحیح مشورہ کی کیوں کر توقع کی جا سکتی تھی چنانچہ اپنی اندرونی خباثت اور فطری بدطینتی کے تحت اس نے ولید کو مشورہ دیا کہ معاویہ کی موت کی خبر شہر میں پھیلنے سے پہلے حسینؑ کو فوری طور پر بلا کر اسی وقت بیعت پر مجبور کیا جائے اور انکار کی صورت میں انہیں قتل کر دیا جائے۔نہ صرف یہ بلکہ مروان نے ولید سے کہا کہ حسینؑ امیر المومنین معاویہ بن ابی سفیان سے سرکشی کا اظہار کرنے والوں میں سے ہیں' وہ ہمیشہ ہمارے خاندان (بنی امیہ) کے خلاف رہے ہیں اور وہ اس سزا کے مستحق ہیں۔اس نے ولید سے کہا کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو حسینؑ کو ایک لحہ بھی سوچنے اور حرکت کرنے کا موقع نہ دیتا۔

مروان کا یہ مشورہ اگر چہ ولید کو بہت شاق گزرا جس کی تلخی اس کے چہرے سے نمایاں تھی لیکن پھر بھی اس نے یہ کوشش کی کہ اس کی یہ ناگواری مروان پر ظاہر نہ ہو۔چنانچہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ولید یزید اور مروان کا خیر خواہ ہے اس نے مروان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اسی وقت آدمی بھیجا اور امام حسینؑ کو دربار میں طلب کیا۔جب امام حسینؑ ولید کے دربار میں پہنچے تو ولید نے یا تو امام حسینؑ کے ساتھ بنی ہاشم کے جوانوں کی موجودگی کی وجہ سے یا اپنے علم و دانش اور فہم و فراست کے تقاضوں کے تحت امام حسینؑ کو اپنے جال میں لانے کی غرض سے اپنے حُسنِ کلام اور مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر حسینؑ کا استقبال کیا' انتہائی ادب و احترام سے اپنی جگہ انؑ کو بٹھایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی وہ آپؑ کے لئے اپنے دل میں انتہائی نیک خیالات اور مقام و منزلت رکھتا ہے۔ولید اپنی تجویز پیش کرنے سے پہلے پیش

بندی کے طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اگر اس کی تجویز امام حسینؑ کے لئے ناگوار و ناقابلِ عمل ہو تو یہ اس کی بدنیتی اور برے عزائم کی وجہ سے نہیں بلکہ نیک خواہشات اور مصلحت بینی کے تحت ہے۔

امام حسینؑ کا مدینہ سے خروج

مدینہ وہی شہر ہے جو امام حسینؑ کے جد کے توسط سے عالمِ اسلام کا مرکز بنا اور فرشتوں کی آمد و رفت اور تنزیلِ وحی کا مرکز قرار پایا۔ حسینؑ کے جد پیغمبر ختمی مرتبتؐ نے کل جن لوگوں کو اس شہر مدینہ سے ذلت و خواری کے ساتھ جلاوطن کیا آج انہیں ذلیل و کمین خصلت لوگوں نے حسینؑ پر اس شہر کی فضا اور زمین تنگ کردی اور حسینؑ کو رات کی تاریکی میں مدینہ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

کون حسینؑ؟

وہی حسینؑ جس کے جدؐ نے یہاں کے لوگوں کو آزادی عطا فرمائی۔

وہی حسینؑ جس کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ بارہا بتایا کہ اس کا خون میرا خون ہے' اس کی روح میری روح ہے' اس کا گوشت میرا گوشت ہے' اس کی محبت میری محبت ہے' جس نے اسکو تکلیف پہنچائی اس نے گویا مجھے اذیت دی۔

وہی حسینؑ جس نے اپنے جد کے بعد اس شہر کو معمور و آباد کیا۔

آج اسی حسینؑ کو مدینہ چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔

امام حسینؑ کے مدینہ چھوڑنے کے یقیناً کچھ اسباب و علل تھے اور ان اسباب و علل کے مقابلہ میں امامؑ کو لامحالہ کچھ اقدامات کرنا ناگزیر تھے۔

اس سلسلے میں جو حالات اور واقعات امامؑ کو پیش آئے ان کو ہم قارئین کے سامنے ترتیب وار پیش کرنا چاہتے ہیں:

(۱) ۲۷/رجب ۶۰ھ کو نمازِ عشاء کے بعد والئ مدینہ نے امام حسینؑ کو دارالامارہ میں

طلب کیا۔

(۲) امام جب دارالامارہ پہنچے تو والئ مدینہ نے خوش اخلاقی اور نرم مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تعظیماً امامؑ کو اپنی مسند کے نزدیک جگہ دی۔

(۳) مروان بن حکم بن عاص اس وقت دارالامارہ میں موجود تھا۔ یہ وہی مروان ہے جس کو پیغمبرؐ کے حکم سے مدینہ سے نکال دیا گیا تھا اور جس کی خیانت اور جرم کے نتیجہ میں خلیفۂ سوم کو بغاوت اور بالآخر قتل کا سامنا کرنا پڑا۔ مروان اپنے بغض' کینہ' حسد اور اپنی ازلی خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امامؑ کے دارالامارہ پہنچنے پر آپؑ کے احترام میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں گویا اس مجلس میں فرزندِ رسولؐ نہیں بلکہ کوئی عام اور اجنبی آدمی آکر بیٹھا ہے۔

(۴) اس کے برخلاف جب امام حسینؑ دارالامارہ پہنچنے کے بعد اپنی مسند پر بیٹھے تو مروان کو مجلس میں پاکر امامؑ نے اپنے اخلاقِ کریمہ اور حسنِ نیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ولید اور مروان کو یکجا دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار فرمایا اور فرمایا:

"مجھے تم دونوں کو اکٹھا دیکھ کر خوشی ہوئی ہے" آپؑ نے فرمایا: "ایک تو صلہ رحمی کا تقاضا ہے کہ آپس میں مل بیٹھ کر رہیں دوسرے اختلاف اور انتشار کی بجائے اتحاد و الفت اچھی بات ہے"۔

(۵) والئ مدینہ نے امامؑ کو خلیفۂ مسلمین معاویہ بن ابی سفیان کی موت کی خبر دیتے ہوئے کہا کہ اب نئے خلیفہ یزید بن معاویہ کی خواہش ہے کہ آپؑ سے بیعت لی جائے۔

(۶) امام حسینؑ نے معاویہ کی موت کی خبر سن کر کلمۂ استرجاع پڑھا اور والئ مدینہ اور اس کے خاندان کو تعزیت پیش کی۔

(۷) ولید کے تقاضائے بیعت کے جواب میں امام حسینؑ نے فرمایا:

"نئے خلیفہ کی بیعت کئے جانے کا معاملہ ایک معمولی عمل نہیں ہے۔ نہ ہی یہ ایک

انفرادی عمل ہے بلکہ اجتماعی عمل ہے ۔اس مطالبہ کو سب کے سامنے اجتماع میں پیش ہونا چاہیے اور وہاں طے ہونا چاہیے۔تاہم مجھے یقین ہے کہ خفیہ طور پر کی جانے والی کسی بیعت پر اکتفا بھی نہیں کی جائے گی۔میں ایک الگ انسان نہیں ہوں۔جب سب کو بلایا جائے تو مجھے بھی بلالینا‘ وہیں اس مسئلہ کو طے کریں گے‘‘۔

(۸) ولید کو امام حسینؑ کی اس خوش اخلاقی اور خوش اسلوبی کے مظاہرہ پر خوشی ہوئی اور اس نے آپؑ کی پیش کش کو دل سے قبول کرلیا۔جب بیعت کے مسئلہ کو عام اجتماع میں اٹھانے کا فیصلہ کو قبول کرلیا گیا تو امامؑ نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی اور ولید نے امامؑ کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

(۹) اگر چہ ولید کا امامؑ سے بیعت طلب کرنا آپؑ کے لئے نہایت گراں اور نا قابلِ برداشت امر تھا لیکن آپؑ نے اپنے غم وغصہ کو برداشت کیا اور نہایت خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے ولید کو مطمئن اور قانع کیا۔

(۱۰) لیکن مروان جو مجلسِ ولید میں ایک غیر متعلق شخص تھا اور کسی صورت میں اس مسئلہ (مطالبۂ بیعت) کا فریق نہیں تھا نے مجلس کے اس حسنِ اختتام اور الفت ومحبت کے مظاہرے کو کدورت‘ نفرت اور بغض وعناد میں بدل دیا۔

(۱۱) جب مروان نے ولید کے دربار میں افہام تفہیم اور حسنِ گفتگو کو کدورت اور تلخی وتندی میں بدل دیا اور اپنے چھپے ہوئے مذموم عزائم کو آشکار کردیا تو امام حسینؑ کو مجبوراً اپنے منطقی عزائم کو کھل کر مظاہرہ کرنا پڑا۔چنانچہ آپؑ نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا:

’’یزید کسی بھی لحاظ سے منصبِ خلافت کا اہل نہیں اور کسی بھی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ مجھ جیسی شخصیت یزید جیسے شخص کی بیعت کرے۔میں ہرگز اس کی بیعت نہیں کرسکتا۔تاہم میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو احسن طریقہ سے حل کرنے کی راہیں تلاش کی جائیں‘‘۔

یہ کہہ کر امام حسینؑ دارالامارہ سے باہر نکلے اور اپنے ہمراہ آنے والے بنی ہاشم کے نوجوانوں کے حلقہ میں واپس اپنے گھر تشریف لے گئے۔

(۱۲) دارالامارہ سے واپسی کے بعد امام حسینؑ انتہائی حزن وملال کے عالم میں روضۂ رسولؐ پر پہنچے‘ سلام وزیارت کے بعد اپنے درپیش مسائل کو بارگاہِ ایزدی میں یہ کہہ کر پیش کیا:

’’بارالٰہا! جو کچھ مجھے پیش آیا ہے تو اس سے خوب آگاہ ہے۔پالنے والے! میں درپیش مسائل کے سلسلے میں تجھ سے تیرے رسولؐ کے توسل اور توسط سے اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کے تعین کے لئے رہنمائی اور ہدایت کا خواستگار ہوں تو ہی میری راہنمائی فرما‘‘۔

(۱۳) روضۂ رسولؐ سے واپسی کے بعد امامؑ نے اپنے ان اعزاء سے ملاقاتیں کیں جنہیں آپ کو مدینہ ہی میں چھوڑنا تھا۔ان شخصیات میں سے جن ہستیوں کا تاریخ میں نام ملتا ہے ان میں محمد بن حنفیہ، عمرِ اطرف، ام سلمہ اور دیگر خواتینِ بنی ہاشم ہیں۔امامؑ نے ان سے وداع ہوتے ہوئے انہیں مدینہ چھوڑنے اور اپنے عزمِ سفر سے آگاہ کیا اور ان کو قسم دے کر اس مسئلہ کو پوشیدہ اور مخفی رکھنے کی تاکید کی۔

(۱۴) مدینہ چھوڑتے وقت آپؑ نے ایک وصیت نامہ اپنے بھائی محمد حنفیہ کے سپرد کیا جس میں آپؑ نے اپنے سفر کے اہداف ومقاصد بیان کئے تھے۔آپؑ نے ان سے فرمایا:

’’آپ مدینہ میں قیام کریں اور مدینہ میں پیش آنے والے حالات سے مجھے مسلسل آگاہ رکھیں‘‘

(۱۵) ان تمام تیاریوں کے بعد ۲۸ رجب ۶۰ ھ کو رات کی تاریکی میں اپنے اعزاء کے ساتھ امامؑ خوف کے عالم میں مدینہ سے نکلے مبادا بنی امیہ کے حکام متوجہ ہوجائیں۔مدینہ چھوڑتے وقت آپؑ اسی آیت کی تلاوت فرمارہے تھے جو حضرت موسیٰؑ کے مصر چھوڑنے کے

بارے میں ہے:

﴿فخرج منها خائفا يترقب......﴾ (قصص/۲۱)

(۱۶) مدینہ سے باہر نکلنے کی بعد آپؑ نے جب اسی عام راستہ کو اختیار کیا جو مکہ جاتا ہے تو آپؑ کے ہمرکاب افراد میں سے بعض نے یہ تجویز پیش کی آپؑ بھی مکہ جانے کے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں جیسا کہ عبداللہ بن زبیر نے مدینہ چھوڑتے وقت اختیار کیا تھا تا کہ آپؑ دشمن کے ہاتھ نہ آسکیں۔

یہ تھے وہ حالات اور واقعات جو مدینہ چھوڑتے وقت امام حسین- کو پیش آئے۔ان حالات و واقعات کے پیشِ نظر بہت سے سوالات ہیں جو انسان کے ذہن میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ان سوالات کا تجزیہ و تحلیل نہایت اہم اور ضروری ہے۔ضروری اس لئے ہے کہ ان سوالات کے تجزیے اور تحلیل کے ذریعہ ہمیں قیامِ امام حسینؑ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ان حالات و واقعات کو جاننے کے بعد یوں تو مختلف لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوالات آسکتے ہیں لیکن اس وقت جو سوالات ہمارے ذہن میں ہیں وہ ہم قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

(۱) حاکمِ مدینہ ولید نے امام حسینؑ کو رات کو بے وقت کیوں طلب کیا؟ معاویہ کی موت کی خبر اور مطالبۂ بیعت کا مسئلہ کیا صرف امام حسینؑ سے وابستگی رکھتا تھا جب کہ امام حسینؑ نہ تو بنی امیہ کے عزیزوں میں تھے اور نہ ان کے قریبی حلقوں میں آپؑ کا شمار ہوتا تھا کہ ان کے سامنے معاویہ کی موت پر دکھ اور مصیبت کا اظہار کیا جائے یا یزید کی بیعت کے بارے میں ان سے صلاح و مشورہ لیا جائے۔پھر کیوں صرف امام حسینؑ ہی کو اس بے وقت طلب کیا گیا؟

(۲) مروان بن حکم کے ولید سے اچھے اور خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔یہ ایک دوسرے کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔بلکہ ایک دوسرے کے حریف و رقیب تھے۔اس کے علاوہ ولید کا نقطۂ نظر مروان کے نقطۂ نظر سے قطعاً ہم آہنگ نہیں تھا۔اس کے باوجود اس مسئلہ میں مروان

کو کیوں شامل کیا گیا؟

(۳) ولید کا امام حسینؑ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا، اس کا آپؑ کے ساتھ گفتگو میں ادب و لحاظ، بعد میں مروان سے خطاب پھر عبیداللہ بن زیاد کے نام اس کے خط سے اور ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ولید امام حسینؑ کے بارے میں اچھا خیال رکھتا تھا اور اس کے دل میں امامؑ کا ایک مقام تھا۔آخر اس کے کیا وجوہات ہیں؟ وہ کیوں امام حسینؑ کے بارے میں اچھا خیال رکھتا تھا؟

(۴) اس کے برخلاف مروان کا امامؑ سے اتنی خباثت اور عداوت و دشمنی کا مظاہرہ اور ولید کو ان سے اسی وقت اور فوری بیعت طلب کرنے کی تاکید کی کیا وجوہات ہیں؟

(۵) امام حسین- جو مطلقِ حق و عدالت کے علم بردار ہیں، ہمیشہ حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہیں، کسی کو نہ کبھی دھوکا دیتے ہیں اور نہ کسی کو تاریکی میں رکھنا پسند کرتے ہیں، جو نہ کسی سے ڈرتے اور نہ کسی تذبذب کا شکار تھے بلکہ اس کے برخلاف ایک عزم راسخ رکھتے تھے کہ کسی بھی صورت میں یزید کی بیعت نہیں کریں گے......انہوں نے کیوں مطالبۂ بیعت کے جواب میں ولید سے تاخیر کرنے اور دونوں فریقوں کو اس مسئلہ پر سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لئے موقع دینے کی خواہش کی؟

(۶) مروان کی اس تاکید اور اصرار کے باوجود کہ امام حسینؑ سے اسی وقت بیعت لی جائے یا انہیں گرفتار اور قتل کیا جائے ......ولید نے کیوں امام حسینؑ کو دربار سے باہر جانے کا موقع دیا جب کہ ایک لحاظ سے امامؑ بیعت کرنے سے انکار کر چکے تھے؟

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا امام حسین- ولید کے دربار سے گھر واپس تشریف لانے کے بعد روضۂ رسولؐ پر گئے۔روضۂ رسولؐ سے وداع ہونے کے بعد آپؑ مدینہ چھوڑنے کا مصمم ارادہ کیا اور اپنے اعزاء کو خدا حافظ کہا جنہیں مدینہ چھوڑنا تھا۔خصوصاً اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو مدینہ میں

اپنا جانشین قرار دیا' ایک وصیت نامہ ان کے سپرد کیا اور تاکید فرمائی کہ وقتاً فوقتاً مجھے مدینہ کے حالات سے آگاہ کرتے رہنا۔ اس کے بعد اپنے خانوادہ کے جن افراد کو اپنے ساتھ لینا تھا ان کو ساتھ لے کر رات کی تاریکی میں اس وقت مدینہ سے نکلے جب لوگ محوِ خواب تھے۔

مدینہ چھوڑتے وقت آپؑ اس آیتِ کریمہ کی تلاوت فرما رہے تھے جو حضرت موسیٰ کی مصر سے نکلنے کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے: ﴿فخرج منہا خائفا یترقب......﴾

امامؑ کا اس آیتِ کریمہ کی تلاوت کرنا بتاتا ہے کہ آپؑ ایک خوف کے عالم میں نکلے' جب کہ متعدد آیاتِ قرآنی اور بہت سی روایات میں مردانِ خدا' خدا کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔ چنانچہ امیر المومنین امام علی -سے نہج البلاغہ میں منقول ہے:

''میں موت سے نہیں گھبراتا' موت مجھ پر آ پڑے یا میں موت پر جا پڑوں''

خود امام حسین -نے اپنے مکہ کے خطبہ میں فرمایا:

''مجھے اپنے بزرگوں سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے جتنا یعقوبؑ کو یوسفؑ سے ملنے کا شوق تھا''

لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدینہ سے نکلتے وقت امام حسینؑ کو کس چیز کا خوف تھا؟ کیا آپ حاکمِ وقت یزید اور اس کے کارندوں سے خوف زدہ تھے؟ یا مدینہ کے عوام سے خوف کھاتے تھے؟ یا پھر آپؑ کے اس خوف کی برگشت خدا کی طرف تھی؟

اس خوف کی تفسیر میں عقلی تحلیل و تجزیہ کرنے سے جو چیز سامنے آتی ہے وہ مندرجہ ذیل خطرات ہیں جن سے امامؑ اس وقت دوچار تھے:

(۱) آپؑ کو ڈر تھا کہ حکومتِ وقت آپؑ کو اس سفر سے روک دے گی اور آپ کو شہر بند کردے گی۔

(۲) اگر حکومت کو آپؑ کی روانگی کا علم ہو جاتا تو آپؑ کو ڈر تھا کہ حکومت کے

کارندوں اور آپؑ کے درمیان جنگ ہوگی اور مدینہ جنگ کا میدان بن جائے گا۔

(۳) یہ خطرہ لاحق تھا کہ آپؑ کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے گا۔

(۴) یا پھر ہو سکتا ہے کہ مروان کی تجویز کے تحت آپؑ کو قتل کر دیا جائے۔

مندرجہ بالا چاروں احتمالات میں سے جو بھی احتمال درپیش آتا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آپؑ اپنے الٰہی وظیفہ اور مسئولیت کی ادائیگی سے عاجز رہتے اور جو الٰہی ذمہ داری آپ کو ادا کرنی تھی اس سے آپؑ کو روک دیا جاتا۔ اس لئے امامؑ سرِ دست ایک ایسی جگہ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جہاں مندرجہ بالا خطرات میں سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا کہ آپؑ اپنے اہداف اور مسئولیت کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ اس کے علاوہ آپؑ چاہتے تھے کہ یہ جگہ ایسی ہو جہاں سے امتِ اسلامی سے آپؑ رابطہ رہے اور ان تک جلد سے جلد اپنا پیغام پہنچا سکیں۔

اس لحاظ سے مدینہ کی سرزمین کسی طرح بھی آپؑ کے مقاصد کے لئے مناسب نہ تھی۔ نہ صرف مدینہ بلکہ مکہ کے علاوہ روئے زمین پر کوئی بھی جگہ امامؑ کے مقاصد سے ہم آہنگ نہ تھی۔ مکہ ہی وہ سرزمین ہے جو بلدِ امین' حرمِ امنِ خدا اور مسلمانانِ عالم کا مرکزِ اجتماع ہے۔ پھر ایامِ حج و عمرہ میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے لہٰذا امام حسینؑ ان خطرات سے بچنے اور اپنے قیام و انقلاب کے لئے مناسب ترین سرزمین یعنی مکہ مکرمہ پہنچنے کیلئے ۲۸ رجب المرجب ۶۰ ہجری کی رات کی تاریکی اور خوف کے عالم میں مدینہ سے نکلے تاکہ دشمن آپؑ کے سفر سے باخبر نہ ہو جائے۔ مدینہ سے نکلتے وقت آپؑ سورۂ قصص کی اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے:

﴿فخرج منہا خائفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین﴾ (قصص/۲۱)

اس آیت کی تلاوت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؑ کو اپنا پیچھا کرنے والے

دشمنوں سے خوف لاحق تھا۔

غرض آپؑ ۳؍شعبان المعظم ۶۰ ہجری کو سورۂ قصص کی اس آیت کو تلاوت کرتے ہوئے سرزمینِ مکہ میں وارد ہوئے:

﴿ولما توجه تلقاء مدين قال عسى ربي ان يهديني سواء السبيل﴾ (قصص/۲۲)

مکہ

امام حسینؑ کے مقدس قیام کے حوالے سے جس دوسرے شہر کا نام آتا ہے وہ مکہ مکرمہ ہے۔ حکمرانوں نے جب آپؑ کے لئے مدینہ کی مقدس سرزمین اور اس کی فضا کو تنگ کر دیا اور وہ آپؑ کے خون کے درپے ہوگئے تو آپؑ نے اپنے لئے سرزمینِ مکہ کا انتخاب کیا۔ ۳؍شعبان المعظم ۶۰ ہجری سے لے کر ۸؍ذی الحجہ تک آپؑ نے مکہ میں قیام فرمایا۔ مکہ مکرمہ میں اس قلیل مدتی لیکن بابرکت مصروفیت کی بعد ہنگامی اور غیر متوقع حالات میں امامؑ نے لوگوں کی عقول و اذہان کو حیران و سرگردان چھوڑ کر مکہ کو ترک کیا اور عراق کی طرف متوجہ ہوئے۔ مدینہ کے بعد سرزمینِ مکہ کا انتخاب کرنا اور مکہ میں اپنے مختصر قیام کے دوران غیر معمولی سرگرمی اور مصروفیات کے بعد ہنگامی حالت میں عین ایسے موقع پر جب پوری دنیائے اسلام کی توجہ مکہ کی طرف تھی آپؑ کا مکہ سے نکلنا ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جو اس وقت سے لے کر آج تک لوگوں کے ذہنوں کو دعوتِ فکر دے رہا ہے اور مختلف نوعیت کے سوالوں کو ذہنوں میں ابھارنے کا سبب بنا ہوا ہے۔

ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ اس سلسلے میں جو سوالات ذہن میں اب تک آبھرے ہیں یا آئندہ سامنے آسکتے ہیں ان تمام سوالات کا اور ان سب جوابات کا جو اس سلسلے میں اب تک دیئے گئے ہیں یا دیئے جا سکتے ہیں اس مختصر گفتگو میں احاطہ کیا جائے۔ لیکن ان سوالات اور ان کے جوابات سے پہلے سرزمینِ مکہ کی تاریخی اور شرعی حیثیت اور مسلمانوں کے نزدیک مکہ کا جو مقام

و منزلت ہے اسے پیش کرنا ضروری ہے۔

مکہ یا بکہ

قرآنِ کریم میں اس شہر کا ''مکہ'' اور ''بکہ'' کے نام سے ذکر ہوا ہے۔ سورۂ فتح کی آیت ۲۴ میں ''مکہ'' کے نام سے جب کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۹۶ میں اس کا ذکر ''بکہ'' کے نام سے ہوا ہے۔

بعض اہلِ لغت کے نزدیک ''مکہ'' یا ''بکہ'' دونوں ہی مسمّی رکھتے ہیں جبکہ بعض کی نزدیک یہ دو اسم اور دو مسمّی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لغتِ عرب میں ایک قاعدہ کے مطابق ایک حرف دوسرے حرف کی جگہ لیتا ہے جیسے لفظ ''لازم'' کے ''میم'' کو بدل کر اس کی جگہ ''ب'' لگا دیں اور اسے ''لازم'' کی بجائے ''لازب'' کہا جائے۔ جب کہ بعض مفسرین کے نزدیک ان دونوں میں فرق ہے جیسا کہ بعد میں وضاحت کی جائے گی۔ پہلے ہم لغت کے لحاظ سے لفظ مکہ کے معنی کی وضاحت کریں گے:

(۱) م ک ک: مضاعف ہے اور کتبِ لغت میں اس کے مختلف معنی بیان ہوئے ہیں۔ لسان العرب میں مکک کے معنی ہیں چوسنا' جیسے ہڈی میں موجود مغز کو چوسنا یا اونٹنی کے بچہ کا اس کے پستان سے دودھ چوسنا۔ چنانچہ بیان ہوا ہے کہ ''مک الفصیل ما فی ضرع امه'' یعنی اونٹنی کے بچہ نے اس کے پستان سے تمام دودھ چوس لیا۔

(۲) مجمع البحرین میں ''المکک'' نقص اور ہلاکت کے معنوں میں بیان ہوا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین کو مکہ کہا گیا ہے۔

بہر حال یہ تینوں معنی اس سرزمین پر صادق آتے ہیں اور اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔

جہاں یہ چوسنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے وہاں دو لحاظ سے یہ مفہوم اس پر صادق آتا ہے ایک یہ کہ یہ سرزمین اطرافِ عالم سے اپنے لئے زائرٗ مہمانوں اور ارزاق کو اپنی طرف

کھینچتی اور انہیں جذب کرتی ہے' جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۷ میں ہے:

﴿فاجعل افئدة من الناس تهوى اليهم وارزقهم من الثمرات لعلهم يشكرون﴾ ''پروردگارا! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر اور انہیں طرح طرح کے پھلوں سے روزی عطا کرتا کہ یہ لوگ تیرا شکرادا کریں''

چوسنے اور جذب کرنے کے معنی اس لحاظ سے بھی اس پر صادق آتے ہیں کہ یہ سرزمین اپنے زائرین اور مہمانوں کے گناہوں کو چوس لیتی ہے۔ جب کوئی زائر اور حاجی خانہ خدا کی طرف آنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے قصد و نیت سے لے کر اس کے واپس جانے تک ہر لحظہ اور ہر قدم پر یہ سرزمین اس کے گناہ چوستی رہتی ہے اور جب وہ واپس جاتا ہے تو ہر گناہ سے پاک ہو کر ایک نومولود بچہ کی طرح معصوم ہو کر واپس جاتا ہے، تمام آثار گناہ اس سے محو ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کتاب ''الحج فی الکتاب والسنۃ'' کے صفحہ ۲۸۵ پر ''کتاب ثواب الاعمال'' (تالیف شیخ صدوق علیہ الرحمہ) کے حوالے سے ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے پیغمبر اسلامؐ سے نقل کیا ہے:

''حاجی جب حج کیلئے اپنے سامان کو تیار کرتا ہے تو سامان اٹھانے اور رکھنے میں ہر بار اس کے دس گناہ محو ہو جاتے ہیں' اس کیلئے دس حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے اور اس کے دس درجات بلند ہوتے ہیں' جب وہ اپنے سفر کا آغاز کرنے کے لئے اپنی سواری پر سوار ہوتا ہے تو ہر قدم پر اس کے دس گناہ معاف ہوتے ہیں' اس کے لئے دس حسنات کا ثواب لکھا جاتا ہے اور اس کے دس درجات بلند ہوتے ہیں۔ جب وہ کعبہ کا طواف کرتا ہے تو طواف ختم ہوتے ہی اس کے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں' جب وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے تو وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہے' جب وہ عرفات میں وقوف کرتا ہے تب بھی اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں' جب مشعر الحرام میں وقوف کرتا ہے اس وقت بھی اسکے گناہ بخشے جاتے ہیں' جب وہ رمی جمرات کرتا ہے تب بھی وہ اپنے گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس طرح ہر موقف حج جس میں وہ وقوف

کرتا ہے اور مناسک حج انجام دیتا ہے اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں''۔

یعنی اگر پہلے مرحلہ میں وہ نہ بخشا گیا یا کچھ گناہ باقی رہ گئے تو دوسرے مرحلے میں وہ بخشا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ اس طرح اپنے مہمانوں کے گناہوں کو چوستا ہے جیسے بچہ اپنی ماں کا دودھ چوستا ہے۔

مکہ کے دوسرے معنی نقص وہلاکت کے ہیں۔ چنانچہ کسی چیز کے توڑنے کو ''مکک'' کہتے ہیں۔ سرزمینِ مکہ اس مفہوم سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ سورۂ حج کی آیت ۲۵ میں خانہ خدا کی ہتکِ حرمت کرنے والوں کو دردناک عذاب کی وعید دی گئی ہے۔ یہ عذاب شرعی حکم کے علاوہ تکوینی طور پر بھی نازل ہوا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں اس کے تین شواہد پیش کرتے ہیں:

(۱) زمانہ جاہلیت میں اساف بن یعلی نامی شخص اور نائلہ بنت زید نامی عورت نے خانہ خدا میں گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کر کے اس گھر کی ہتکِ حرمت کی۔ خداوندِ عالم نے ان کو مسخ کیا۔ اہلِ مکہ نے ہتکِ حرمت کرنے والوں کو ملنے والی سزا کو عبرت کے نمونہ کے طور پر کوہِ صفا پر اساف کا مسخ شدہ پتلا اور کوہِ مروہ پر نائلہ کا مسخ شدہ پتلا نصب کیا تا کہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد ان دونوں پتلوں کو لوگوں نے بت بنا لیا۔ چنانچہ سعی کرتے وقت مشرکینِ عرب ان کو چومتے تھے۔ ان دونوں بتوں کے صفا اور مروہ پر نصب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں پر صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا بہت گراں گزرتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ نے ان دونوں بتوں کو وہاں سے ہٹایا اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۸ کے تحت مسلمانوں کو صفا و مروہ کے درمیان سعی بجالانے کا حکم دیا۔

(۲) ''شفاء الغرام'' جلد اول، صفحہ ۲۰۳ پر لکھا ہے کہ یمن کا بادشاہ تبع حمیری مدینہ سے گزرتے ہوئے جحفہ اور مکہ کے درمیان بنی ہذیل کے قبیلہ کے چند افراد سے ملا تو انہوں نے اس

کو خانۂ کعبہ کو جلانے بُرباد کرنے اور اس کی اہانت کرنے کا مشورہ دیا۔ ان لوگوں کا یہ مشورہ یا کعبہ سے بدنیتی پر مبنی تھا یا خود بادشاہِ یمن سے بدنیتی پر'تا کہ وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو۔ ہتکِ حرمت کے ارادہ سے یہ شخص جب مکہ سے نزدیک ہوا تو آندھی چلی اور اس کے سر میں درد ہوا اور وہ سخت بیمار ہو گیا۔ اس نے وہاں موجود عیسائی علماء سے اس کا علاج پوچھا تو انہوں نے کہا کہ شاید تم نے خانۂ خدا کے متعلق کچھ بُری نیت کی تھی' بادشاہِ یمن نے اس کا اقرار کیا اور کہا کہ مجھے بنی ہذیل نے اس کا مشورہ دیا تھا۔ اس پر علمائے نصاریٰ نے کہا کہ ایسا مشورہ دے کر انہوں نے تمہاری ہلاکت اور نابودی کا بندوبست کیا تھا کیونکہ جو بھی اس گھر کے خلاف بُری نیت کرے گا وہ یقینی طور پر ہلاکت اور نابودی سے دوچار ہو گا۔ بادشاہِ یمن نے پوچھا کہ اب اس کا کیا چارہ ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس گھر اور اہلِ کعبہ کے ساتھ نیک نیتی کرو۔ چنانچہ اس نے سو اونٹ ذبح کئے اور غلافِ کعبہ کی نذر کی تو اس کو شفا نصیب ہوئی۔

(۳) اس کے علاوہ اصحابِ فیل کا وہ مشہور واقعہ جس کا سورۂ فیل میں ذکر ہوا ہے اس امر کا تیسرا شاہد ہے۔

مکہ کے تیسرے معنی بے آب وگیاہ خشک سرزمین۔ یہ مفہوم اس لحاظ سے اس پر صادق آتا ہے کہ یہ جگہ خشک اور غیر آباد ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم -نے جب حضرت اسماعیل -اور حضرت ہاجرہ کو اس سرزمین پر چھوڑا تو دعا کرتے ہوئے فرمایا:

''پروردگا! میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو تیرے محترم مکان کے قریب بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ دیا ہے'' (ابراہیم/۳۷)

بکہ

مکہ کا دوسرا نام بکہ ہے جس کے معنی ہیں دبانا اور مارنا۔ یہ معنی بھی اس لحاظ سے مطابقت رکھتا ہے کہ جو بھی ظالم وجابر خانۂ خدا کی اہانت کرے گا خدا اس کی گردن کو دبا دے گا اور متکبرین کے غرور کو خاک میں ملا دے گا۔

کچھ لوگوں کے نزدیک بکہ کے معنی ازدحام ہیں۔ ازدحام کے مفہوم کے لحاظ سے بھی یہ نام مطابقت رکھتا ہے۔ ازدحام کے مفہوم کے اعتبار سے حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم اس کا مصداق جلی ہے۔ اس کے بعد پورا مصاف' اس کے بعد پوری مسجدِ حرام اور اس کے بعد پوری مکہ کی سرزمین جائے ازدحام ہے۔

اس شہر کا تیسرا نام ''بلدِ امین'' ہے۔ چنانچہ یہ سرزمین ہر کسی کے لئے حتیٰ نباتات' حیوانات اور انسانوں کے لئے بھی مقامِ امن ہے۔ یہاں تک کہ اس مجرم کے لئے بھی جائے امن ہے جو یہاں آ کر پناہ لے۔ لیکن ایسا شخص جو اس مقدس سرزمین پر جرم کرے اس کو مکہ ہی میں سزا دی جائے گی کیونکہ اس نے اس گھر کی ہتکِ حرمت کی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۵' تین/۳' بقرہ/۱۲۶' نمل/۹۱ میں اسے بلدِ امین کہا گیا ہے۔

اس شہر کا چوتھا نام ''ام القریٰ'' ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں سورۂ انعام کی آیت ۹۲ اور سورۂ شوریٰ کی آیت ۷ میں اس شہر کو اس نام سے پکارا گیا ہے۔ ''ام القریٰ'' دو لفظوں 'ام' اور ''قریٰ'' سے مرکب ہے۔ قرآنِ کریم میں لفظ ''ام'' ۲۴ مرتبہ آیا ہے۔ اہلِ لغت نے کسی چیز کی آخری برگشت کو 'ام' کہا ہے۔ قرآنِ کریم میں آیاتِ محکمات کو ام الکتاب اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ آیاتِ متشابہات کی برگشت آیاتِ محکمات کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ سورۂ آلِ عمران آیت ۷' رعد/۳۹' زخرف/۴ میں بیان ہوا ہے۔

دوسرا لفظ ''قریٰ'' ہے جو قریہ کی جمع ہے۔ کسی چیز کے اجتماع کو قریہ کہتے ہیں چنانچہ حوض کو مقروء کہتے ہیں۔ حیض کو بھی قرء کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے مکہ کو ام القریٰ کہنے کی چند وجوہات ہیں:

(۱) پوری زمین کی بنیاد مکہ سے شروع کی گئی ہے۔ یہاں سے دحـــــــوالارض

کیا گیا ہے یعنی زمین کو یہاں سے کھینچا گیا ہے گویا زمین کی برگشت یہ سرزمین ہے۔

(۲) بیت اللہ: قبلۂ عالم ہے۔دنیا بھر کے رہنے والے نمازی اس گھر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔جس طرح کسی بادشاہ کا محل اس کی رعایا کے گھروں کے مقابلہ میں فوقیت اورمنزلت رکھتا ہے اسی طرح عرف میں بیت اللہ بھی دوسری جگہوں پرفوقیت اورمنزلت رکھتا ہے۔چنانچہ کوئی آن اورکوئی لحظہ ایسا نہیں جس میں اس کی طرف متوجہ نہ ہوا جاتا ہو۔

(۳) مکہ: اجتماع انسانی کا عظیم ترین مرکز ہے جس کے مقابلے میں پوری دنیا میں کوئی اوردوسری جگہ ایسی نہیں جہاں ہمہ وقت اس کثرت کے ساتھ لوگوں کی آمدورفت رہتی ہو۔

مکہ کی فضیلت اورشرف

مکہ کو یہ مقام، شرف وفضیلت اورخصوصیات اس بیتِ مکرم کعبہ کی وجہ سے حاصل ہوئیں۔اس بیت کے چندنام ہیں:

۱۔ بیت:

خداوندِ متعال نے قرآنِ کریم میں ۱۶ مقامات پراس گھرکا بیت کے نام سے ذکرفرمایا ہے،دومرتبہ خدانے اس گھر کو خود اپنی طرف نسبت دی ہے:(حج/۲۶ اوربقرہ/۱۲۵)ایک جگہ حضرت ابراہیم -نے اس گھرکوخدا کی طرف نسبت دی ہے: (ابراہیم/۳۷)،تین مقامات پرخداوندِ عالم نے اس گھرکولوگوں کی طرف نسبت دی ہے:(آلِ عمران/۹۶،مائدہ/۹۷، بقرہ/۱۲۵) اور دس جگہوں پرخداوندِ عالم نے بغیرنسبت کے اس کاذکرفرمایا ہے۔

۲۔ بیتِ عتیق:

سورۂ حج کی آیت ۲۹اور۳۳ میں اس گھرکو'بیتِ عتیق' کہا گیا ہے۔اس کو بیتِ عتیق

کہنے کی چند وجوہات ہیں:

(۱) عتیق: آزادی کو کہتے ہیں۔چنانچہ "عتق الرقبہ" کے معنی ہیں غلام آزاد کرنا۔

خداوند عالم نے روزِ اوّل ہی سے اس گھرکوبندوں کی ملکیت سے آزاد قرار دیا ہے اس لئے اسے بیتِ عتیق کہتے ہیں۔اس گھر کے اردگرد جتنے بھی گھر ہیں وہ کسی کی ملکیت میں شمار نہیں ہوتے بلکہ وہ سب اس گھر کے حریم ہیں۔ان کو کعبہ میں شامل کرنے کے لئے ان کے مالکان سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

آزادی کے مفہوم کے لحاظ سے اسے"بیتِ عتیق" اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ جوشخص اس گھر کا طواف کرتا ہے خداوندِ عالم اسے جہنم کی آگ سے آزاد فرمادیتا ہے۔اس کے علاوہ یہ گھر بارش، سیلاب اورطوفانِ نوحؑ وغیرہ سے محفوظ اور آزاد رہا۔

(۲) خداوندِ عالم نے اس گھرکوظالم اورجابروں کی دستبرد سے محفوظ اورآزاد رکھا۔جس نے بھی اس گھر کے خلاف بُری نیت کی اوراس کی حرمت کوبرباد کرنا چاہا خدانے اسے ہلاک کردیا جیسا کہ اساف بن یعلیٰ، نائلہ بنتِ زید، تبع حمیری اوراصحاب فیل کے واقعات سے ظاہر ہے۔

(۳) اس کے علاوہ "عتیق" کے معنی قدیم کہنہ اورپُرانا بھی ہیں۔چونکہ یہ گھرسب سے قدیم حتّیٰ زمین وآسمان سے بھی قدیم اورپرانا ہے اسلئے اسے"بیتِ عتیق" کہتے ہیں، جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ﴾ "لوگوں (کی عبادت) کے واسطے جوگھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ تو یقیناً یہی (کعبہ) ہے"

۳۔ مسجد الحرام

اس گھر کا تیسرا نام مسجدالحرام ہے ۔اس کو مسجدالحرام اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں مشرکین کا داخلہ حرام ہے۔

۴۔ کعبہ

اس گھر کا چوتھا نام کعبہ ہے ۔اس گھر کو کعبہ کہنے کی توجیہ میں مفسرین کہتے ہیں کہ کعبہ چارگوشوں کو کہتے ہیں ۔چونکہ اس گھر کے چار گوشے ہیں اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں ۔اس کے علاوہ کسی بلندی کو بھی کعبہ کہتے ہیں ۔مثلاً پاؤں کی ابھری ہوئی ہڈی کو کعب کہتے ہیں' یہ گھر چونکہ بلند مقام ومنزلت رکھتا ہے اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں ۔

سورۂ مبارکہ مائدہ کی آیت ۹۵ اور ۹۷ میں کعبہ کا ذکر ہوا ہے ۔

علل الشرائع میں ہے کہ امام جعفر صادق -سے پوچھا گیا کہ کعبہ کو کعبہ کیوں کہتے ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ کعبہ چارگوشہ ہے اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں ۔پوچھا گیا کہ کعبہ کیوں چارگوشہ ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ یہ بیت المعمور کے عین نیچے ہے اور چونکہ بیت المعمور چارگوشہ ہے اس لئے یہ چارگوشہ ہے' پوچھا گیا کہ بیت المعمور کیوں چارگوشہ ہے تو آپؑ نے فرمایا کیونکہ یہ عرش کے نیچے ہے اور عرش چارگوشہ ہے اس لئے بیت المعمور چارگوشہ ہے' پھر پوچھا گیا کہ عرش کیوں چارگوشہ ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد چار کلمات پر ہے اور وہ چار کلمات تسبیحات اربعہ ہیں ۔

امامؑ سے منقول ہے کہ حضرت ہود پیغمبرؑ کے پاس آ کر لوگوں نے بہت سے سوالات کئے' ان سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ کعبہ کو کعبہ کیوں کہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ دنیا کے وسط میں ہے اس لئے اسے کعبہ کہتے ہیں ۔

امام جعفر صادق -سے کسی نے کہا کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ ایمان اور اسلام کی مثال کعبہ اور حرم کی مثال ہے' جو کعبہ میں ہے وہ حرم میں ہے اور جو حرم

میں ہے وہ کعبہ میں نہیں ہے۔

امام صادق -سے ہی مروی ہے کہ خداوند عالم نے روئے زمین میں سے مکہ کو منتخب کیا' مکہ سے مسجد کو منتخب کیا اور مسجد سے کعبہ کو منتخب کیا ۔

کعبہ کی تفسیر میں آئمہؑ نے فرمایا کہ "ہم آئمہؑ کعبہ ہیں"۔

امام سجاد -نے فرمایا کہ علیؑ وہ کعبہ ہیں جن کی طرف متوجہ ہونے کا لوگوں کو حکم دیا گیا اور کہا گیا کہ اس دنیا میں ان کی اقتدا کرو ۔جس طرح مشرکین کی روگردانی سے کعبہ کی عظمت وشرافت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح لوگوں کی علیؑ سے روگردانی اور ان کو پیچھے کرنے سے ان کی بزرگی' عظمت اور شرافت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

آئمہؑ کو کعبہ کا مصداق قرار دینا لفظی اعتبار سے بھی درست ہے کیونکہ لغت میں علو اور بلندی کو کعبہ کہتے ہیں اور آئمہؑ اپنی عظمت و بزرگی میں ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں ۔(مقدمۂ تفسیر برہان ص ۲۹۵)

کعبہ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے انسانی وجود میں اس کا "دل"۔جب تک دل باقی ہے انسان کا وجود باقی ہے اور اگر دل کام کرنا چھوڑ دے تو آدمی ختم ہو جاتا ہے ۔بالکل اسی طرح مسلمانوں کی بقاء کا دارومدار کعبہ پر ہے چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ اسلام اس وقت تک باقی ہے جب تک کعبہ باقی ہے ۔

اس گھر کی خصوصیات

اس گھر کی چند خصوصیات ہیں:

پہلی خصوصیت

معبد اور جائے پرستش کے لحاظ سے یہ سب سے پہلا گھر ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۹۶ میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین﴾ "لوگوں (کی عبادت) کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ تو یقیناً یہی (کعبہ) ہے"

دوسری خصوصیت

یہ گھر تمام جہانوں کے لئے رہنما ہے' جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین﴾ "لوگوں (کی عبادت) کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ تو یقیناً یہی (کعبہ) ہے جو مکہ میں بڑی (خیرو) برکت والا اور سارے جہان کے لوگوں کا رہنما ہے"

تیسری خصوصیت

جیسا کہ سورۂ آل عمران کی اوپر بیان کی گئی آیت میں ہے کہ "یہ گھر خیر و برکت والا ہے"۔

لفظِ برکت مصدرِ ثلاثی مجرد ہے۔ اس کا مادہ برک (ب ر ک) ہے' جو مختلف ابواب اور مختلف صیغوں میں مجموعی طور پر قرآنِ کریم کی بائیس سورتوں میں بتیس جگہوں پر آیا ہے۔

خداوند عالم نے اس صیغہ کو مندرجہ ذیل آیات میں خود اپنی ذات کے لئے استعمال فرمایا ہے:

سورۂ اعراف ۵۴/ مومنون ۱۴/ الفرقان ۱/۱۰' مومن ۶۴' زخرف ۸۵' ملک ۱/۔

قرآنِ کریم میں یہ صیغہ درج ذیل آیات میں خود قرآن کیلئے استعمال ہوا ہے:

سورۂ انعام ۹۲/۱۵۵' انبیاء ۵۰' ص ۲۹/۔

جن پیغمبروں کے لئے قرآنِ کریم میں یہ صیغہ استعمال ہوا ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) حضرت نوحؑ ۔

سورۂ ہود ۴۸' مومنون ۲۹/۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحٰقؑ

سورۂ ہود ۴۸' صافات ۱۱۳/۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ ۔

سورۂ مریم ۳۱/

اس کے علاوہ کعبہ کیلئے یہ صیغہ قرآنِ کریم کے سورۂ آل عمران کی آیت ۹۶ میں اور مسجدِ اقصیٰ کے لئے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱ میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے علاوہ جن جن چیزوں کو خداوند عالم نے مبارک قرار دیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) طور: سورۂ مبارکہ قصص ۳۰/۔ (۲) زیتون: سورۂ مبارکہ نور ۳۵/۔ (۳) شب قدر: سورۂ مبارکہ دخان ۳/۔ (۴) پانی: سورۂ مبارکہ ق ۹/۔

پانی آسمانی برکت ہے جب کہ زمینی برکتیں سبزیاں' پھل' میوہ جات اور اجناس وغیرہ ہیں۔

برکت کی معنی ہیں جمع ہونا' زیادہ ہونا اور بقاء و دوام۔ اسی لحاظ سے حوض کو برک کہتے ہیں۔

کعبہ کو مبارک کہنے کی توجیہ یہ ہے کہ مکہ میں مسلسل ارزاق باہر سے آتے ہیں جیسا کہ سورۂ قصص کی آیت ۵۷ میں ہے۔

زیادہ ہونے کے مفہوم کے لحاظ سے کعبہ کو مبارک اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں بجالائی جانے والی عبادات نماز' تلاوتِ قرآن' صدقہ وغیرہ دوسری جگہوں کے مقابلہ میں کئی گنا فضیلت

رکھتی ہیں۔دوام وبقاء کے مفہوم کے لحاظ سے اسے مبارک اس لئے کہتے ہیں کہ یہ گھر ہمہ وقت طواف'نماز ورکوع وسجود کا مرکز رہتا ہے۔

چوتھی خصوصیت

کعبہ جائے قیام ہے چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیام للناس﴾ "خداوند عالم نے اپنے محترم گھر کعبہ کو لوگوں کے لئے جائے قیام بنایا ہے" (مائدہ/۹۷)

قرآنِ کریم میں لفظِ قیام بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے جن میں چند یہ ہیں:

(۱) کسی کام میں مصروف ہونا: جیسا کہ سورۂ مزمل کی آیت ۲۰ میں ہے۔

(۲) کسی امر کے یا کسی خاص بات کے واقع ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۂ روم کی آیت ۱۲ اور ۱۴ میں ہے۔

(۳) قائم کرنے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳ اور ۴۳ میں ہے۔

(۴) سورۂ مبارکہ مائدہ کی آیت ۶ میں یہ لفظ عزم وارادے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۵) قائم اور دائم ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۂ روم کی آیت ۲۵ میں ہے۔

لفظی اعتبار سے تو لفظ قیام'بیٹھنے کی ضد کو کہتے ہیں لیکن درحقیقت یہ رکود وجمود کی ضد ہے۔انسانی زندگی میں جمود نہ صرف انسان کے مقصدِ حیات کی موت ہے بلکہ رفتہ رفتہ یہ پورے معاشرے کی اجتماعی'اقتصادی اور سیاسی موت پر منتج ہوتا ہے۔چنانچہ بندگانِ خدا اور صالحین کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ معاشرے میں پھیلے ہوئے فساد اور لوگوں کے جمود کو توڑنے کے لئے قیام

کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ یہ قیام کس کے لئے اور کس کے خلاف ہوتا ہے تو صالحین اور خدا کے نیک بندوں کا قیام ہمیشہ مخلوقِ خدا کے لئے اور مخلوقِ خدا میں پھیلے ہوئی فساد اور برائیوں کے خلاف ہوتا ہے۔انسانی معاشرے میں عموماً معاشرتی'اقتصادی اور سیاسی تین ہی قسم کی برائیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں'اس لئے قیام کی بھی عموماً تین ہی اقسام ہوتی ہیں:

(۱) اجتماعی قیام۔(۲) اقتصادی قیام۔(۳) سیاسی قیام۔

(۱) اجتماعی قیام

یہ قیام انسانی معاشرے میں موجود اس سسٹم اور نظام کے خلاف ہوتا ہے جس کی برائیوں اور خرابیوں سے معاشرہ دوچار ہے مثلاً اگر معاشرہ طبقاتی کشمکش اور عدم مساوات کا شکار ہے'وہ اپنی فطری' جائز اور شرعی آزادی اور حریت سے محروم ہے'بدامنی'طبقہ بندی اور انتشار وافتراق کا دور دورہ ہے تو ضروری ہے کہ اس سسٹم اور نظام کو بدلنے اور اس سے بہتر نظام لانے کے لئے خدا کا کوئی نیک بندہ اٹھے اور اس نظام کے خلاف اور معاشرے کی فلاح کے لئے قیام کرے۔

(۲) اقتصادی قیام

اگر کسی معاشرے میں دولت'ثروت اور سرمایہ کی تقسیم غیر منصفانہ ہو'دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ گئی ہو'کوئی گروہ اتنی دولت جمع کر لے کہ اسے رکھنے کیلئے جگہ نہ ہو جب کہ اکثریت فقر وفاقہ میں مبتلا ہو'دو وقت کی روٹی کی بھی محتاج ہو اور محرومیت کا شکار ہو تو اس صورتِ حال کو ختم کر کے دولت کی منصفانہ تقسیم'افراد کی حیات کا بندوبست کرنے کی کوشش وجد وجہد کا نام قیامِ اقتصادی ہے۔

(۳) سیاسی قیام

کوئی ملک اور اس کا نظام اگر نااہل افراد کے ہاتھوں میں آجائے جہاں مقننہ، عدلیہ، مجریہ یہاں تک کہ سربراہِ مملکت بھی اہلیت اور صلاحیت سے عاری ہوں، قومیت، گروہ بندی اور طاقت کے بل بوتے پر کرسیِ اقتدار حاصل کرنے کی رسم جڑ پکڑ چکی ہو تو اس ملک کے کمزوروں، ناتوانوں اور مستضعفین کی نجات کیلئے ملک کے آمروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا نام قیامِ سیاسی ہے۔

یہ حقیقت کسی وضاحت کی محتاج نہیں، اظہر من الشمس ہے کہ اجتماعی اور اقتصادی قیام کے مطلوبہ نتائج سیاسی قیام کے بغیر برآمد نہیں ہو سکتے۔ اجتماعی اور اقتصادی اصلاحات ایک صالح نظام کے سائے میں ہی ممکن ہیں چنانچہ سورہ مائدہ کی آیت ۶۶، جن/۱۶، اعراف/۹۶ اس حقیقت کی شاہد ہے۔

کسی محدود علاقہ اور محدود قبیلہ میں چند افراد کے درمیان امن وامان قائم کرنا اور ان کو روزگار فراہم کرنا ممکن ہے آسان ہو لیکن پوری مملکت یا پوری دنیا کی اجتماعی اور اقتصادی اصلاح کیلئے ایک صالح سیاسی نظام کا قیام نہایت ضروری ہے۔ جس میں جہاں حکومت وقیادت اہل، باصلاحیت اور صالح ترین افراد کے ہاتھوں میں ہو۔ اس کے بغیر اجتماعی اور اقتصادی خوشحالی ممکن نہیں۔ چنانچہ معاشرے کے اہلِ فکر ونظر باصلاحیت اور صالح افراد کو چاہیے کہ وہ سیاسی اصلاحات کو ترجیح دیں اور اسے بنیاد بنائیں تا کہ اس کے نتیجہ میں اجتماعی اور اقتصادی اصلاحات رونما ہو سکیں۔

چنانچہ اسلامی شریعت میں جو اہمیت، مقام ومنزلت اور فضیلت مسئلۂ امامت کو حاصل ہے وہ کسی اور مسئلہ کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ نے اس وقت معاشرے میں پھیلی ہوئی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی برائیوں کا جائزہ لے کر اپنے مقدس قیام کی بنیاد سیاسی نظام کی اصلاح کو بنایا کیونکہ ایک بھرپور سیاسی قیام ہی تمام اصلاحات کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اپنی الٰہی مسئولیت

کا احساس کرتے ہوئے امامؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے قیام کا آغاز بیت اللہ الحرام کعبہ سے کیا کیونکہ یہی صالحین کے قیام و نہضت کی جگہ ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس﴾

جہاں تک امامؑ کے اجتماعی قیام کا تعلق ہے تو آپؑ نے مکہ چھوڑنے کے اپنے اقدام سے حجاج پر واضح کیا:

"لوگو! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ جو حکومت بیت اللہ الحرام میں حجاج اور خدا کے مہمانوں کو امن وامان اور تحفظ نہیں دیتی اس سے مملکت اسلامی اور عامۃ المسلمین کے امن وامان کی ضمانت اور حفاظت کی توقع نہیں کی جا سکتی"

آپؑ کا بار بار یہ فرمانا کہ "اگر میں یہاں سے نہ نکلوں تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے ....." اسی مسئلہ یعنی قیامِ اجتماعی کی ضرورت کی طرف لوگوں کی توجہات مبذول کرانے کے سلسلے کی کڑی تھا۔

وادیٔ تنعیم میں یزید کیلئے لے جائے جانے والے تحفہ وتحائف پر قبضہ کر کے انہیں مستحق اور ضرورت مندوں کا حق قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ غاصب حکمران معاشرے میں اقتصادی بدحالی کے بھی ذمہ دار ہیں، اس کو لگام دینا اور ان کی اقتصادی ناکہ بندی کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک آپؑ کے سیاسی قیام کے اقدامات کا تعلق ہے تو آپؑ نے مکہ پہنچتے ہی خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا اور سیاست اور خلافتِ یزید کو اپنی بحث وگفتگو کا محور قرار دیا۔

پانچویں خصوصیت

خانۂ کعبہ کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ مرکزِ امن ہے۔ امن اجتماعی مسائل میں ایک عالمی مسئلہ ہے آئمہؑ نے اپنے روایات میں اسے ایک نعمتِ مجہولہ قرار دیا ہے۔ نعمتِ مجہولہ اس نعمت کو کہتے ہیں جس کی لوگ قدر نہیں کرتے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے

جب یہ نعمت خدانخواستہ چھن جائے۔ دنیا کے تمام ادیان اور مذاہب کے مقابلے میں اجتماعی امن کی اہمیت کو جتنا اسلام نے اجاگر کیا ہے اتنا کسی اور مذہب نے نہیں کیا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے ستر سوروں میں ۷۲۵ آیات میں ۸۷۹ جگہوں پر مختلف ابواب سے مختلف صیغوں میں امن کا ذکر ہوا ہے۔

خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں کو امین اور امن کا پیغمبر کہا ہے چنانچہ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوسفؑ کو امین اور امن کا پیغمبر کہا گیا ہے۔ اسکے علاوہ سورۂ شعراء کی آیت ۱۹۳ اور سورۂ تکویر آیت ۲۱ میں حضرت جبرئیلؑ کو امین کہا گیا ہے۔ سورۂ دخان کی آیت ۵۱ میں جنت کو جائے امن کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۵، ۱۲۶، آل عمران/ ۹۷، قصص/ ۵۷، عنکبوت/ ۶۷، ابراہیم/ ۳۵ میں مکہ کو جائے امن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کعبہ کو جائے امن قرار دینے سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ امن تکوینی ہے یعنی جو بھی یہاں پہنچ جائے یا اس سرزمین میں بس جائے وہ خودبخود فقر و فاقہ، چوری، ڈاکہ، قتل و غارت گری، ظلم و تشدد اور ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے؟ جب کہ تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہاں امن نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ حجاج بن یوسف اسی مسجدالحرام میں قتل ہوا۔ امام حسینؑ کو قتل ہو جانے کے خوف سے مکہ چھوڑنا پڑا تو پھر کیا یہ امن تشریعی ہے؟ یعنی قرآن اور شریعتِ اسلام نے یہاں رہنے والوں اور یہاں آکر پناہ لینے والوں کے لئے امن کا اعلان کیا ہے؟

یوں تو دوسری جگہوں کی نسبت یہاں ایک طبیعی اور تکوینی امن موجود ہے جسے سب محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعتِ اسلام نے تمام پناہ لینے اور رہنے والوں کے لئے امن کا تشریعی حکم دیا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سرزمین پر جرم کریں اور اس گھر کی ہتکِ حرمت

کریں۔ اگر کوئی شخص اس امن کو چھیننے اور اس کو خطرے میں ڈالنے کا مرتکب ہو تو وہ شریعتِ اسلام کے تحت سزا اور عتاب کا مستحق قرار پائے گا۔ خلیفۃ المسلمین یا امیرِ حج جو حاجیوں کے لئے امن و امان کا محافظ اور ضامن ہے اس سزا کے حکم کو نافذ کرنے کا پابند ہے۔

لیکن اگر کوئی خود حکومت اور حاکم ہی جرم کا ارتکاب کریں، اس گھر کے امن کو خطرے میں ڈالیں اس گھر سے امن چھین لیں تو پھر یہ ذمہ داری علماء امت کے بیدار افراد اور پوری امت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے حاکم کو ہٹائیں تا کہ خانۂ خدا کا امن بحال ہو جائے۔ جب کہ ہماری فقہ کی رُو سے حقیقی وارثانِ پیغمبرؐ یعنی آئمۂ طاہرینؑ اس فریضے کے ذمہ دار ہیں چنانچہ ۶۰ ہجری میں یہ مسئولیت پیغمبرؐ کے وارثِ حقیقی حسینؑ بن علیؑ کے کاندھوں پر تھی۔

کعبہ اور غلافِ کعبہ

اس گھر کی بزرگی، شرف اور عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم نے اس گوہرِ الٰہی کو حجاب در حجاب رکھا ہے تا کہ عاشقانِ الٰہی اور زائرینِ بیت اللہ ہر ہر قدم اور ہر ہر مرحلہ پر خشوع و خضوع اور آدابِ بندگی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اس گھر سے قریب ہوں۔ کعبہ کے غلافوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا غلاف

پہلا غلاف، غلافِ مواقیت ہے۔ مواقیت، میقات کی جمع ہے یہ صیغہ اسمِ زمان اور اسمِ مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ حج کیلئے ایک تو میقات زمانی ہے جس کی طرف سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۹ میں ارشاد ہوا ...... یعنی حج کیلئے ایک مخصوص مہینہ (ذی الحجہ) اور اس کی تاریخیں ہیں، ہر موسم اور ہر زمانے میں حج انجام نہیں دیا جا سکتا۔ جب کہ حج و عمرے کیلئے ایک میقات، میقاتِ مکانی ہے جس کیلئے پیغمبر اسلام ﷺ کے اقوال و اعمال سند ہیں۔ میقاتِ مکانی سے مراد یہ ہے کہ زائرِ بیتِ الٰہی جب حج و عمرے کی نیت سے گھر سے نکلتا ہے تو اسے کچھ آداب

واصول کی پابندی کرنا پڑتی ہے مثلاً کوئی شخص جب کسی باعظمت ہستی کے حضور پیش ہونا چاہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس عظیم ہستی کی شخصیت کے مطابق اپنی وضع قطع کو ڈھالے۔ جب اس کے در پر پہنچے تو باادب ہو کر اجازت طلب کرے۔ چنانچہ جب ایک عام انسان کی ملکیت اور حرم میں داخل ہونے سے پہلے صاحبِ خانہ سے اجازت لینا ضروری ہے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخل ہونا حرام ہے تو پھر بیت نبیؐ اور بیت الٰہی میں بغیر اذن واجازت کے داخل ہونے کا کیوں کر تصور کیا جا سکتا ہے لہٰذا سورۂ احزاب کی آیت ۵۳، سورۂ نور کی آیت ۲۷، ۶۱ میں اس کی سختی سے تاکید کی گئی ہے۔ پھر گھروں میں داخل ہونے کے لئے خدا کا حکم ہے کہ گھروں میں گھر کے دروازے سے داخل ہو جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۹ میں حکم دیا گیا۔

چنانچہ حجِ بیت اللہ اور عمرے کی نیت سے خانۂ خدا کی طرف رُخ کرنے والوں کے لئے حکم ہے کہ ان خاص جگہوں (میقات) پر جب پہنچو تو وہاں سے آگے اس وقت تک قدم نہ بڑھاؤ جب تک کہ اپنی وضع قطع کو اس احساس کے ساتھ درست نہ کرلو کہ تم ایک عظیم ہستی کے دربار میں داخل ہونے جا رہے ہو۔ یہاں سے اپنے تمام امتیازات ترک کردو، اپنے فاخرانہ لباس کو اتار دو اور احرام کے فقیرانہ لباس میں سب سے بڑے غنی کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کرو اور پھر اس کے گھر کی طرف قدم بڑھاؤ۔ چنانچہ میقات وہ پہلا حجاب ہے جہاں سے آگے عام حلیہ میں داخل نہیں ہوا جا سکتا۔ پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کے مختلف گوشہ وکنار سے آنے والوں کیلئے جو مواقیت مقرر کئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ایک میقات ”مسجدِ شجرہ“ ہے جسے ذوالحلیفہ کہتے ہیں اور ”ابیارِ علیؑ“ بھی کہتے ہیں۔ یہ مدینہ سے ۷ یا ۸ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور مکہ یہاں سے ۴٦۴ کلومیٹر ہے۔

(۲) وادیٔ عقیق دوسرا میقات ہے۔ یہ وادیٔ عقیق میں تین جگہ ہے: (۱) مسلخ، (۲) غمر،

(۳) ذاتِ عرق۔ یہ مکہ سے ۹۴ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(۳) تیسرا میقات قرن المنازل ہے جو طائف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے۔ یہ مکہ سے ۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(۴) چوتھا میقات یلملم ہے جو جبلِ تہامہ پر ہے اور مکہ سے ۹۴ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(۵) جحفہ۔ یہ مکہ سے ۲۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

ہر وہ شخص جو ان مواقیت سے باہر ہو اور حج یا عمرے کی نیت سے یہاں سے گزرے اس کیلئے احرام کے بغیر یہاں سے آگے گزرنا حرام ہے۔ (مزید تفصیل کیلئے مجتہدین کے مناسکِ حج سے رجوع فرمائیں)

دوسرا غلاف

دوسرا غلاف دائرۂ حرم ہے۔ اس بیتِ مکرم کے چاروں طرف خداوند عالم نے ایک نہ ایک نشانی نصب کی ہے جس کے اندر کے علاقے کو حرم کہتے ہیں جیسے:

۱) مسجد الحرام سے جو راستہ عرفات کی طرف جاتا ہے وہاں ایک نشانی نصب ہے، مسجد الحرام سے اس کا فاصلہ ۱۸۳۳۲ کلومیٹر ہے۔

۲) حرم سے تنعیم جاتے ہوئے تنعیم سے پہلے ایک نشانی نصب ہے جس کا فاصلہ ۵ یا ٦ کلومیٹر بتایا جاتا ہے۔

۳) حرم سے جدہ کے راستہ میں جو نشانی نصب ہے اس کا فاصلہ مسجد الحرام سے ۱۰ کلومیٹر ہے۔

۴) اسی طرح حرم سے یمن کے راستہ میں جو نشانی نصب ہے اس کا فاصلہ مسجد الحرام سے ٦ کلومیٹر ہے۔

ان چاروں نشانیوں کے دائرے میں جو علاقہ آتا ہے اسے حرم یا مکہ کہتے ہیں، حرم کے

اس پورے علاقے میں شکار کرنا‘ درخت کاٹنا‘ کسی انسان کو پکڑنا منع ہے۔مندرجہ بالانشانیاں جونصب ہیں ان کی بنیادی حیثیت کے بارے میں دو روایات ہیں:

ایک یہ کہ جب حضرت آدم ؑ کو زمین پر اتارا گیا تو وہ حیران اور خوفزدہ ہوئے‘ شیطان سے ڈرے اور تنہائی محسوس کی تو خداوند عالم نے اس بیتِ مکرم کے گرد دائرہ کھینچا اور وہاں فرشتوں کو مقرر کیا اور آدمؑ سے فرمایا کہ آپ کی حفاظت کیلئے ہم نے فرشتوں کو مقرر کیا ہے۔

دوسری روایت کے مطابق حضرت ابراہیم ؑ نے جب حجرِ اسود کو نصب کیا تو اس سے چاروں طرف ایک نور پھوٹا اور اس کی شعائیں جہاں جہاں تک پہنچیں اس حد کو دائرۂ حرم قرار دیا گیا۔

تیسرا غلاف

تیسرا غلاف مسجدالحرام ہے ۔مسجدالحرام دنیا بھر کی تمام مساجد کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز اور فوقیت رکھتی ہے بیت المقدس‘ مسجدِ کوفہ اور مسجدِ نبوی سے بھی زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔خداوند عالم نے اس مسجد کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیات ۱۴۴‘۱۴۹‘۱۵۰‘۱۹۱‘۱۹۶‘۲۱۷‘ انفال کی آیت ۳۴‘ توبہ کی آیات ۷‘۱۹‘۲۸‘ اسراء کی آیت ۱‘ حج کی آیت ۲۵ اور سورۂ فتح کی آیات ۲۵‘۲۷ میں فرمایا ہے۔

دنیا کے گوشہ وکنار سے کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے والوں اور کعبہ کے درمیان ایک طویل فاصلہ حائل ہے لیکن کتنے خوش نصیب ہیں وہ نمازی کہ جنہیں مسجدالحرام میں نماز پڑھنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور ان کی نظریں خود کعبہ پر پڑتی ہیں۔مسجدالحرام میں نماز پڑھنے کے بارے میں جب آئمہؑ سے پوچھا گیا کہ مسجد کے کس حصہ میں نماز پڑھیں تو انہوں نے فرمایا کہ حطیم میں نماز پڑھیں اور اگر وہاں ممکن نہ ہو تو مقامِ ابراہیم میں‘ اس کے بعد حجرِ اسماعیل میں نماز پڑھیں ۔اس کے بعد جب پوچھا گیا تو فرمایا کہ جس حد تک ممکن ہو کعبہ کے قریب

ہو کر نماز پڑھیں ۔مسجدِ نبوی میں پڑھی جانے والی ایک رکعت کا ثواب دس ہزار رکعت کے برابر ہے جبکہ مسجدالحرام میں پڑھی جانے والی ایک رکعت کا ثواب دوسری مساجد میں پڑھی جانے والی نماز کے مقابلہ میں ایک لاکھ رکعت کے برابر ہے ۔مسجدالحرام میں باجماعت نماز اگر اسلام کی عظمت وشوکت کے اظہار کی نیت اور دشمنانِ اسلام پر ہیبت طاری کرنے کے لئے پڑھی جائے تو ایسی نماز کی عظمت وفضیلت کا اندازہ انسانی عقل اور اعداد وشمار کے دائرے میں نہیں آسکتا۔لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے بعض کج فکر اور خشک مزاج مذہبی علماء نادان عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے نہ صرف یہ کہ انہیں مسجدالحرام میں نمازِ جماعت میں شامل ہونے اور واجب نمازیں وہاں پڑھنے کی تشویق نہیں دلاتے بلکہ الٹا انہیں اپنے قول وفعل کے ذریعہ مسجد سے باہر نماز پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ باہر باجماعت نماز پڑھنا‘ حرم میں فرادیٰ نماز پڑھنے سے بہتر ہے‘ جبکہ جب ایک مرتبہ امام رضا ؑ سے بزنطی نے پوچھا کہ اپنی رہائش گاہ پر باجماعت نماز پڑھنا بہتر ہے یا مسجدالحرام میں میں فرادیٰ تو امامؑ نے فرمایا کہ مسجدالحرام میں فرادیٰ پڑھنا بہتر ہے ۔نیز مسجدالحرام میں دیگر مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنا بذاتِ خود کئی گنا فضیلت‘ اجر وپاداش رکھتا ہے۔

چوتھا غلاف

چوتھا غلاف‘ غلافِ کعبہ ہے۔یہ غلافِ کعبہ اس لئے ہے کہ بندہ کو یہ احساس رہے کہ وہ اپنے مولا وآقا کے حضور ایک فقیر کی حیثیت سے حاضر ہے اور جس طرح ایک حقیر اور عاجز فقیر اپنے آقا کے دامن سے لپٹ کر دستِ سوال بلند کرتا ہے اور اس کے بدن کو ہاتھ لگانا جسارت اور سوئے ادب سمجھتا ہے اسی طرح بندہ غلافِ کعبہ کو تھامتا ہے اور دیوارِ کعبہ کو ہاتھ لگانے کی جسارت نہیں کرتا۔

پانچواں غلاف

پانچواں غلاف 'غلافِ عظمت وہیبت' ہے ۔رب کعبہ نے اپنے اس گھر کو ایک عظیم ہیبت وجلال سے نوازا ہے ۔دیکھنے والا اس پر نظر کر کر کے تھک جاتا ہے لیکن اس گھر کی عظمت وہیبت کی انتہا کو نہیں پہنچ پاتا ۔چنانچہ مسجد الحرام کی مخصوص عبادات میں سے ایک عبادت کعبہ پر نظر کرنا ہے ۔

مکہ کی اسلامی سیاسی تاریخ

مکہ کی اسلامی سیاسی تاریخ کا باقاعدہ آغاز سن ۸ ہجری سے ہوا ۔اگر چہ اسلام کی دعوت کا آغاز اسی مقدس سرزمین سے ہوا تھا لیکن وہاں کے اس وقت کے مشرک حاکموں نے اس دعوت کی شدید مخالفت کی اور پیغمبر اسلامؐ اس قدر اذیتیں دیں کہ آپ ہجرت پر مجبور ہوگئے ۔بالآخر ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد یہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی ۔شام کی مانند یہاں بھی پہلے مسلم گورنر کا تعلق اموی خاندان سے تھا ۔اس والی کا نام عتاب بن اسید بن ابی العیص بن امیہ بن عبدالشمس بن عبد مناف تھا اس کی کنیت ابو عبدالرحمن یا ابو محمد مکی تھی' اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال تھی ۔اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ذہین اور زیرک شخص تھا ۔تاریخ میں ملتا ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد صحابی رسولؐ حضرت بلال حبشیؓ نے کعبہ پر چڑھ کر اذان دی تو جن لوگوں نے اس موقع پر نفرت وانزجار کا مظاہرہ کیا ان میں عتاب بن اسید بھی شامل تھا ۔اس نے اس نفرت کا مظاہرہ ان الفاظ میں کیا کہ آج کے دن خدا نے میرے باپ اسید کو اس کالے کی آواز سننے سے محفوظ رکھا ۔

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کی خبر سن کر عتاب بن اسید روپوش ہوگیا تا کہ خلافتِ نبیؐ کے سلسلے میں کسی قسم کے اظہار رائے سے محفوظ رہ سکے اور جب تک اسے اپنے خاندان کی جانب سے مدینہ سے ہدایت موصول نہیں ہوگئی ظاہر نہیں ہوا ۔

عتاب حضرت ابوبکر کے دور میں بھی والئ مکہ رہا اس کی وفات عین اسی دن ہوئی جس دن حضرت ابوبکر نے وفات پائی ۔اس کے بعد سن ۳۶ ہجری تک مکہ پر متعدد والی فائز رہے ۔ ۳۶ ہجری کے بعد جب حضرت علیؑ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو آپؑ نے حضرت عثمان کی طرف سے منسوب مکہ کے گورنر خالد بن عاص بن ہشام کو برخواست کر کے اس کی جگہ پطر ابوقتادہ انصاری کو نصب کیا' کچھ ہی عرصہ بعد انہیں ہٹا کر ان کی جگہ قثم بن عباس کو والئ مکہ معین کیا ۔یہ حضرت علیؑ کی شہادت تک اس منصب پر فائز رہے ۔۶۰ ہجری میں جب امام حسینؑ مکہ تشریف لائے تو اس وقت عمرو بن سعید اشدق مکہ کا گورنر تھا ۔

فتح مکہ ۸ھ سے ۶۰ھ تک رہنے والے والیان مکہ کی فہرست

۸ ہجری — عتاب بن اسید امیہ ۔

۱۳ ہجری — الحر زبن حارثہ قنفذ بن عمیر بن جدعان' فافع بن الحارث خزاعی' خالد بن العاص بن ہشام بن المغیرہ' احمد بن خالد' طارق بن مرتفع' الحارث بن نوفل القرشی ۔

۲۴ ہجری — علی بن عدی بن ربیعہ' الحارث بن نوفل القرشی' عبداللہ بن خالد بن اسید' خالد بن العاص بن ہشام' عبداللہ بن عامر حضرمی' نافع بن الحارث خزاعی ۔

۳۶ ہجری — ابوقتادہ الانصاری' القثم بن عباس ۔

۳۹ ہجری — عتبہ بن ابی سفیان' مروان بن الحکم' سعید بن العاص' عمرو بن سعید المعروف بالاشدق' خالد بن العاص مخزومی' عبداللہ بن خالد بن اسید ۔

۶۰ ہجری — عمرو بن سعید الاشدق ۔

(نوٹ) معاویہ اپنے دورِ خلافت میں مدینہ میں بار بار کبھی مروان اور کبھی سعید اشدق کو گورنر مقرر کرتا تھا کیونکہ یہ دونوں پیغمبرؐ اور ان کے اہل بیتؑ سے سخت عناد رکھتے تھے

۔سعید اشدق جب مدینہ کا گورنر بنتا تو اپنے بیٹے عمرو کو مکہ میں اپنا نمائندہ مقرر کرتا تھا۔(نقل از تاریخ قویم ج ۶،ص ۱۴۰)

امام حسینؑ اور مکہ

امام حسین -مدینہ مدینہ میں پیدا ہوئے' وہیں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔اسی مدینہ میں آپؑ نے عزت و شرافت کی زندگی گزاری۔انصار و مہاجرین کے نزدیک مدینہ میں اس وقت سب سے محبوب و محترم شخصیت امام حسینؑ ہی تھے۔یہاں آپؑ کا گھر تھا' اہل و عیال تھے' عزیز و اقربا تھے' آپؑ کے جد بزرگوار پیغمبر اسلام ﷺ کا روضہ تھا' آپؑ کی مادرِ گرامی جناب زہرا = اور آپؑ کے برادرِ عزیز امام حسن -کی قبورِ مطہرہ تھیں۔مدینہ شہر تھا کہ جہاں آپؑ کے جد بزرگوار نے مکہ میں خطرہ لاحق ہونے کے بعد ہجرت کی اور پناہ حاصل کی۔جب کہ مکہ وہ جگہ تھی کہ جہاں آپؑ کے جد گو اور حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور مجبور ہو کر آپؑ کو مدینہ ہجرت کرنا پڑی۔ہجرت کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے مسلسل دس سال تک ابوسفیان کی قیادت میں دشمنانِ اسلام اسی مکہ سے نکلتے رہے۔ہاں ابوسفیان اور اس کے پیروکاروں نے مجبوری اور شکست کے عالم میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن پیغمبر اسلامؐ کو ان کے دلوں سے جاہلیت کی جڑوں اور اس کے آثار کو صاف اور تطہیر کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور نہ ہی آپؐ کو مکہ میں اپنے اہل بیتؑ کے لئے فدائیوں اور شیدائیوں کا کوئی حلقہ بنانے کا موقع مل سکا۔

ان حالات میں بنی امیہ کی طرف سے اپنے قتل کا حتمی فیصلہ سننے کے بعد امام حسینؑ کا مکہ کی طرف رخ کرنا اور مکہ کی سرزمین کو اپنے لئے وطنِ ثانی کے طور پر انتخاب کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جو سوالیہ نشان بن کر ذہنوں میں ابھرتا ہے خصوصاً جب کہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مکہ بھی اسی طرح بنی امیہ کی حکومت کی عملداری میں تھا جس طرح مدینہ۔پھر کسی ہدف

و مقصد کے تحت اگر آپؑ نے مکہ کا انتخاب فرمایا تھا تو عین اس وقت کہ جب ایامِ حج میں کہ عالمِ اسلام کا مرکز بنا ہوا تھا آپؑ اپنے اس ہدف کو پسِ پشت ڈال کر ایک ہنگامی عالم میں اس شہر کو چھوڑ کر نکلے؟ اپنے مقدس قیام کے لئے سرزمینِ مکہ کا انتخاب کرنا' پھر یکایک عین حج کے موقع پر اس شہر کو ہنگامی حالات میں چھوڑنا ایسے پیچیدہ مسائل ہیں جو خود ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان سوالات کو حل کرنے اور حقائق تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم ریاضی کے دو اور دو چار کے اصولوں پر تاریخی واقعات کا دقتِ نظر سے تجزیہ کریں اور اس تجزیہ میں عام افراد کی نفسیات' اسلام اور قرآن کے تقاضوں اور خانوادۂ پیغمبرؐ کے پروردہ حسینؑ جیسی شخصیت کی سیرت و کردار کو پیشِ نظر رکھیں۔چنانچہ ایسے حالات میں کہ جب بنی امیہ کی ظالم حکومت کی طرف سے اس جابر حکومت کو تسلیم کرنے یا دوسری صورت میں قتل کیے جانے کا حتمی فیصلہ صادر ہو چکا ہو تو اس سے نمٹنے اور اس کے تدارک کے لئے ردِ عمل کا انحصار انسان کی بنیادی سوچ اور فکر پر ہے۔ایسے حالات میں ہر انسان اپنی راہ کا تعین ان بنیادوں پر کرے گا کہ جن افکار اور ضابطۂ حیات کے اصولوں کو اس نے اپنی زندگی میں اپنایا ہے اور جن افکار اور اصولوں پر وہ پروان چڑھا ہے۔اصول و افکار کی بنیاد پر انسانی معاشرے کی تقسیم بندی کچھ اس ہو سکتی ہے:

پہلی قسم

وہ افراد جو دنیا طلب ہیں اور جن کے دلوں میں حب دنیا رچی بھی ہوئی ہے۔ایسا شخص جس کے دل میں دنیا کی محبت جاں گزیں ہے وہ چاہے ظاہری طور پر دینداری اور دیانتداری کا مظاہرہ کرے لیکن ایسے مشکل حالات میں کہ جب اس کی زندگی خطرے میں ہو وہ دو ہی فیصلے کرے گا:

(۱) ایک یہ کہ وہ حالات سازگار ہونے تک روپوشی اختیار کرے تا کہ حاکم کے غیظ

وغضب سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ ایسے لوگوں کیلئے کہ جو حیاتِ اخروی پر یقین نہیں رکھتے اور دنیاوی زندگی ہی کو اول وآخر سمجھتے ہیں روپوشی کی زندگی یقیناً بہت بڑی غنیمت ہے یا پھر ......

(۲) ایسا شخص روپوشی اختیار نہ کر سکے یا نہ کرے تو ان مشکل حالات میں وہ اپنی اس چندروزہ زندگی کو مقدم رکھتے ہوئے اس جابر حکومت کے سامنے سرنگون ہو کر ذلت وخواری کا طوق پہن لینا گوارہ کرلے گا کیونکہ اس کی بنیادی سوچ وفکر کا محور حبِ دنیا اور حیاتِ دنیا ہی ہے۔

دوسری قسم

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو دنیاوی زندگی کے مقابلہ میں تو آخرت کے طلب گار ہیں اور اخروی زندگی کو دنیاوی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن اپنے لئے کسی اجتماعی ذمہ داری اور مسئولیت کا احساس نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیاوی زندگی یا جلد مرنا یا دیر سے مرنا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ وہ طبیعی موت کے مقابلہ میں شہادت کو اپنے لئے افتخار سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے پیشِ نظر صرف دو ہی چیزیں ہوتی ہیں ...... ''حیات'' یا ''شہادت''۔

تیسری قسم

تیسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو باہدف ہیں لیکن کسی ہدف کو اپنانے کی غرض یہ نہیں کہ ان کا مقصود ومطلوب ''زندگی'' ہے بلکہ وہ زندگی اور زندہ رہنا اس لئے چاہتے ہیں تا کہ وہ اپنے ہدف تک پہنچ سکیں۔ ان کے اہداف ان کے ذاتی مفادات بھی نہیں ہوتے بلکہ ان کے اہداف اجتماعی ہیں اور وہ شرعی، اجتماعی اور سیاسی مسئولیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا تمام تر مقصد اپنی مسئولیت کی ادائیگی ہی میں سمجھتے ہیں۔

❀

ان وضاحت کے بعد ہم امام حسینؑ کی سیرت وکردار اور روش کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اپنی مخصوص طبیعت ومزاج، طرزِ فکر اور زندگی کے وہ اصول وضوابط جو اسلام

قرآن اور پیغمبر ختمی مرتبتؐ کے سائے اور خالص الٰہی ماحول میں آپؑ نے اپنائے۔ ان کی روشنی میں آپؑ کا ردِ عمل اور لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے تھا:

(۱) امام حسینؑ اگر (معاذاللہ) دنیا طلب اور جاہ طلب انسان ہوتے تو ان سنگین حالات میں یا تو آپؑ روپوشی اختیار کرلیتے یا پھر آپؑ کو یزید کی بیعت کرلینا چاہیے تھی اور یزید کو بھی اگر یہ عندیہ مل جاتا کہ آپ اس کی حکومت کے خلاف قیام نہیں کریں گے تو یقیناً یہ اس کے لئے باعثِ افتخار ہوتا۔ اس صورت میں نہ صرف وہ آپؑ سے کوئی تعارض نہیں کرتا بلکہ آپ کو عزت ومقام بھی دیتا۔ اس صورت میں امام حسینؑ کی زندگی تو یقیناً محفوظ ہوجاتی لیکن یزید کی فاسق اور جابر حکومت کے لئے ایک شرعی اور قانونی جواز حاصل ہوجاتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ یہ راہ اختیار نہیں کیونکہ وہ دنیا طلب تھے نہ جاہ طلب۔

(۲) اگر امام حسینؑ کا شمار (معاذاللہ) دوسری قسم کے لوگوں میں کیا جائے اور کہا جائے کہ وہ آخرت اور شہادت کے طلبگار تھے لیکن کوئی اجتماعی ذمہ داری اور مسئولیت نہیں رکھتے تھے۔ یعنی وہ فقط دنیاوی زندگی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے اور طبیعی موت کی بجائے شہادت کے طلبگار تھے تو اس صورت میں چند دن کی زندگی کے لئے مدینہ چھوڑ کر کسی اور جگہ کی طرف ہجرت کرنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا جب کہ شہادت تو آپؑ کو مدینہ میں بھی نصیب ہوسکتی تھی۔

(۳) لیکن ایک ایسا شخص جو ہدف ومقصد رکھتا ہو اور زندگی کو اپنی مسئولیت اور الٰہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا ذریعہ اور خدا کی امانت سمجھتا ہو وہ اپنی راہیں بڑی احتیاط اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ متعین کرتا ہے۔ معاویہ کی موت کے بعد اس کی جگہ یزید جیسے فاسق وفاجر کی ولی عہدی اور حسینؑ جیسی شخصیت سے اس کے لئے بیعت کا مطالبہ ایسے سنگین مسائل تھے جن سے امامؑ اس وقت دوچار تھے۔ ان حالات میں آپؑ کیلئے ایک ایسی جائے پناہ تک

خود کو پہنچانا نہایت ضروری تھا جو جائے امن ہو اور جہاں حکومت کے جبر و استبداد سے محفوظ و مامون رہا جاسکے۔

نیز وہ جگہ ایسی ہو کہ جہاں امامؑ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں اور مسئولیت کو انجام دے سکیں اور اپنا پیغام دوسروں تک پہنچا سکیں۔

چنانچہ جائے امن ہونے کے لحاظ سے مکہ سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔ شریعتِ اسلامی کی رُو سے مکہ بلدالامین ہے جہاں نہ صرف انسان بلکہ نباتات' حیوانات حتیٰ وہ مجرم افراد بھی پناہ کا حق رکھتے ہیں کہ جنہوں نے مکہ کی سرزمین سے باہر کوئی جرم کیا ہو۔ اس لحاظ سے مکہ بنی امیہ کے ریاستی جبر سے محفوظ رہنے کیلئے بہترین جگہ تھی۔ اس کے علاوہ اپنی مسئولیت اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لئے سرزمینِ مکہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی خصوصاً ان ایام میں جن میں امام حسینؑ نے مدینہ چھوڑا' کیونکہ یہ وہ ایام تھے کہ جب خانۂ خدا میں اطرافِ عالم سے عمرۂ مفردہ کی غرض سے آنے والے لوگوں کا ہجوم تھا۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب امامؑ نے مدینہ کی فضا کو اپنے اہداف و مقاصد کیلئے سازگار نہ پایا تو آپؑ نے مکہ کا رخ کیا تا کہ وہاں جا کر عالمِ اسلام کے گوشہ و کنار سے آنے والے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچا سکیں اور بنی امیہ کے باطل عزائم اور یزید کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کرسکیں۔

مکہ اور مکہ میں سفراء کی آمد ورفت

۶۰ ہجری کے ۳ رشعبان المعظم سے ۸رذی الحجہ تک مکہ کی سرزمین ایک سرد جنگ کا محاذ بنی ہوئی تھی کیونکہ حکومت مخالف اکثر و بیشتر عمائدین نئے خلیفہ کے خلاف مہم چلانے کیلئے اس مقدس سرزمین کے جائے امن اور مرکز اجتماع ہونے کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ توجہ کا مرکز ابوعبداللہ الحسینؑ کی ذاتِ گرامی تھی۔ حج و عمرہ کے فقہی مسائل اور دیگر مسائلِ شرعی کی بحث کے بعد سب سے بڑا دوسرا مسئلہ جو موردِ بحث و تنقید بنا ہوا تھا وہ یزید کے خلاف

عمائدینِ اسلام بالخصوص حسینؑ ابن علیؑ کا قیام اور معارضہ تھا۔ یقیناً ایک وسیع النظر' وسیع البنیاد اور ہمہ گیر قیام و انقلاب کی خصوصیات اور امتیازات میں سے ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ قائد اور رہبرِ انقلاب ایک مرکز سے اپنے نمائندوں کو اور اپنے پیغام کو دور دراز علاقوں میں اپنی تحریک و قیام سے مربوط افراد تک پہنچاتا ہے اور اس انقلابی فکر کے حامل' حامی اور معتقد افراد ان دور دراز علاقوں سے آ کر مرکز میں جمع ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت محمد ابن حنفیہ اور عبداللہ ابن عباس جیسی برجستہ شخصیات نے امام حسینؑ کو یہی مشورہ دیا کہ آپؑ اطراف و اکنافِ عالم میں خطوط' مراسلات اور اپنے نمائندے بھیجیں اور اگر لوگ آپؑ کی دعوت کو قبول کریں تو پھر آپؑ قیام کریں۔

پہلے بھی یہ سوال ہوا ہے اور اگر آج بھی یہ سوال کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آپؑ نے مملکتِ اسلامی کے علاقوں میں رہنے والوں کو کس حد تک اپنے اعتماد میں لیا اور محمد حنفیہ اور عبداللہ بن عباس کے مشوروں پر کہاں تک عمل کیا۔ اس سوال کا جواب بہت عجیب ہے لیکن اس سوال کے جواب سے پہلے اس وقت کے حالات کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنا ضروری ہے اور یہ کہ امام حسینؑ جس دن سے مکہ تشریف لائے آپؑ کے دروازے سب سے لئے کھلے ہوئے تھے آپؑ کی دعوت عام اور اعلانیہ تھی۔ وقت کے لحاظ سے بھی ماہِ رمضان المبارک عمرہ و عبادات کا مہینہ ہونے کی وجہ سے مکہ لوگوں کی آمد ورفت کا مرکز بنا ہوا تھا' پھر رمضان کے بعد حاجیوں کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا' اس لئے یہ کہا جاسکتا کہ یزید کے خلاف آپؑ کے قیام کی خبر کہیں نہ پہنچی ہو۔ یہ خبر تو یقینی طور پر اس وقت ہر جگہ پہنچ چکی ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ امامؑ کے قیام کی دعوت کے جواب میں کس کس جگہ سے اور کہاں کہاں سے مسلمانوں نے اپنے نمائندے آپؑ کے پاس بھیجے اور اپنی تائید و نصرت کا اعلان کیا؟

صرف کوفہ اور بصرہ سے سفرا کی مکہ میں آمد کا ذکر تو تاریخ میں ملتا ہے لیکن کسی دوسری

جگہ سے کسی کے آنے کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں:

☆ایک یہ کہ دوسری جگہوں سے آنے اور جانے والوں کی رپورٹ تاریخ میں نقل نہ ہوئی ہو اور لوگوں کو حالات اور واقعات سے بے خبر رکھا گیا ہو جیسا کہ آج بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ حکومتوں کی مخالف تحریکوں کے روابط ریکارڈ پر اور اخبار میں نہیں آتے۔

☆دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اسلامی مملکت میں اس وقت مرکزی حیثیت صرف مدینہ، مکہ، کوفہ اور بصرہ ہی کو حاصل تھی اس لئے دوسرے شہروں کی نظریں انہیں چار شہروں کے رہنے والوں کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ یہ لوگ کیا اقدام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومتِ وقت کو بھی خطرہ انہیں شہروں کی طرف سے تھا اس لئے حکومت انہی پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ خود امام حسینؑ بھی انہیں شہروں کے لوگوں سے امیدیں رکھتے تھے۔ چنانچہ تاریخ میں ان کے بارے میں جو نقل ہوا ہے وہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

مکہ سے سفرا کی روانگی

(۱) امام حسینؑ کے مکہ پہنچتے ہی مکہ کے گورنر نے امامؑ کی مکہ میں آمد ان کے گھر پر لوگوں کی مسلسل آمد ورفت اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں کی ایک رپورٹ دمشق روانہ کی۔

(۲) بصرہ میں موجود پانچ سیاسی، اجتماعی اور مذہبی شخصیتوں کے نام امام حسینؑ نے ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے یزید کے خلیفہ بننے کی وجہ سے اسلام اور مسلمین کو لاحق ہونے والے خطرات سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے اپنے قیام و نہضت کے اسباب و علل بیان کئے اور انہیں اپنے قیام میں شرکت کی دعوت دی۔ آپؑ نے یہ خط اپنے قریبی معتمد شخص سلیمان بن زرین کے ہمراہ بصرہ روانہ کیا۔

(۳) کوفہ سے کثیر تعداد میں خطوط اور نمائندے آنے کے بعد امام حسینؑ نے اپنے

گھرانے کی معتمد شخصیت یعنی اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔

مکہ میں سفرا کی آمد

☆یزید بن معاویہ نے اپنے نمائندوں کو مکہ اور مدینہ کے گورنروں کے نام خطوط لکھ کر روانہ کیا جس میں انہیں خاص ہدایات دی گئیں۔ اس کے علاوہ عبداللہ بن عباس کے نام ایک خط بھی روانہ کیا کہ وہ امام حسینؑ کو اس کے خلاف قیام سے روکیں۔

☆امام حسینؑ کی مکہ میں آمد کی خبر سنتے ہی کوفہ سے مسلسل خطوط اور اہلِ کوفہ کے نمائندے مکہ پہنچنے لگے جنہوں نے انتہائی اصرار اور تاکید کے ساتھ امامؑ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے قیام و نہضت کے لئے کوفہ کو مرکز بنائیں۔

مکہ میں حسینؑ کی آمد سے سیاسی بے چینی

۳؍شعبان ۶۰ھ کو امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے بعد ۸؍ذی الحجہ ۶۰ھ تک کا دور زائرین، حجاج اور اہل مکہ کے لئے تاریخ کا وہ بہترین دور تھا جس میں ان کو ایک صالح قیادت اور بیت اللہ کے حقیقی وارث کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی قیادت سے بہرہ مند ہونے کا موقع میسر ہوا۔ دیگر حریصان اور امیدوارانِ اقتدار اور خود حکومت اور صاحبانِ اقتدار کیلئے بھی یہ عرصہ ایک عجیب بے چینی کا دور تھا۔

مکہ کے گورنر عمر بن سعید اشدق کو یقیناً یہ خبر مل چکی ہوگی کہ حسینؑ، یزید کی بیعت کو مسترد کر کے مکہ پہنچے ہیں۔ اس نے بہر حال یہ خدشہ محسوس کر لیا ہوگا کہ امام حسینؑ کا عمرے کے ایام گزرنے کے بعد مکہ پہنچنا کہیں کسی سیاسی مہم کی غرض سے تو نہیں؟ چنانچہ اسی تشویش کے تحت بے چینی کے عالم میں وہ امام حسینؑ کی خدمت میں گیا اور آپؑ سے مکہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ امامؑ نے جواب دیا کہ میں خدا سے اس کے گھر میں پناہ لینے آیا ہوں۔ حاکمِ مکہ نے امامؑ کی قیام گاہ پر لوگوں کی مسلسل آمد ورفت کو دیکھا اور دیکھا کہ وہاں پر مسئلۂ خلافت موضوع بحث

بنا رہتا ہے۔اس نے اسے ایک خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی رپورٹ یزید کو بھیجی اور اس سے اس سلسلے میں آئندہ کے لئے مزید احکامات طلب کئے۔یزید کو مدینہ سے مروان بن حکم کی طرف سے امام حسینؑ کے مدینہ چھوڑ کر جانے اور مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ کی سستی اور نااہلی اور خلیفہ کے حکم کو اہمیت نہ دینے کی رپورٹ پہلے ہی مل چکی تھی اور اب مکہ کے گورنر عمر بن سعید اشدق کی طرف سے امام حسینؑ کی مکہ میں آمد اور ان کے پاس لوگوں کی مسلسل آمدورفت اور سیاسی سرگرمیوں کی جب یہ رپورٹ دمشق پہنچی تو دمشق کی فضا بھی بے چینی میں تبدیل ہوگئی۔

مکہ کی سرزمین کوئی ایسی جگہ نہیں تھی کہ وہاں موجود مخالفین کے خلاف یزید عجلت میں کوئی فیصلہ صادر کردیتا کیونکہ اس کے نتائج مسلمان برداشت نہیں کرتے۔یہی بات یزید کے لئے بے چینی کا سبب تھی۔بہت غور و خوض کے بعد اس نے طے کیا کہ اس سلسلے میں عبداللہ بن عباس سے مدد لی جائے۔چنانچہ اس نے عبداللہ بن عباس کو خط لکھا:

''تمہارے ابنِ عم (حسینؑ) اور دشمنِ خدا عبداللہ بن زبیر میری بیعت سے انکار کرکے مکہ آئے ہیں اور فتنہ برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اس طرح خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔جہاں تک ابنِ زبیر کا تعلق ہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ وہ آج نہیں تو کل مرجائے گا۔لیکن حسینؑ کے بارے میں' میں تمہارے خاندان سے معذرت چاہوں گا۔میں حسینؑ کے بارے میں اس لئے پریشان ہوں کہ اہلِ عراق انہیں بُلا رہے ہیں اور ان کو خلافت سنبھالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو قرابت داری ہے' حسینؑ اس کو توڑ رہے ہیں۔ آپ اس خاندان کے بزرگ اور سربراہ ہیں۔آپ حسینؑ کو اس بات سے روکیں۔اگر حسینؑ نے آپ کی بات مان لی تو ان کو میری طرف سے نہ صرف امان ہے بلکہ میں ان کو انعام و اکرام سے بھی نوازوں گا۔اگر سابقہ وظائف ان کیلئے کم ہیں تو میں ان کو مزید دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔آپ

میری طرف سے ان کو ضمانت دے سکتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں بڑی سے بڑی قسم کھانے اور ہر قسم کے عہد و پیمان اور یقین دہانی کے لئے تیار ہوں''۔

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت دمشق اور مکہ کس سیاسی بے چینی کے دور سے گزر رہے تھے۔

ادھر عبداللہ بن زبیر منصبِ خلافت کا امیدوار تھا اور خود کو اس کا اہل اور حقدار سمجھتا تھا۔ جب یہ مکہ پہنچا تو لوگ اس کے پاس آمدورفت رکھتے تھے اور صحابیِ رسولؐ اور رسولؐ کے قرابت داری کی بنا پر اور یزید کی ولی عہدی کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی لوگ اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔لیکن جوں ہی امام حسین -مکہ پہنچے لوگ اس سے کٹ گئے اور اس کے پاس جانا چھوڑ دیا۔اب امام حسینؑ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے -عبداللہ بن زبیر نے جب یہ دیکھا تو سمجھ لیا کہ جب تک حسینؑ مکہ میں ہیں لوگ میری طرف رجوع نہیں کریں گے۔امام حسینؑ کے ہوتے ہوئے وہ اپنی امیدواری کی الگ سے کوئی تحریک بھی نہیں چلا سکتا تھا اور اپنے اندر چھپی ہوئی خباثت اور خلافت کا حریص ہونے کی وجہ سے خود کو امام حسینؑ کی تحریک میں ضم بھی نہیں کرسکتا تھا۔اس کے علاوہ وہ امیدواری سے دستبردار ہونے کے لئے بھی آمادہ نہ تھا۔اس لحاظ سے وہ بھی ایک عجیب بے چینی کی زندگی بسر کررہا تھا اور طے نہیں کرپا رہا تھا کہ کس طرح اس مسئلہ کا حل نکالے۔کبھی وہ امام حسینؑ کو شوق دلاتا تھا کہ وہ مکہ چھوڑ کر عراق چلے جائیں اور کہتا تھا اگر مجھے اتنے افراد حمایت میں مل جاتے تو میں بلا تاخیر کے چلا جاتا' کبھی اپنے اوپر عائد تہمت کو رفع کرنے کے لئے امامؑ کو مکہ میں ہی قیام کی تجویز دیتا۔غرض اس حوالے سے عبداللہ بن زبیر بھی سخت بے چینی کا شکار تھا۔

جہاں تک خود امام حسین -کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے تو اگرچہ ان کو مدینہ کی سرزمین کی نسبت مکہ میں امن و آزادی کی فضا نصیب ہوگئی تھی جہاں وہ اپنے اہداف و مقاصد کو کھل کر واضح

اور بنی امیہ کی حکومت کے جرائم اور مکروہ عزائم کو بے نقاب کر رہے تھے۔ لیکن وہ مکہ میں اس سے زیادہ کچھ اور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اگر چہ سرزمینِ مکہ آیاتِ قرآنی کی نص کے تحت جائے قیام ہے لیکن کسی کے خلاف چاہے وہ کتنا ہی ظالم انسان کیوں نہ ہو یہاں مسلح قیام نہیں کیا جا سکتا اور اگر امام حسینؑ ایسا کرتے تو وہ آپؑ کے مفاد میں نہیں بلکہ الٹا حکومتِ بنی امیہ کے مفاد میں ہوتا۔ ایسا کرنے سے حکومتِ وقت کو واضح کرنے کے لئے بحث و تمحیص اور بیانات دینے کی حد تک یہ جگہ مناسب اور موزوں تھی۔ کسی نہضت و قیام کو عملی شکل دینے کے لئے مکہ سے باہر ایک وسیع فضا کی ضرورت تھی۔ اس لئے امام حسینؑ ایک ایسی فضا کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ایک طرف تو امامؑ نے بصرہ میں موجود اشرافِ بصرہ کے نام خط لکھا' دوسری طرف آپؑ کے منتظر تھے کہ کوفہ والے اس وقت کیا موقف اختیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ والیٔ مکہ اور حکومت کی نقل و حرکت پر بھی آپؑ نظر رکھے ہوئے تھے اور بنی امیہ کی حکومت کی تدابیر اور چالوں کو دیکھتے ہوئے اپنے اگلے اقدام کا انتظار کر رہے تھے۔

مکہ میں مخفی انداز میں قتل کی سازش

ادھر دمشق اور مکہ کے دارالامارہ کے درمیان امام حسینؑ کی سرگرمیوں کے بارے میں طویل بحث و تمحیص کے بعد بنی امیہ کی حکومت اس انتظار میں تھی کہ امام حسینؑ کی طرف سے کوئی ایسا اقدام سرزد ہو جسے جواز بنا کر حکومت آپؑ کو گرفتار اور قتل کر سکے۔ لیکن حسینؑ بن علیؑ جیسی دانا اور مدبر شخصیت کی طرف سے حکومت کو ایسا کوئی جواز میسر آ جانا ناممکن تھا۔ چنانچہ اپنے مکروہ عزائم میں ناکام ہونے کے بعد حکومت نے مکہ کی سرزمین میں امامؑ کے مخفیانہ قتل کی سازش تیار کی۔ حاجیوں کی لباس میں اپنے کارندے مکہ بھیجے تاکہ امام حسینؑ کو مکہ میں قتل کر دیں۔

حکومت اپنے من مخالفین کو قتل کرنے کے درپے ہوتی ہے وہ عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں...... ایک وہ کہ جن کو کوئی پشت پناہی حاصل نہیں ہوتی اور ان کے قتل ہو جانے سے قوم کی ایک

طرف سے کسی سخت ردِ عمل یا غم وغصہ کے اظہار کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حکومت ایسے افراد کو برسرِ عام قتل کرنے سے نہیں ہچکچاتی کیونکہ اس طرح نہ اس کی پوزیشن پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ کوئی اسے مجرم ٹھہراتا ہے۔ البتہ حکومت کے مخالفین کا ایسا گروہ جس کا کردار صاف وشفاف ہوتا ہے اور جس کے دامن پر کسی بھی قسم کا کوئی دھبہ نہیں ہوتا اور نہ لگایا جا سکتا ان کے وجود کو حکومت اتنی آسانی سے ختم نہیں کر سکتی کیونکہ اس صورت میں حکومت کو شدید عوامی ردِ عمل اور قوم کے غیظ وغضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ایسے افراد کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے عیارانہ سازشوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک ایسی سازش کہ جس سے حکومت کا مخالف بھی ختم ہو جائے اور قاتل کا پتہ بھی نہ چل سکے۔ ایسے افراد کے قتل کے بعد حکومت مقتول کے غم میں سوگوار ہونے کا ڈھونگ بھی رچاتی ہے' ان کے جنازے اور تجہیز و تکفین میں شرکت بھی کرتی ہے تاکہ حکومت کے دامن پر قتل کے تہمت نہ لگے۔ چنانچہ ہمارے اکثر و بیشتر آئمہؑ کا قتل بھی اسی طرح ہوا خلیفہ اور حکمران ان کے جنازے میں شریک ہو کر سوگوار ہونے کا الٹا ڈرامہ بھی رچاتے تھے۔

بنی امیہ اور اس کے کارندے کچھ اسی طرح امام حسینؑ کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے کیونکہ ''حسینؑ'' جیسی شخصیت کو نہ تو کوئی تہمت لگا کر قتل کیا جا سکتا تھا اور نہ کھلم کھلا سامنے آ کر۔ لہٰذا حکومت ایک ایسی عیارانہ سازش کر رہی تھی کہ حسینؑ قتل بھی ہو جائیں اور حکومت پر اس کی ذمہ داری بھی عائد نہ ہو۔

لیکن امام حسینؑ نے ان کی اس سازش کو نہ صرف کامیاب ہونے کا موقع نہیں دیا بلکہ ان کے مکروہ عزائم کو اپنے قول و فعل دونوں سے برملا فاش کر دیا۔

وہ مکہ کہ جہاں ہر شخص کو پناہ لینے کا حق ہے اس جائے امن سے بھی کو امامؑ کو محروم ہونا پڑا لیکن آپؑ نے مکہ چھوڑ کر ان کے عزائم کو بے نقاب کر دیا۔ آپؑ نے خاموشی سے رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ دن کی روشنی میں ہزارہا انسانوں کی آنکھوں کے سامنے مکہ چھوڑا۔ آپؑ نے مکہ

چھوڑنے کی تین وجوہات بیان فرمائیں:

(۱) ''اگر میں مکہ سے نہ نکلوں گا تو یہ لوگ مجھے مکہ ہی میں قتل کر دیں گے''۔

(۲) ''مکہ سے باہر قتل ہو جانا مجھے زیادہ پسند ہے''۔

(۳) ''میں نہیں چاہتا کہ میرے قتل ہونے کی وجہ سے اس گھر (بیت اللہ) کی ہتکِ حرمت ہو''۔

امامؑ کے پہلے جملہ کا مقصد یہ ثابت کرنا اور لوگوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ حکومت مجھے قتل کر دینے کے درپے ہے۔ مکہ میں چار ماہ کی قیام کی مدت میں امام حسینؑ کا یہ بیان سخت ترین بیان ہے جس میں آپؑ نے واشگاف الفاظ میں بنی امیہ کے مذموم عزائم اور ارادوں کو فاش کیا۔ یعنی آپؑ نے وہاں موجود حجاج کو بتلایا کہ تمہارا خلیفہ وہ شخص ہے جو جرم و فساد میں اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ مکہ جیسی سرزمین میں بھی انسانی خون بہانے سے نہیں چوکتا۔ آپؑ نے بتایا کہ تمہارا یہ حاکم جو امیرِ حج ہے اس کے ہاتھوں حجاج کی جان و مال تو کجا اسلام کے محافظین بھی محفوظ نہیں۔

دوسرے جملے سے آپؑ نے یہ ظاہر فرمایا کہ میں قتل ہو جانے سے نہیں ڈرتا لیکن اس طرح کے قتل سے میں ضرور فرار اختیار کروں گا جس میں قاتل کا چہرہ چھپا رہے اور مجرم بے نقاب نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میں مکہ کی سرزمین سے باہر نکلوں چاہے ایک بالشت ہی سہی تا کہ میں ان قاتلوں کا مقابلہ کروں جو میرے پیچھے آتے ہیں اور اس طرح ان کو ان کے جرائم کو بے نقاب کروں چنانچہ مکہ کے گورنر عمر بن اشدق نے اپنے بھائی یحیٰی بن سعید اشدق کی قیادت میں ایک لشکر امام حسینؑ کے تعاقب میں روانہ کیا۔ آپؑ نے اس کا مقابلہ کیا اور اس کو مکہ واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

امامؑ کا تیسرا جملہ خدا کے گھر کی عظمت اور حرمت کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ آپؑ نہیں چاہتے تھے کہ آپؑ کے قتل ہو جانے کی وجہ سے اس گھر کی ہتکِ حرمت ہو۔ اگرچہ آپؑ کے قتل

ہو جانے میں آپؑ کا کوئی کردار نہیں ہوتا اس لئے کہ حرم کی ہتکِ حرمت کا مرتکب قاتل ہے نہ کہ مقتول کہ جس کو بے گناہ قتل کیا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ آپؑ جانتے تھے کہ آپؑ کے خلاف حکومت جس قسم کی سازش کر رہی ہے اس میں قاتل گمنام اور بے نقاب رہے گا اس طرح خانہ خدا کی ہتکِ حرمت کرنے والا ہمیشہ کیلئے مجہول رہے گا اور آپؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بیت اللہ کی ہتکِ حرمت کا مرتکب مجہول قرار پائے۔

اس کے علاوہ مسئلہ یہ نہیں کہ خانہ خدا کی ہتکِ حرمت کون کر رہا ہے یا اس گھر میں قتل ہونے والے مقتول کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ اس گھر کے تقدس کو برقرار رکھنا ہے۔ قاتل کو تو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے اس گھر کی ہتکِ حرمت ہو رہی ہے کیونکہ وہ مجرم ہے لیکن اگر مقتول کے امکان میں یہ بات ہو کہ وہ اس محترم جگہ پر قتل ہونے سے خود کو بچا سکتا ہے تو اس پر یہ ذمہ داری بہرحال عائد ہوتی ہے کہ جس حد تک ممکن ہو وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے تا کہ اس گھر کی حرمت کو برباد ہونے سے بچا سکے۔ چنانچہ امام حسینؑ جو یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ انہیں ہر حال میں قتل ہونا ہے وہ کس طرح یہ گوارا کر سکتے تھے کہ ان کا قتل ہونا اس گھر کی حرمت پامال ہونے کا سبب بنے۔ یہاں اندازہ ہوتا ہے کہ آپؑ کو اس گھر سے کتنی محبت تھی اور اس گھر اور اس گھر کے تقدس کا کتنا پاس اور احترام تھا۔ آپؑ نے اپنے مفادات کو چھوڑ کر مکہ کی حرمت کا خیال رکھا جب کہ دوسری طرف ہم عبداللہ بن زبیر کو دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنے تحفظ کو کعبہ کی حرمت پر مقدم رکھا اور بنی امیہ نے اپنے اقتدار کو کعبہ کی اہانت کی قیمت پر بھی بحال رکھا۔

امام حسینؑ اور حج

فرائضِ اسلامی میں حج اہم ترین اور جامع ترین فریضہ شمار ہوتا ہے۔ حج کی جڑیں حضرت آدم صفی اللہؑ سے شروع ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جاہلیت بت پرستی اور خود پرستی کے

دور میں بھی مشرکین یہ رسم کسی نہ کسی شکل میں بجالاتے تھے۔فریضۂ حج کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں شواہد ملتے ہیں یہاں تک کہ قرآنِ کریم میں ایک سورہ سورۂ حج اس فریضہ کے نام سے موسوم ہے جبکہ کسی اور فریضہ کو یہ شرف حاصل نہیں ۔اسلام کی بقاء کعبہ سے مربوط ہے۔اسلام اس وقت تک باقی ہے جب تک کعبہ باقی ہے اور کعبہ کی بقاء حج وعمرہ سے مربوط ہے۔قدرت اور استطاعت رکھتے ہوئے اس فریضہ کو انجام نہ دینے والوں کیلئے وعید دی گئی ہے کہ قیامت کے دن اندھے اور یہود ونصاریٰ کی شکل میں محشور ہوں گے۔تمام اعمالِ ثواب کو تولنے کا پیمانہ حج وعمرے کو قرار دیا گیا ہے۔یہاں تک کہ اگر مسلمان حج پر جانے میں معذوری یا سستی کا مظاہرہ کریں تو امامِ وقت پر واجب ہے کہ ان کو جبری حج پر بھیجے اور اگر زادِ راہ اور نفقہ کی کمی ہو تو وہ بیت المال سے پورا کرے۔حج کو عمداً ترک کرنے والوں کیلئے آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بھی نزولِ عذاب کی وعید دی گئی ہے۔

یہ اہم ترین اور بافضیلت فریضہ درگاہِ خداوندی میں قبولیت کیلئے اس امر سے مربوط ہے کہ انسان پیغمبرختمی مرتبتؐ اور اپنے امامِ زمانہ سے تمسک اور توسل نہ رکھتا ہو تو اس کا حج خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوگا۔

ہر دور کا امام ہی لوگوں کو حج کی دعوت دیتا ہے اور وہی مدیر ومرپرستِ حجاج بھی ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی آئمہؑ اپنے آپ کو سرزمینِ مکہ وعرفات پہنچاتے تھے اور اس سفر میں اٹھائی جانے والی زحمتوں اور تکلیفوں کو اپنے لئے باعثِ شرف وافتخار سمجھتے تھے۔امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ دونوں نے ۲۵ سال پیدل اور پابرہنہ حج کیا۔دورانِ حج اکثر وبیشتر ایک گمنام حیثیت سے حجاج کے کاروانوں میں شامل ہوتے اور ارکانِ کاروان کی خدمت کرتے تھے۔اگر کسی وقت لوگوں کو ان ذواتِ مقدسہ کے بارے میں پتہ چل جاتا تو وہ کاروان بدل دیتے اور کسی دوسرے کاروان میں

اس کی خدمت کیلئے شامل ہوجاتے۔

حسینؑ جو اس بافضیلت اور باعظمت فریضہ کو بجالانے کے ہمیشہ شیفتہ وفریفتہ رہے ہوں ۔عینِ حج کے موقع پر جب ایک دنیا عرفات ومنیٰ کی جانب رواں دواں ہے یکا یک ایک مرتبہ اس عظیم فریضہ کو چھوڑ کر ایک دوسری جانب نکل کھڑے ہوتے ہیں ۔دنیا حیران ہے کہ ''حسینؑ'' کیا چاہتے ہیں؟اس وقت سے لے کر آج تک ہر انسان کے ذہن میں اس حسینی اقدام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں ۔ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان سوالات کا جواب دیتا رہا ہے۔اربابِ سیاست سیاسی پہلو سے'اہلِ عرفان عرفانی زاویے سے'فقہا فقہی نقطۂ نظر سے امامؑ کے اس اقدام کی توجیہ کرتے رہے ہیں۔امامؑ کے عین ایامِ حج میں مکہ چھوڑنے کے سیاسی اسباب پر ہم گزشتہ سطور میں روشنی ڈال چکے ہیں ۔ذیل میں ہم اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ آخر امامؑ نے ان ایام میں کس طرح مکہ چھوڑا کیونکہ احرام باندھنے کے بعد حج کو ادھورا چھوڑنا جائز نہیں'حج کا احرام باندھنے والے پر لازم ہے کہ وہ بہر طور حج کو مکمل کرے۔تاریخ ومقاتل میں اس بارے میں متعدد اقوال ملتے ہیں۔

پہلا قول

چونکہ امام حسینؑ حج کو پورا کر سکتے تھے اس لئے آپؑ نے احرامِ حج کو عمرۂ مفردہ کے احرام سے بدلا'عمرہ کیا اور مکہ سے نکل گئے۔جیسا کہ بعض مقاتل'یہاں تک کہ شیخ مفید علیہ الرحمہ اور طبری وغیرہ نے بھی نقل فرمایا ہے۔

دوسرا قول

امام حسینؑ کو حج کرنا تھا لیکن معذوری کو مدِنظر رکھتے ہوئے عمرہ کیا'طواف کیا'صفا ومروہ کے درمیان سعی کر کے احرام سے محل ہوئے اور مکہ سے نکل گئے۔

تیسرا قول

امامؑ نے کعبہ کا طواف کیا' صفا و مروہ کے درمیان سعی کی اور مکہ سے نکل گئے۔ جیسا کہ بعض مقاتل میں بھی لکھا ہے۔

چوتھا قول

صرف بیت اللہ کا طواف کیا' مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھی' حجاج سے خطاب کیا اور مکے سے نکل گئے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ان مفروضوں میں سے کون سا مفروضہ قرینِ صحت ہے اور شواہد و دلائل پر پورا اترتا ہے۔

پہلے قول پر بحث

جہاں تک پہلے مفروضے کا تعلق ہے کہ امامؑ نے حج کو عمرہ میں تبدیل کیا اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی بلکہ اس پر کئی اشکالات وارد ہوتے ہیں:

اشکال نمبر ۱

اگر کسی نے حج کے مہینوں (شوال' ذی قعدہ' ذی الحجہ) میں عمرۂ مفردہ کا احرام باندھا ہو اور عمرہ بجالایا ہو تو اس کو حج میں تبدیل کرنے کا جواز اور صورت تو فقہ میں موجود ہے لیکن حج کو عمرے میں تبدیل کرنے کی کوئی صورت فقہ میں نظر نہیں آتی۔

اشکال نمبر ۲

حج کی مہینوں سے پہلے امامؑ مکہ میں موجود تھے اس لئے وہ اہل مکہ میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ اس صورت میں اگر وہ حج کا احرام باندھتے تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ احرامِ حج کیلئے میقات تک جاتے' لیکن کسی بھی تاریخ اور مقاتل میں نہیں ہے کہ مکہ پہنچنے کے بعد امامؑ میقات کیلئے نکلے اور وہاں سے احرام باندھ کر آئے۔

اشکال نمبر ۳

جیسا کہ مقاتل میں لکھا ہے کہ جب امامؑ مکہ سے نکلے تو ان کے ہمراہ تقریباً سو (۱۰۰) انصار و اعوان تھے۔ لیکن تاریخ میں کسی کے بارے میں نہیں ہے کہ امامؑ نے ان سے فرمایا ہو کہ اب تم حج کو عمرہ سے بدل لو اور نہ ہی تاریخ میں کہیں یہ ملتا ہے کہ کسی نے امامؑ سے پوچھا ہو کہ اب ہمارے حج کا کیا ہوگا۔

اشکال نمبر ۴

حج کا احرام باندھنے کے بعد حج کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا واجب ہے۔ دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں اس کو ترک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں:

(۱) ایک تو مصدود ہونے کی صورت میں جہاں کسی مخالف گروہ یا حکومت کی طرف سے حج کی انجام دہی سے کسی کو روکا جائے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۲ اور سورۂ فتح کی آیت ۲۵ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ عمرے کے موقع پر مشرکین نے پیغمبر اسلامؐ کو حدیبیہ کے مقام پر مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تو آپؐ نے وہیں سے ہدیہ کو ذبح کیا' تقصیر کی اور احرام سے محل ہو کر مدینہ واپس چلے گئے۔

(۲) دوسرے محصور ہونے کی صورت میں ...... یعنی کسی کو اثناء راہ میں کوئی ایسا مرض لاحق ہو جائے کہ وہ سفرِ حج جاری نہ رکھ سکے تو وہ وہیں احرام سے محل ہو جاتا ہے۔

البتہ محصور ہونے اور مصدود میں فرق یہ ہے کہ محصور ہونے کی صورت میں محل ہونے کے بعد اور حالات میسر ہونے کے بعد طواف النساء بجالانا ضروری ہے۔ چنانچہ یہ صورت حال امام حسینؑ کو اپنے پدر بزرگوار کے زمانہ میں پیش آئی۔ محرم ہونے کے بعد مکہ اور مدینہ کے درمیان کسی منزل پر آپؑ بیمار ہو گئے' جب امام علیؑ کو یہ خبر ملی تو وہ تشریف لائے اور انہوں نے قربانی کے بعد امام حسینؑ کو احرام سے محل کیا اور انہیں واپس اپنے ساتھ مدینہ لے گئے۔

چنانچہ حج کے بدلے میں عمرہ بجالانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔

اشکال نمبر ۵

جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ امامؑ حج کے بدلے میں عمرہ بجالائے' وہ کہتے ہیں کہ آپؑ نے طواف کیا' سعی کی اور مُحل ہو کر مکہ سے نکل گئے لیکن کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپؑ نے طواف النساء بھی بجالائے جب کہ عمرۂ مفردہ میں مُحل ہونے کے بعد طواف النساء بجالانا ضروری ہے۔

اشکال نمبر ۶

امام حسینؑ کا شمار معاذ اللہ ہم جیسے افراد یا عام قائد و رہبر کے زمرے میں نہیں ہوتا کہ جو عواقب و نتائج کو سر سے پانی گزر جانے کے بعد درک کرتے ہوں اور دشمن کے سر پر آ جانے کے بعد خطرے کا احساس کرتے ہوں بلکہ امامؑ کا ہر اقدام مدبرانہ ہوتا ہے۔ بنی امیہ کی طرف سے اپنے لئے لاحق ہونے والے ہر خطرے کے خلاف آپؑ ہر ممکنہ تدبیر کو نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ مدینہ سے نکلتے وقت ہی آپؑ نے اچھی طرح اپنی جان کو لاحق خطرے کا احساس کر لیا تھا لہٰذا حج نہ کر سکنا آپؑ کے نزدیک یقینی امر تھا۔ تو پھر آپؑ حج کا احرام کیوں کر باندھ سکتے تھے جب کہ آپؑ کو یقین تھا کہ آپؑ حج کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔

لہٰذا یہ مفروضہ کہ امامؑ نے حج کو عمرہ میں تبدیل کیا بالکل بے بنیاد ہے۔

دوسرے قول پر بحث

یہ مفروضہ بھی کہ "امامؑ کو حج کرنا تھا لیکن معذوری کی وجہ سے نہیں کر سکے اور عمرۂ مفردہ بجالائے"۔ درست نہیں ہے اولاً تو یہ کہ عمرۂ مفردہ بجالانے والے مقیم اور غیر مقیم دونوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ قریب ترین میقات (مثلاً مسجدِ تنعیم یا جعرانہ) سے احرام باندھیں۔ یہ میقات اس وقت مکہ کی حدود سے باہر تھے اور امامؑ کو مکہ سے باہر نکلنے میں خطرہ تھا اور وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اسکے علاوہ کسی نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ امامؑ عمرۂ مفردہ کیلئے احرام باندھنے مسجدِ تنعیم یا جعرانہ تشریف لے گئے۔

بالفرضِ محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امامؑ عمرۂ مفردہ بجالائے تو جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ...... کسی نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ امامؑ نے عمرۂ مفردہ بجالانے اور احرام سے مُحل ہونے کے بعد طواف النساء کیا جب کہ عمرۂ مفردہ میں طواف النساء بجالانا ضروری ہے۔

تیسرے قول پر بحث

بعض مقاتل میں جو یہ کہا گیا ہے کہ "امام حسینؑ نے صرف کعبہ کا طواف کیا' صفا و مروہ کی سعی کی اور مکہ سے نکل گئے"۔ یہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ ظاہر ہے کہ امامؑ کا یہ طواف کرنا اور سعی کرنا مستحبی امر تھا۔ لیکن شریعت میں مستحبی طواف بجالانے کا تو ذکر ہے لیکن صفا اور مروہ کے درمیان مستحبی سعی بجالانے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

چوتھے قول پر بحث

اب رہا یہ مفروضہ کہ امام حسینؑ نے عین موقع پر ۸ ذی الحجہ کو طواف کیا اور مکہ سے نکل گئے۔ یہ مفروضہ قرینِ صحت ہے جیسا کہ بحار الانوار کی جلد ۹۹ میں ذکر ہوا ہے۔

کعبہ اور حج سے حسینؑ کا گہرا رشتہ

انبیاء اور آئمہ اطہارؑ کا کعبہ' مقاماتِ مقدسہ' حج اور اعمالِ حج سے وہی رشتہ رہا ہے جو روح کا بدن سے ہے۔ کعبہ اور حج سے انبیاءِ کرامؑ اور آئمہ اطہارؑ کے رشتے کے بارے میں قرآنی آیات' کثیر روایات اور کتبِ تاریخ میں کثرت سے نمایاں طور پر ذکر موجود ہے۔ قرآنی آیات اور روایات کی رُو سے کعبہ کی تعمیر' تولیتِ بیت اللہ' ندا اور دعوتِ حج اور تعلیمِ حج کی ذمہ داری حُجتِ خدا اور ہادیانِ برحق کے کندھوں پر عائد کی گئی ہے۔ سورۂ حج کی آیت ۲۷ میں بندگانِ خدا کو اس گھر کی طرف بلانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں اگرچہ اس حکم کے مخاطب کا ذکر نہیں ہے (یعنی یہ ذکر قرآن میں واضح نہیں ہے کہ حج کی طرف بلانے والا کون ہو) لیکن یہ اشارہ واضح طور پر موجود ہے کہ حج کی دعوت پر لبیک کہنے والے حجاج کرام کی ندا دینے والے کی طرف آئیں

گے ...... چنانچہ اس آیت میں جہاں حج کی ندا دینے کا حکم ہوا ہے: ﴿اذن فی الناس بالحج﴾ "یعنی لوگوں کو حج کی طرف بلاؤ"۔ اس کے فوراً بعد ذکر ہوا ہے: ﴿یاتوک رجالا......﴾ "یعنی لوگ آپ کے پاس آئیں گے"۔

اگر چہ عام طور پر یہ معروف ہے کہ حج کی ندا دینے کا حکم حضرت ابراہیمؑ دیا گیا لیکن یہ آیت وجوب حج کی دلالت کرتی ہے اور حج کے لئے ندا دینے کے دائمی حکم کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہر دور کے حجتِ خدا اور ہادیٔ برحق کی ذمہ داری اور مسئولیت ہے کہ وہ بندگانِ خدا کو اس گھر کی طرف بلائے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اپنے دور کے منادیٔ حج تھے پیغمبر ختمی مرتبتؐ اپنے دور کے اور اسی طرح ہر امام اپنے دور کا منادیٔ حج ہے لہٰذا جب بھی اور جہاں بھی اس ندا اور دعوت میں سستی اور کمزوری ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حاجیوں کی تعداد کم ہوگی اور جب اس ندا میں وسعت اہمیت اور تاکید ہوگی حجاج کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ اس دعوت اور ندا دینے کو ایک "ندائے تکوینی" قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ منادیٔ حج ہر دور کا امام ہوتا ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو اس گھر کی طرف بلائے۔

کعبۂ حج اور امامِ وقت کے درمیان رشتے کے سلسلے میں ہم یہاں چند دلائل پیش کرتے ہیں:

(۱) سورۂ بلد کی پہلی آیت: ﴿لا اقسم بھذا البلد﴾ میں کعبہ اور مکہ کی عظمت کو پیغمبر اسلامؐ کی ذات سے مربوط قرار دیا گیا ہے۔ مفسرین اس سورہ میں "لا اقسم......" کے "لا" کے بارے میں اختلافِ نظر رکھتے ہیں۔ بعض اس کو "لائے نافیہ" کہتے ہیں۔ اس صورت میں اس آیت کے معنی یہ ہونگے کہ "ہم اس شہر کی قسم نہیں کھاتے" اس کے برخلاف بعض مفسرین اس "لا" کو "لائے زائدہ" کہتے ہیں اگر اس کو "لائے زائدہ" کہا جائے تو اس آیت کے معنی ہوں گے کہ "ہم اس شہر کی قسم کھا کر کہتے ہیں"۔

بہر حال دونوں صورتوں میں خداوندِ عالم نے اپنے "قسم نہ کھانے" یا "اپنے قسم کھانے" کو پیغمبر اسلامؐ کے مبارک وجود سے مربوط کیا ہے یعنی پہلی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ "ہم اس شہر کی قسم نہیں کھاتے"

کیونکہ اس شہر کے رہنے والوں میں آپؐ کی جان اور آپؐ کے خون کو حلال سمجھا ہے

جبکہ دوسری صورت میں یہ معنی ہونگے کہ "ہم اس شہر کی قسم کھاتے ہیں"

کیونکہ آپؐ اس شہر میں رہتے ہیں۔

(۲) سورۂ مبارکہ ابراہیم کی آیت ۳۷ میں حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا ذکر ہے کہ جس میں وہ فرماتے ہیں:

"خداوندا! لوگوں کے دلوں کو اس گھر کی طرف منقلب کردے"

اس آیت کی تفسیر میں معصومؑ نے امامِ وقت کو اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی:

"خداوندا! لوگوں کے دلوں کو اہل بیت اطہارؑ کی طرف مائل کردے"۔

(۳) کتاب ثواب الاعمال کے صفحہ ۲۴۳ میں ابوحمزہ ثمالی نے امام سجادؑ سے نقل کیا ہے کہ امام سجادؑ نے ان سے پوچھا:

"روئے زمین پر کون سا قطعہ افضل ترین بقعہ ہے؟

ابوحمزہ ثمالی نے جواب دیا کہ خدا اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا:

رکن اور مقام (یعنی حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیمؑ) کی جگہ۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

اگر کوئی شخص اپنی قوم میں نوحؑ کی عمر پائے اور تمام عمر دن کو روزہ رکھے اور رات

کو نماز میں مصروف رہے، حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیمؑ کے درمیان جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائے لیکن اگر وہ ہم اہل بیتؑ کی ولایت نہ رکھتا ہو تو اس کا روزہ، نماز اور جہاد اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا"۔

(۴) حج ......طوافِ کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور عرفات، مشعر اور منیٰ میں وقوف کا نام ہے۔ لیکن کتبِ احادیث (مثلاً وسائل الشیعہ) میں ایک باب ہے کہ جس میں بحث کی گئی ہے کہ آیا مکہ سے ابتداء کر کے حج کا اختتام مدینہ پر کیا جائے یا مدینہ سے ابتداء کر کے مکہ پر اختتام کیا جائے۔ اس سلسلے میں معصومؑ فرماتے ہیں:

"ابتداء مکہ سے کریں اور اختتام مدینہ پر"۔

معصومؑ کا یہ فرمان "حج اور پیغمبر اسلامؐ کے درمیان رشتہ" کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد بھی حج کی قبولیت کو آپؐ کی قبرِ مطہر پر حاضری سے مربوط کیا گیا ہے۔

حج کی ابتداء مکہ سے اور اختتام مدینہ پر کرنے کے فلسفہ کے بارے میں سورۂ حج کی آیت ۲۹ کی تفسیر میں حج کی تکمیل کو امامؑ کی ملاقات سے مربوط اور مشروط قرار دیا گیا ہے یعنی مدینہ جانے کا مقصد صرف روضۂ رسولؐ کی زیارت ہی نہیں بلکہ امامِ وقت سے ملاقات بھی ہے۔ بعض احادیث کی رُو سے بھی تکمیلِ حج کو لقاءِ امامؑ سے مربوط اور مشروط قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ اعراف کی آیت ۳۳ میں شریعت میں موجود تمام واجبات اور محرمات کے دو پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ ایک اس کا ظاہری پہلو اور دوسرا باطنی۔ ہر عمل کے دو پہلو ہیں ظاہری پہلو اس کا بدن ہے اور باطنی پہلو اس کی روح ہے اور وہ روح امامِ وقتؑ، اس سے وابستگی اور اس کے راستے پر گامزن ہونا ہے۔ اسی طرح محرمات کا ظاہری پہلو اس کا بدن ہے اور باطنی پہلو اس حرام فعل کی روح ہے اور وہ روح وقت کا باطل امام، اس سے وابستگی اور اس کی راہ کو اپنانا ہے۔ اپنے وقت کا باطل امام ہی ان محرمات کو فروغ دینے کا سبب بنتا ہے چنانچہ اس آیت ہی سے

استدلال اور نتیجہ اخذ کرتے ہوئے امام حسن مجتبیٰؑ اور امام سجادؑ دونوں نے کعبہ، رکن و مقام، صفا و مروہ، عرفات و منیٰ اور سعی و طواف کی روح و جان اہل بیت اطہارؑ کو قرار دیا ہے۔

چنانچہ کعبہ اور امامِ وقت کے درمیان یہ رشتہ اور ربط ہی اس امر کا سبب تھا کہ آئمہ اطہارؑ تمام تر ناگوار اور نا سازگار حالات کے باوجود ایامِ حج میں خود کو کسی نہ کسی طرح حرم اور جوارِ کعبہ میں پہنچاتے تھے۔ اس کعبہ سے ان کے گہرے رشتہ کا گویا یہ اعلان ہے۔ لیکن ۶۰ ہجری میں جب امام حسینؑ نے یہ دیکھا کہ غاصب متولیانِ بیت الحرام، اس بیت اللہ اور حج کے ظاہری چہرے کو بھی مسخ کرنے کا عزم و ارادہ کئے ہوئے ہیں تو آپؑ ان کے ناپاک اور منحوس عزائم سے حجاجِ کرام اور عالمِ اسلام کو آگاہ کرنے کے لئے عین ایامِ حج میں حج اور کعبہ کو چھوڑ کر نکلے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال چھوڑ جائیں:

حجاج اور حرم کا عاشق یہ حسینؑ کیوں اس حج و حرم کو چھوڑ کر نکلنے پر مجبور رہا؟

امام حسینؑ کو سفرِ عراق سے باز رکھنے کی کوشش

امام حسینؑ نے جب حج کو ترک کر کے عراق کی طرف روانگی کا عزم کیا تو اس وقت کی اجتماعی، سیاسی اور مذہبی شخصیات اور ان کے علاوہ آپؑ کے دوست و احباب حتٰی مخالفین نے بھی آپؑ کو اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی اور مشورہ دیا کہ آپؑ اس سفر کا ارادہ ترک کر دیں اور عراق کی طرف نہ جائیں۔ جن لوگوں نے آپؑ کو اس سفر باز رکھنے کی کوشش کی ان میں سرِفہرست یہ افراد ہیں:

(۱) عبداللہ بن جعفر: یہ آپؑ کے ابنِ عم اور حضرت زینت = کے شوہر تھے۔ انہوں نے آپؑ کو مشورہ دیا کہ آپؑ اس سفر سے اجتناب فرمائیں کیونکہ اس سفر میں آپؑ اور آپؑ کے اہل و عیال کی جان کو خطرہ ہے۔ اگر آپؑ کو کوئی حادثہ پیش آیا تو روئے زمین تاریک ہو جائے گی۔

(۲) عبداللہ ابن عباس: انہوں نے کہا کہ آپؑ ایسی قوم کی طرف سفر کر رہے ہیں جس نے اپنے امامؑ کو شہید کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ آپؑ کو تنہا چھوڑ دیں گے اور آپ کو دھوکہ دیں گے۔ اگر یہ لوگ واقعی مخلص ہیں تو پہلے اپنے امیر کو برطرف کردیں۔

(۳) محمد ابن حنفیہ: انہوں نے آپؑ سے فرمایا کہ آپؑ اہلِ عراق کو بہتر جانتے ہیں۔ ان لوگوں نے آپؑ کے پدر بزرگوار اور آپؑ کے برادر عزیز کے ساتھ غدار اور بے وفائی کی۔ آپؑ کے ساتھ بھی یہ ویسا ہی سلوک کریں گے۔

(۴) عبداللہ ابن زبیر: عبداللہ ابن زبیر نے کہا آپؑ ایسے لوگوں کی طرف جا رہے ہیں جنہوں نے آپ کے والد اور آپؑ کے بھائی کو قتل کیا۔

(۵) ابوبکر مخزومی: انہوں نے کہا آپؑ ایسی قوم کی طرف جا رہے ہیں جنہوں نے آپ کے والد کو اور اس کے بعد آپؑ کے بھائی کو قتل کیا۔ میں ان سب کو جانتا ہوں یہ اہل دنیا ہیں جو آپ کو دعوت دے رہے ہیں یہی لوگ آپؑ سے جنگ کریں گے اور آپؑ کو تنہا چھوڑیں گے۔

(۶) جابر بن عبداللہ انصاری: آپ نے امامؑ سے استدعا کی کہ آپؑ مکہ کو نہ چھوڑیں

-

(۷) عبداللہ مطیع: انہوں نے کہا کہ جو بنی امیہ کی اس قوم کے ہاتھ میں ہے اگر آپ وہ طلب کریں گے تو وہ آپؑ کو کچھ نہ دیں گے بلکہ آپ کو قتل کریں گے خدا کے لئے آپؑ کوفہ کی طرف نہ جائیں۔

(۸) مسور بن مخرمہ نوفل زہری: اس نے کہا کہ آپ کوفہ والوں کے خطوط کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اگر یہ لوگ سچے ہیں اور سچ کہتے ہیں تو ان سب کو یہاں آنا چاہیے اور آپ کو ایک شان و شوکت کے ساتھ لے جانا چاہیے۔

(۹) عبداللہ بن عمر: اس نے مشورہ دیا کہ آپؑ یہاں سے حرکت نہ کریں اور جس

دروازے سے قوم داخل ہوئی ہے آپؑ بھی اسی دروازے سے داخل ہوں تو بہتر ہے۔

(۱۰) سعید بن مسیّب: انہوں نے کہا حسینؑ اگر مکہ سے نہ نکلتے تو بہتر تھا۔ (کتاب حیات امام حسینؑ ج سوم، ص ۲۳ تا ۳۵)

ان سب نے اپنی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق امامؑ کو مشورہ دیا کہ آپ اس سفر سے باز رہیں۔ ان مشورہ دینے والوں کی منطق یہ تھی۔

☆۔ اس سفر میں امامؑ کی جان کیلئے خطرہ ہے۔

☆۔ یہ لوگ اہلِ غدر ہیں، بے وفا ہیں، آپؑ کو دھوکہ دیں گے۔

☆۔ آپؑ کے دشمن قوی اور طاقتور ہیں۔

☆۔ یہ لوگ جنہوں نے آپؑ کو دعوت دی ہے سب اہل دنیا ہیں، جب ان کی دنیا خطرے میں پڑے گی تو یہ آپؑ کا ساتھ نہیں دیں گے۔

مشورے کی حیثیت آیاتِ قرآنی اور سیرتِ آئمہؑ کی روشنی میں

آیا نبی اور امام کو اپنے کاموں میں کسی سے مشورہ لینا چاہیے یا نہیں اور اگر کوئی مشورہ دے تو اس پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس کے علاوہ پیغمبر مرسلؐ اور امیرالمومنینؑ کا اپنے دور میں کیا طریقہ کار رہا، یہ جاننے کے لئے ہمیں اس کا سرسری جائزہ لینا ہوگا۔

☆ قرآن کریم کی سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ کے مطابق پیغمبرؐ مامور ہیں کہ لوگوں کے ان امور میں کہ جو خود ان سے مربوط ہیں ان سے مشورہ کریں۔

☆ سورۂ مبارکہ شوریٰ کی آیت ۳۶ میں مومنین کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے امور آپس کے مشورے سے طے کرتے ہیں۔ (کتاب نظام الحکم فی الشریعت والتاریخ ص ۲۷)

جنگِ احد کے موقع پر جب پیغمبر اسلامؐ کو خبر ملی کہ کفارِ قریش اچانک حملہ کرنے والے ہیں تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ لیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آیا ہم شہر مدینہ میں رہ کر دفاع

کریں یا شہر سے باہر نکل کران کا مقابلہ کریں ۔یہاں تک کہ آپؐ نے عبداللہ بن ابی سلول (منافق) کو بھی ملا کر اس سے مشورہ لیا۔

جنگ بدر کے موقع پر بدر سے نزدیک ایک چشمہ تھا۔پیغمبرؐ وہاں پہنچے تا کہ وہاں سے اپنا دفاع کریں تو حباب بن منذر نے پیغمبرؐ سے پوچھا کہ آیا یہاں آپ کا آنا وحی اور خدا کے حکم کے تحت ہے۔اگر ایسا ہے تو ہمیں اس کی مخالفت کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور اگر یہ آپ کی ذاتی رائے ہے یا جنگی ٹیکنیک ہے تو ہمیں مشورہ دینے کا حق ہے۔پیغمبرؐ نے فرمایا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہیے بلکہ آگے بڑھ کر دفاع کرنا چاہیے چنانچہ اس مقام کو چھوڑ کر وہ آگے چلے گئے۔

نہج البلاغہ کلام/۶۸ میں امیرالمومنین حضرت علی فرماتے ہیں کہ جب میں نے مصر میں ہاشم بن عتبہ کو والی بنانے کیلئے کہا تو تم لوگوں نے اصرار کیا کہ محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی بنا کر بھیجیں۔اگر میری بات مانی جاتی تو وہ قتل نہ ہوتے اور یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔

نہج البلاغہ کلام/۲۰۵ کے مطابق جب طلحہ وزبیر نے حضرت علی پر اعتراض کیا کہ آپؑ نے امورِ مملکت میں ہم سے مشورہ نہیں لیا تو حضرتؑ نے فرمایا کہ مجھے ابھی تک کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا جب ضرورت پڑی تو تم لوگوں نے اور دوسرے مسلمان بھائیوں سے مشورہ لونگا۔

چنانچہ مشورہ ایک شرعی حکم ہے البتہ کس سے مشورہ لینا چاہیے اور کس امر میں مشورہ لینا ہے اس سلسلے میں قرآن میں احکام موجود ہیں کہ مشورہ ان ہی لوگوں سے لینا چاہیے جن کا متعلقہ امور میں کوئی کردار ہو۔چنانچہ سورۂ احزاب کی آیت ۳۶ اور سورۂ انعام کی آیت ۱۲۴ میں بیان کیا گیا ہے کہ امت کو ان امور میں مشورہ دینے کا کوئی حق نہیں ہے جو امور ان سے مربوط نہیں ہیں۔

❁❁❁

کوفہ

امام حسین ؑ کے مقدس قیام کے سلسلے میں جس تیسری منزل کا نام آتا ہے وہ کوفہ ہے جسے آپؑ نے اپنے قیام و نہضت کے لئے انتخاب فرمایا۔بلدِ امین مکہ مکرمہ جیسے شہر کو ایک حساس موقع پر چھوڑ آپؑ کا کوفہ کا رخ کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جو قارئین کے ذہنوں میں بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے کیونکہ عوام کوفہ اور اہل کوفہ کے بارے میں عام طور پر اچھے تاثرات نہیں رکھتے۔

آپؑ کے مکہ چھوڑنے کے بارے میں ہم ایک تفصیلی اور سیر حاصل بحث پہلے کر چکے ہیں۔یہاں ہم کوفہ کے بارے عام تاثرات' وہاں کے لوگوں کے معائب ومحاسن' کوفہ کی خصوصیات' اس شہر کی سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر ایک مفصل بحث کریں گے تا کہ اس کی روشنی میں امامؑ کے اپنے قیام و نہضت کے لئے اس شہر کو انتخاب کرنے کے اسباب و عوامل کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

کوفہ کی وجہ تسمیہ

جغرافیائی معاجم کے مطابق اس کو"کوفہ" اس لئے کہتے ہیں کہ اس علاقے کے درمیان ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جسے "کوفان" کہتے ہیں۔اسی مناسبت سے اس شہر کا نام "کوفہ" پڑ گیا۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سرزمین میں ایک سنگریزہ پایا جاتا ہے جسے اہلِ عرب "کوفہ" کہتے ہیں لہٰذا اس سنگریزے کے نام پر اس کا نام "کوفہ" ہو گیا۔

کوفہ عوام کی سطحی نظر میں

عموماً لوگ اہلِ کوفہ کے بے وفا اور وعدہ خلاف کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوفہ بے وفا' وعدہ خلافی اور عہد شکنی کا شکوہ کرنا ہو تو ضرب المثل کے طور پر اسے "کوفی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

کوفہ کے بارے میں بدبین اور منفی تاثرات رکھنے والے لوگ اپنے جواز میں نہج البلاغہ سے حضرت امیرالمومنینؑ کے بعض خطبات اور مکتوبات کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ (خطبہ ۲۵، ۷۰، ۱۰۵، مکتوب ۱)

اس کے علاوہ یہ لوگ عقیلۂ قریش جناب زینب کبریٰ اور جناب فاطمہ صغریٰ = کے ان خطبات کے ابتدائی کلمات کا بھی حوالہ دیتے ہیں جو انہوں نے کوفہ کے بازار میں ارشاد فرمائے۔ حضرت علیؑ کے دورِ خلافت کے آخری ایام میں آپؑ کی پریشانیوں اور امام حسن مجتبیٰؑ کو پیش آنے والی صورتِ حال کو بھی کوفہ کی مذمت میں اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ظلم و جور اور فتنہ و فساد کی تمام جڑیں یہیں سے پھوٹیں۔

لیکن حقائق کو سمجھنے کیلئے کسی مسئلہ کو سطحی نقطۂ نظر سے دیکھنا نہ تو کافی ہے اور نہ صحیح بلکہ اس کیلئے تحقیقی نظر سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

کوفہ تحقیقی نقطۂ نظر سے

کوفہ ایک ظرفِ اقلیم ہے، منبع علماء ہے، خلفاء کا پسندیدہ اور اصحاب کا مرکز ہجرت ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی جائے پیدائش ہے۔ یہ فقہاء، قراء، ادباء، اطباء، حکماء، زہاد اور نجیب لوگوں کا ٹھکانہ، جائے درس و تدریس، بحث و مباحثہ اور زہد و عبادت ہے۔

آب و ہوا کے لحاظ سے یہ صحابیِ جلیل القدر حضرت سلمان فارسی اور حذیفہ یمانی کا موردِ پسند اور منتخب کردہ شہر ہے۔ نہر فرات یہاں سے گزرتی ہے جس کا پانی خوشگوار ہے۔ قدیم شہر بابل جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں آیا ہے اسی کوفہ کے بارے میں ہے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ کو ان کوفہ والوں کی ہی وجہ سے تین جنگوں میں فتح نصیب ہوئی۔

کوفہ کی فضیلت

کوفہ کی فضیلت میں بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں۔

روایت میں ہے کہ ''کوفہ طورِ سینا کی تاویل ہے''۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

''کوفہ میں ایک درہم صدقہ دینے کا ثواب دوسری جگہوں پر سو درہم صدقہ دینے کے برابر ہے''۔

''مکہ خدا کا حرم ہے، مدینہ پیغمبر اسلامؐ کا اور کوفہ امیرالمومنین امام علیؑ کا حرم ہے''۔

امام حسنؑ فرماتے ہیں:

''کوفہ میں اتنی جگہ کہ جہاں ایک آدمی بیٹھ سکے مجھے مدینہ کے پورے گھر کے مقابلے میں زیادہ پسند ہے''۔

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا: ''میں نے اپنی ساری املاک فروخت کر دی ہے، اب آپؑ مجھے مشورہ دیں کہ کیا میں مکہ میں سکونت اختیار کروں؟''

آپؑ نے فرمایا: نہیں، کیونکہ اہلِ مکہ کھلم کھلا کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس نے پوچھا: کیا مدینہ میں رہائش اختیار کروں؟

آپؑ نے جواب دیا: نہیں، یہ اس سے بھی بدتر ہے۔

اس نے پوچھا: پھر میں کہاں سکونت اختیار کروں؟

آپؑ نے فرمایا: عراق جاؤ کہ وہاں سے کوفہ کی برکت بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی قبور کے علاوہ تین سو ستر انبیاء اور چھ سو اوصیاء کی قبور ہیں۔ اس کے علاوہ اسی کوفہ میں امیرالمومنین علیؑ کی قبر مطہر ہے۔

امام جعفر صادقؑ ہی سے مروی ہے:

''کوئی نبی اور کوئی مقرب فرشتہ ایسا نہیں کہ جو کوفہ میں داخل ہوا ہو اور اس نے مسجدِ کوفہ میں نماز نہ پڑھی ہو''

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک گروہ سے پوچھا: تم لوگ کہاں سے رہنے والے ہو؟

انہوں نے جواب دیا: ہم کوفہ کے رہنے والے ہیں۔

آپؑ نے فرمایا: دوسرے شہروں کے رہنے والوں کے مقابلے میں اہلِ کوفہ ہم سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں' جب دوسرے لوگوں نے ہم سے دشمنی کی تو تم اہلِ کوفہ نے ہماری پیروی کی' جب دوسرے لوگوں نے ہماری مخالفت کی تو تم اہلِ کوفہ نے ہمارے حقانیت کی تصدیق کی۔

اس کے بعد آپؑ نے ان کے حق میں دعا فرمائی:

''خداوندِ عالم تمہیں ہماری ہی جیسی حیات عطا فرمائے اور ہماری ہی جیسی موت نصیب فرمائے''۔

حضرت علی علیہ السلام بصرہ جاتے وقت جب میقات پر پہنچے تو اہلِ کوفہ نے ان کا استقبال کیا اور کہا: تمام حمد اس خدا کے لئے جس نے آپؑ کی قربت سے ہمیں نوازا اور آپ کی نصرت کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائی۔

حضرتؑ نے جواب میں فرمایا:

''اے اہلِ کوفہ! تم تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ محترم ہو' سب سے زیادہ راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر قائم رہنے والے ہو' دوسروں کے مقابلے میں اسلام تمہارے حصے میں زیادہ نصیب ہوا ہے' اہلِ عرب میں سب سے زیادہ جود و کرم رکھتے ہو' پیغمبر اسلامؐ اور ان کی آل سے زیادہ محبت رکھنے والے ہو' ہم تمہارے وعدے پر بھروسہ کر کے آئے ہیں''۔

زین العابدین حضرت امام سید سجاد علیہ السلام نے اہلِ کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اہلِ کوفہ! مرحبا! تمہاری نسبت ہمارے ساتھ ایسی ہی ہے جیسی نسبت جسم کو لباس کے ساتھ ہے''۔

امام سجاد علیہ السلام ہی سے منقول ہے:

''حضرت جبرئیلؑ نے پیغمبر اسلامؐ سے فرمایا کہ علیؑ ایک ایسے شہر میں شہید ہوں گے جہاں وہ ہجرت کریں گے' وہی شہر ان کا اور ان کی اولاد کا مرکز ہوگا' وہاں ان کی آزمائشیں بھی ہوں گی اور ان پر مصیبتیں بھی نازل ہوں گی''۔

حضرت سلمان فارسی نے اہلِ کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے اہلِ کوفہ! تم قبۂ اسلام ہو''

کوفہ اور دمشق کے درمیان دو سو پچاس فرسخ کا فاصلہ ہے خداوندِ عالم نے تمام زمینوں میں سے مکہ کو منتخب فرمایا اور اسے کعبہ سے زینت دی' مدینہ کو پیغمبر اسلامؐ سے مزین کیا اور کوفہ کو امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے ذریعے زینت بخشی''۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

''کوفہ کی مٹی ہم سے ہے' ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ خدا وندا! تو اسے دور رکھ جو کوفہ سے دوری اختیار کرے اور اس سے دشمنی رکھ جو کوفہ سے دشمنی کرے''[مستدرک سفینۃ البحار ج ۹]

لہٰذا کسی چیز کی تعریف و تنقیص' عیب و حسن اور اچھائی و برائی کے بارے میں صرف ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھنا جاہلی صفت ہے جو ایک آنکھ رکھتا ہے اور اسی سے دیکھا ہے۔ تصور کے صرف ایک رخ کو دیکھنے والا کبھی حقائق سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ دنیا کی بہت سی چیزیں بیک وقت عیب و حسن' اچھائی اور برائی' ضرر و نفع دونوں صفتوں کی حامل ہوتی ہیں اس لئے باریک بینی اور دقیق نظروں سے ان کا جائزہ لینا چاہیے اور ان کی برائیوں سے بچنا اور خوبیوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اسی لئے معصومؑ کا فرمان ہے:

''عاقل انسان وہ ہے جو دو برائیوں کے درمیان کمتر برائی اور بدتر برائی کے درمیان فرق کر سکے اور دو خوبیوں کے درمیان خوب اور خوب تر میں تمیز کر سکے''۔

چنانچہ یہ شہر کوفہ بھی جہاں اپنے دامن میں ظلم و جور کی داستانیں سمیٹے ہوئے ہے وہیں

اس کا دامن جانثاری اور فدا کاری کی داستانوں سے بھی مالامال ہے۔

لہٰذا تصویر کے دونوں رخ سامنے رکھتے ہوئے کوفہ کی خوبیوں اور برائیوں کے اسباب وعلل کو تلاش کرنا چاہیے۔اس لئے ضروری ہے کہ کوفہ کی معاشرتی ترکیب اور اس کی سیاسی تاریخ کے پس منظر کو سامنے رکھا جائے تا کہ ہم کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں۔

کوفہ کی سیاسی تاریخ

۱۵ ہجری میں خلیفۂ دوم حضرت عمر ابن خطاب نے قادسیہ کو فتح کرنے کے لئے خود لشکر کی قیادت کرنے کا ارادہ کیا۔لیکن حضرت علی علیہ السلام نے ان کو جانے سے روکا۔چنانچہ خلیفہ نے صلاح مشورے کے بعد سعد ابن ابی وقاص کو لشکر کا سپہ سالار بنا کر قادسیہ روانہ کیا جسے باب عراق کہا جاتا ہے۔سعد بن ابی وقاص کے لشکر میں تقریباً سات یا آٹھ ہزار فوجی تھے جن میں ستر اصحاب بدر اور ایک سو بیس فتح مکہ میں شرکت کرنے والے مجاہدین تھے۔اس پورے لشکر میں ایک ہزار اصحاب پیغمبر بھی شامل تھے۔اُدھر ایرانی لشکر کی قیادت رستم کر رہا تھا جس کے لشکر میں تیس ہزار سے زائد فوجی تھے۔قادسیہ کے مقام پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا' مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی' ایران کے بہت سے فوجی مارے گئے' کچھ گرفتار ہوئے اور باقی لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی۔

قادسیہ کی فتح کی خبر جب حضرت عمر کو ملی تو انہوں نے سعد بن ابی وقاص کو وہیں قیام کرنے اور قادسیہ ہی کو مستقر بنانے کی ہدایت کی لیکن وہاں کی ناسازگار آب وہوا کی وجہ سے اسلامی لشکر کے فوجیوں کی صحت خراب ہونے لگی تو حضرت عمر نے کسی موافق اور سازگار آب وہوا کے حامل ایسے خوشگوار اور شاداب علاقے کو تلاش کرنے کا حکم دیا جس کے درمیان کوئی دریا حائل نہ ہو۔چنانچہ حضرت سلمان فارسی اور حذیفہ یمانی نے سرزمینِ کوفہ کو تلاش کیا۔

محرم ۱۷ ہجری کو لشکرِ اسلام جس کی تعداد اب چالیس ہزار ہو چکی تھی

یہاں پہنچا اور رہائش اختیار کی۔انہوں نے یہاں دارالامارہ تعمیر کیا اور ایک مسجد بنائی۔رفتہ رفتہ بصرہ اور کوفہ اسلام کے بڑے فوجی مراکز میں شمار ہونے لگے اور کوفہ اسلام کے فوجی کیمپ کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔اسی وجہ سے اس کو کوفۃ الجند بھی کہتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ کوفہ اسلام کے بڑے مراکز میں شمار ہوتا تھا۔کوفہ کا گورنر ہی آذربائیجان' ہمدان' اہواز' اصفہان' موصل اور قرقیسا کو کنٹرول کرتا تھا۔

۱۷ ہجری کہ جب یہ سرزمین اسلامی جغرافیہ کے حدود میں شامل ہوئی' سے لے کر ۶۱ ہجری تک ہم ان والیان کی ترتیب وار ایک فہرست پیش کریں گے جو کوفہ کے حکمران رہے۔ان میں سے ان گورنروں کا مختصر حال بھی بیان کریں گے جن کا سیاسی' اقتصادی اور اجتماعی حیثیت سے اس سرزمین سے متعلق کوئی نمایاں کردار رہا ہے۔کوفہ کے عوام کے مقدرات پر ان گورنروں کا جو اثر مرتب ہوا اس پر بھی کسی حد تک بحث کریں گے۔ان میں وہ دو گورنر بھی ہیں جو صرف چند دنوں یا چند مہینوں کے لئے عارضی طور پر اس منصب پر رہے۔

اسلامی قلمرو میں شامل ہونے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے سنبھالنے تک کوفہ ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔حضرت علیؑ اور حضرت امام حسنؑ کے دورِ خلافت میں کوفہ اسلامی حکومت کا دارالخلافہ رہا' یہ دور کوفہ کا وہ تابناک اور درخشان دور ہے جس میں کوفہ کے لوگ اہل بیتِ پیغمبرؐ اور آئمہ اطہارؑ کے عاشق وشیدا بنے اور بعد کے دور میں کوفہ والیان اور دوستدارانِ اہل بیت کی توجہ کا مرکز رہا۔

امیر معاویہ کے دورِ خلافت میں شام دارالخلافہ اور کوفہ پھر صوبہ یا دارالامارہ بنا۔

۱۷ ہجری سے لے کر ۶۱ ہجری تک کوفہ کے گورنروں کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

(۱) سعد بن ابی وقاص: ۱۷ ہجری میں کوفہ کے گورنر بنے' معاویہ کے دورِ خلافت میں انہوں نے اپنے قصرِ عقیق میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔اہلِ کوفہ کی شکایت پر کہ

یہ صحیح نماز نہیں پڑھاتے حضرت عمر نے ان کو معزول کر کے عمار یاسر کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

(۲) عمار یاسر: ۲۷ رہجری میں ۹۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور رقہ میں دفن ہوئے۔

اہلِ کوفہ نے جب ان کی شکایت کی کہ وہ ضعیف وکمزور ہیں تو حضرت عمر نے ان کو ہٹا کر جبیر ابن مطعم کو کوفہ کا گورنر بنایا۔

(۳) جبیر ابن مطعم: مغیرہ ابن شعبہ نے خلیفہ سے اس کی شکایت کی اور خود اپنی گورنری کی خواہش کی تو حضرت عمر نے اس کی جگہ مغیرہ ابن شعبہ کو کوفہ کا گورنر بنایا۔

(۴) مغیرہ ابن شعبہ:

(۵) سعد ابن ابی وقاص: ۲۴ رہجری میں مغیرہ بن شعبہ کو معزول کر کے دوبارہ سعد ابن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر بنایا گیا۔

(۶) ابوموسیٰ اشعری: ۴۴ رہجری میں کوفہ میں وفات پائی۔

(۷) ولید بن عقبہ بن ابی معط: ۲۵، ۲۶ رہجری میں گورنر بنا، ۶۱ رہجری میں وفات پائی۔

(۸) سعید بن العاص بن سعید بن العاص: ۳۴ رہجری میں اہلِ کوفہ نے اس کو نکال دیا۔

(۹) قرظہ بن کعب الانصاری: ۵۳ رہجری میں کوفہ کے گورنر بنے۔

نوٹ:

۳۵ رہجری میں حضرت علیؑ خلیفہ بنے اور کوفہ دارالخلافہ بنا۔

(۱۰) عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ انصاری بدری: صفین جاتے ہوئے حضرت علیؑ نے انہیں والی بنایا۔

(۱۱) مغیرہ بن شعبہ: ۴۱ رہجری میں دوبارہ کوفہ کا گورنر بنا اور ۴۹ رہجری تک گورنر رہا۔

(۱۲) زیاد بن ابیہ: ۴۹ رہجری میں کوفہ کا گورنر بنا اور ۵۳ رہجری میں وفات پائی۔

(۱۳) عبداللہ بن خالد بن اسیر بن ابی العیص مخزومی۔

(۱۴) ضحاک بن قیس بن خالد فہری قریشی: امیر معاویہ کی پولیس کا سربراہ تھا، ۵۳ رہجری میں کوفہ کا گورنر بنا ''واھہ'' کے مقام پر قتل ہوا۔

(۱۵) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عثمان بن ربیعہ ثقفی بن ام حکم (معاویہ کی بہن): ۵۶ رہجری میں کوفہ کا گورنر بنا، ۵۹ رہجری میں معزول ہوا اور ۶۶ رہجری میں وفات پائی۔

(۱۶) نعمان بن بشیر بن سعد بن طالبہ انصاری خزرجی: ۵۹ رہجری میں کوفہ کا گورنر بنا اور ۶۵ رہجری میں قتل ہوا۔

(۱۷) عبیداللہ بن زیاد بن ابیہ: ۶۱ رہجری میں کوفہ کا گورنر بنا۔

سعد بن ابی وقاص

سعد بن ابی وقاص بن مالک بن احیب (یا وحیب) بن عبد مناف قریشی تھے۔ سترہ سال کی عمر میں اسلام لائے۔ پیغمبر اسلامؐ سے پہلے انہوں نے ہجرت کی۔ بعض اہلِ سنت کے نزدیک عشرۂ مبشرہ کا جو تصور ہے اس میں شامل ہیں۔

حضرت عمر کے دورِ خلافت میں اہلِ فارس سے جنگ کیلئے جانے والے لشکر کی قیادت کا شرف ان کو حاصل ہوا اور قادسیہ کی ایرانی امپیریلزم (Imperialism) کی نخوت وتکبر کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ لہٰذا انہیں فاتحِ قادسیہ کا لقب ملا۔ حضرت عمر کی وفات کے موقع پر انہیں بھی چھ رکنی امیدوارانِ خلیفہ میں قرار دیا گیا۔ لیکن یہ اپنی امیدواری اور رائے حق سے عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں دستبردار ہو گئے کیونکہ یہ دونوں آپس میں رشتہ دار اور ایک ہی قبیلہ (بنی زہرہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عمر سے لے کر حضرت عثمان کے دورِ خلافت تک کئی بار کوفہ کے گورنر بنے اور معزول ہوئے۔ چنانچہ ۲۴ رہجری میں حضرت عثمان نے مغیرہ بن شعبہ کو معزول

کر کے سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر بنایا' ۲۵ ہجری میں سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے ولید بن عقبہ کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ ۳۰ ہجری ولید بن عقبہ کو معزول کر کے پھر سعد ابن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر بنایا۔

اپنے دورِ خلافت میں معاویہ انہیں اپنے ساتھ حج پر لے گیا۔ اعمالِ حج کے بعد دارالندوہ میں معاویہ نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ان پر سب وشتم کا سلسلہ کیا تو سعد بن ابی وقاص نے کہا:

''کیا ہمیں تم نے اس لئے بلایا ہے کہ ہم علیؑ پر سب وشتم سنیں؟ ہم علی بن ابی طالبؑ کی شان میں کسی قسم کی سب وشتم سننے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ خدا اور اس کے رسولؐ نے انہیں ایسے فضائل اور شرف سے نوازا ہے کہ ان میں سے ایک بھی ہمیں نصیب ہو جائے تو وہ پوری دنیا و ما فیہا کے برابر ہے''۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد سعد ابن ابی وقاص نے حضرت علیؑ کی بیعت کرنے سے انکار کیا تو حضرتؑ نے ان سے فرمایا:

''کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تم پر واجب نہیں؟ ہم اگر غلطی پر ہیں تو ہمیں غلطی سے روکو اور اگر ہم حق پر ہیں تو ہمارا ساتھ دو۔ اس پر سعد بن ابی وقاص نے علیؑ سے سے کہا: آپ مجھے کوئی ایسی تلوار دے دیں جو مومن اور فاسق میں تمیز کر سکے۔

حضرت علیؑ نے جواب دیا: عثمان اگر غلطی پر تھے تو وہ اپنی غلطی کی وجہ سے قتل ہوئے۔ اس لئے ان کے حامی غلطی پر ہیں اور اگر وہ صحیح اور حق پر تھے تو تم نے ان کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟''

۵۱ ہجری میں معاویہ نے سعد بن ابی وقاص کو زہر دے کر قتل کیا۔

عمار یاسر

آپ کا نام عمار بن یاسر بن عامر بن مالک بن کنانہ بن قیس بن الحصین بن اودیم بن

ثعلبہ بن عوف بن حارثہ بن عامر بن سام بن عنس اور کنیت ابوالیقظان ہے۔ آپ کی والد یاسر' یمن سے مکہ آئے اور ابو حذیفہ بن مغیرہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنی کنیز سمیہ کو ان کے عقد میں دیا جن کے بطن سے عمار پیدا ہوئے۔

ابو حذیفہ نے عمار کو آزاد کر دیا۔ عمار ان کے والد اور والدہ تینوں مسلمان ہو گئے جس کی پاداش میں انہیں سخت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ جب انہیں بہت زیادہ زدوکوب کیا گیا اور اذیتیں دی گئیں تو مجبور ہو کر زبانی طور پر انہوں نے پیغمبر اسلامؐ سے بے زاری کا اظہار کیا۔ اس پر خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان﴾ ''جو ایمان لا کر اللہ کا منکر ہو سوا اس کے کہ جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو'' (نحل/۱۰۶)

ان کی والدہ کو ابو جہل نے قتل کیا چنانچہ اسلام کی راہ میں وہ پہلی شہید خاتون ہیں۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عمار یاسر نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ مدینہ میں مہاجرینِ اولین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ مدینہ میں پیغمبر اسلامؐ نے جب مسلمانوں کے درمیان آپس میں رشتۂ اخوت کا قائم کیا تو انہوں نے عمار اور حذیفہ کے درمیان اخوت قرار دی اور عمار اور حذیفہ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ اسلام لانے والوں میں ان کا شمار ساتویں نمبر پر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے جس نے مسجد تعمیر کی وہ عمار تھے۔

پیغمبر اسلامؐ اور امیر المومنین حضرت علیؑ دونوں نے عمار کو طیب ابن طیب کا لقب دیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

''ایمان عمار کی ہڈیوں کی جڑوں تک پیوست ہو چکا ہے''۔

''عمار حق کے اور حق عمار کے ساتھ ہے''۔

''جس نے عمار سے دشمنی کی اس نے خدا سے دشمنی کی' جس نے عمار کو راض کیا اس

نے خدا کو ناراض کیا"۔

پیغمبر اسلامؐ نے ایسی حالت میں دنیا سے رحلت فرمائی کہ وہ عمار اور ابنِ مسعود سے خوش تھے۔

عمار یاسر جنگِ بدر سے لے کر تمام جنگوں میں شریک رہے۔ جنگِ یمامہ میں ان کا ایک کان ضائع ہوا۔ ناکثین اور قاسطین کے خلاف جنگ میں وہ حضرت علیؑ کے ساتھ ساتھ رہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے اس قول کے مطابق کہ "عمار حق کے اور حق عمار کے ساتھ ہے"۔ صفین کی جنگ میں وہ حق کی علامت کے طور پر پہچانے جاتے تھے، لوگ عمار کے گرد تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حق اسی طرف ہے جس طرف عمار ہیں۔ جب عمار شہید ہوئے تو دو شامی یہ دعویٰ کرتے ہوئے آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ عمار کو میں نے قتل کیا ہے۔ اس پر عمر بن عاص نے کہا:

"حیف ہے تم پر کہ تم جہنمی ہونے پر ایک دوسرے سے سبقت کرنے پر فخر کر رہے ہو"۔

حضرت عثمان نے اپنے دورِ خلافت میں جب حضرت ابوذر غفاری کو جلاوطن کیا تو ان کی جلاوطنی اور عالمِ غربت میں ان کی موت پر عمار یاسر نے سخت احتجاج کیا۔ اس کے علاوہ ولید ابن عقبہ اور حضرت عثمان کے خلافِ اسلام اعمال اور اقدامات پر انہوں نے جب احتجاج کیا تو انہیں زدوکوب کیا گیا یہاں تک ان کی شکم میں زخم ہو گیا۔

اہلِ کوفہ نے جب کوفہ کے گورنر سعد ابن ابی وقاص کی شکایت کی تو حضرت عمر نے سعد بن ابی وقاص کی جگہ عمار یاسر کو کوفہ کا گورنر اور عبداللہ بن مسعود کو وزیر بنا کر بھیجا اور اہلِ کوفہ کے نام خط لکھا کہ یہ دونوں نجبائے اصحابِ محمدؐ ہیں، ان کی اقتدا کی جائے۔

پیغمبر اسلامؐ نے عمار سے فرمایا: "تمہیں ایک باغی قوم قتل کرے گی"

چنانچہ ۳۷ر ہجری میں صفین میں معاویہ کے خلاف جنگ میں ۹۳ سال کی عمر میں یہ صحابیِ رسولؐ معاویہ کے لشکر کے ہاتھوں مقام رقہ میں شہید ہوئے۔ آج بھی ان کا مزار موالیان اور دوستدارانِ اہلِ بیتؑ کیلئے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ (از کتاب تہذیب التہذیب)

جبیر ابن مسلم

اس کا نام جبیر ابن مسلم تھا اور کنیت ابو محمد یا ابو عدی تھی۔ یہ شخص حضرت ابو بکر کا خاص شاگردوں میں سے تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کے نکاح میں آنے سے قبل حضرت عائشہ کا رشتہ ان سے طے ہوا تھا۔ دورِ جاہلیت میں بنی امیہ کے حلیفوں میں سے تھا اور اس زمانہ میں بہت بڑا نسب شناس مانا جاتا تھا اور اپنی قوم میں محترم شخص سمجھا جاتا تھا۔ حضرت امیر حمزہ کو اسی شخص کے حبشی غلام نے شہید کیا تھا۔ اس نے اپنے اس حبشی غلام سے وعدہ کیا تھا کہ تو اگر محمدؐ کو قتل کر دے تو میں تجھے آزاد کر دوں گا، اگر علیؑ کو قتل کر دے تو بھی تو آزاد ہے اور اگر حضرت حمزہ کو قتل کر دے تب بھی میں تجھے آزاد کر دوں گا۔ جبیر ابن مطعم جنگِ بدر میں اسیر ہوا، یہ طلقاء میں سے تھا اور فتح مکہ کے موقع پر آزاد ہوا۔

یہ مغیرہ بن شعبہ سے پہلے کوفہ کا گورنر رہا اور ۵۸ر یا ۵۹ر ہجری میں اس نے وفات پائی۔

ابوموسیٰ اشعری

اس کا نام ابوموسیٰ بن عبداللہ بن قیس بن سلیم بن ہزار بن حرب بن عامر بن عنبر بن بکر بن عامر بن عذر بن وائل بن ناجیہ بن جماہیر بن اشعر تھا، کنیت ابوموسیٰ اور تخلص اشعری تھا۔

پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت سے پہلے مکہ آیا، اسلام لایا۔ اس کے بعد حبش ہجرت کی۔ فتح مکہ یا فتح خیبر کے بعد مدینہ آیا۔ پیغمبر اسلامؐ نے زبیر یا عدن میں اس کو والی بنا کر بھیجا۔ حضرت عمر نے اس کو پہلے بصرہ اور پھر کوفہ کا گورنر بنایا، جس پر حضرت عثمان بھی رضامند ہو گئے۔

حضرت علیؑ کی خلافت کے ابتدائی دور میں یہ کوفہ کا گورنر رہا۔ جنگِ جمل کے موقع پر یہ لوگوں کو حضرت علیؑ کے لشکر میں شریک ہونے سے روکتا تھا اور جنگ میں شریک ہونے کو حرام قرار دیتا تھا۔ بعد میں عمار یاسر، مالک اشتر اور امام حسنؑ نے اس کو ہٹایا۔

جنگِ صفین میں اس نے شرکت نہیں کی لیکن تحکیم کے موقع پر لوگوں نے اس

کو اپنا نمائندہ بنانے پر حضرت علیؑ کو مجبور کیا۔ تحکیم کے موقع پر حضرت علیؑ کا نمائندہ بن کر ان سے اپنی دیرینہ دشمنی کی بناء پر اس نے عمر بن عاص سے کہا کہ نہ علیؑ کو خلیفہ بننے دیا جائے اور نہ معاویہ کو بلکہ کسی اور کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ عمر بن عاص اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور خوش ہوگیا کہ خود علیؑ کا نمائندہ ہی علیؑ کو معزول کر رہا ہے۔ اس طرح اس احمق نمائندے نے علیؑ کو خلافت سے معزول کیا۔

۴۲ یا ۴۴ یا ۵۰ ہجری میں ابوموسیٰ اشعری نے مکہ یا کوفہ میں وفات پائی۔ (تہذیب ج ۵، ص ۳۱۷)

ولید بن عقبہ بن ابی معط

۲۶ھ میں حضرت عثمان نے کوفہ سے سعد بن ابی وقاص کو ہٹا کر اپنے مادری بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معط کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ یہ ۲۶ھ سے ۲۹ھ تک کوفہ کا گورنر رہا۔

ولید بن عقبہ نے کوفہ پہنچنے کے بعد عبداللہ بن مسعود سے بیت المال میں سے کچھ رقم قرض کے نام سے لی۔ مقررہ مدت کے بعد جب عبداللہ بن مسعود نے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس نے عبداللہ کے اس مطالبے کو اپنی شان میں جسارت اور گستاخی سمجھا اور حضرت عثمان سے اس کی شکایت کی۔

اس کا باپ عقبہ بن ابی معط مکہ کے ان لوگوں میں سے تھا جو پیغمبرؐ کو اذیت پہنچایا کرتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ فرمایا کرتے تھے کہ خداوند عالم نے مجھے دو بدترین اور شریر ترین ہمسایوں یعنی ابولہب اور عقبہ بن ابی معط کے درمیان امتحان میں ڈالا ہے۔ عقبہ بن ابی معط، ابولہب اور حکم بن عاص وہ افراد تھے جو جانوروں کا فضلہ اور غلاظت اکٹھا کر کے پیغمبر اسلامؐ کے دروازے پر پھینکا کرتے تھے۔ سورۂ فرقان کی آیات ۲۸ اور ۲۹ انہیں تینوں کی مذمت میں نازل ہوئیں۔

ولید بن عقبہ نے اپنی گورنری کے دور میں ایک مرتبہ اپنے مغنی، مغنیہ اور ساتھیوں کے ساتھ شراب پی کر پوری رات نشہ میں گزاری اور جب صبح کی اذان ہوئی تو یہ مسجد میں گیا اور محراب

میں آ کر نشہ کے عالم میں نمازِ فجر دو رکعت کی بجائے چار رکعت پڑھائی۔ لوگوں نے مسجد میں اسے جب یہ کہتے ہوئے سنا:

[اشرب و اسقني] تو اس پر پچھلی صف والوں نے کہا:

''خدا تجھے خیر دیکھنا نصیب نہ کرے۔ ہماری شکایت تجھ سے نہیں بلکہ اس سے ہے جس نے تجھ جیسے شخص کو ہمارا والی اور امیر بنا کر بھیجا ہے''۔

ایک دن وہ شراب پی کر اتنا بدمست ہوگیا کہ اپنے صحن میں قے کی، لوگ اسے اٹھاتے تھے تو وہ نہیں پاتا تھا۔ لوگوں نے اس کے دو مغنیاؤں کے سامنے اس کے ہاتھ سے سرکاری مہر والی انگوٹھی اتاری اور اسے اتار کر مدینہ روانہ ہوگئے، وہاں حضرت عثمان کے سامنے اس کی اس غیر شرعی حرکت اور شراب پینے کی گواہی دی۔ خلیفہ نے اس کو بلا کر اس پر حد جاری کی اور اس کی جگہ سعید بن عاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ (فتنۃ الکبریٰ علی و بنوہا ز طہ حسین ص ۱۹۸، مروج الذہب ج ۲، ص ۳۴۴)

سعید ابن عاص

اس کا نام سعید ابن عاص اور کنیت ابوعثمان یا عبدالرحمٰن ہے۔ اس کا باپ عاص بن سعید جنگِ بدر میں حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے وقت اس کی عمر نو سال تھی۔ یہ حضرت عثمان کا قریبی رشتہ دار تھا اور انہیں کے ساتھ رہتا تھا۔ حضرت عثمان نے جب ولید بن عقبہ کو کوفہ کی گورنری سے معزول کیا تو سعید بن عاص کو اس کی جگہ گورنر مقرر کیا۔ اس وقت اس کی عمر بیس یا پچیس سال تھی۔ جب یہ کوفہ پہنچا تو اس نے اس منبر پر بیٹھنے سے انکار کیا جس پر ولید بن عقبہ بیٹھتا تھا اور کہا کہ یہ جگہ نجس ہو چکی ہے، جب تک اس کو پاک نہیں کیا جائے گا میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔ منبر پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے خطبہ میں اہلِ کوفہ کی مذمت کی اور انہیں اہلِ شقاق اور اہلِ نفاق کہہ کر مخاطب کیا۔

عبداللہ بن مسعود جو حضرت علیؑ کے صحابی تھے انہوں نے جب اس کی خورد برد پر

اعتراض کیا تو اس نے کہا کہ ’’عراق قریش کے جوانوں کے باغات میں سے ہے‘ اس کی خوردبرد پر ہم کو روکنے والے تم کون ہوتے ہو؟‘‘ اہلِ کوفہ نے اس کی زیادتیوں اور بداعمالیوں کی شکایت جب حضرت عثمان سے کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ’’کیا تمہاری شکایتوں پر میں ہر گورنر کو ہٹاتا رہوں؟‘‘ ادھر سعید بن عاص نے بھی رشوت میں مہاجرین وانصارِ مدینہ کو کچھ تحائف پیش کئے اور کوفہ واپس آ کر کوفہ والوں کو پہلے سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔

ایک مرتبہ ماہِ رمضان کے آخر میں اس نے لوگوں سے چاند کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں پوچھا تو ہاشم بن عتبہ نے گواہی دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ ہاشم بن عتبہ سعد بن ابی وقاص کے بھتیجے اور حضرت علیؑ کے صحابی تھے ان کی ایک آنکھ کسی غزوہ میں شہید ہو چکی تھی۔ چاند دیکھنے کی گواہی دینے پر سعید بن عاص نے ان سے مضحکہ خیز انداز میں کہا کہ ’’کیا تم نے اپنی اس نابینا آنکھ سے چاند دیکھا ہے؟‘‘ ہاشم بن عتبہ نے جواب دیا کہ ’’کیا تم میری اس آنکھ کا مذاق اڑاتے ہو جو میں نے خدا کی راہ میں دی ہے؟‘‘ چونکہ انہوں نے خود اپنی آنکھ سے چاند دیکھا تھا اس لئے انہوں نے گھر آ کر اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ روزہ افطار کیا۔ اس پر سعید بن عاص نے ان کو زدوکوب کیا اور ان کے گھر کو جلا دیا۔ اس پر ان کے بہن اور ان کا بھائی نافع بن عتبہ مالکِ اشتر کی قیادت میں کوفہ سے مدینہ گئے اور خلیفہ سے شکایت کی کہ اس کو گورنری سے ہٹایا جائے۔ سعید خود بھی مدینہ پہنچا۔ خلیفہ نے اس شکایت پر تمام گورنروں کو طلب کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کوئی جنگ چھیڑ دی جائے اور اس میں سب کو مصروف کر دیا جائے‘ کسی نے رائے دی کہ لوگوں کو مال دے کر ان کی زبانیں بند کر دی جائیں۔ جب کہ سعید بن عاص نے کہا کہ ان تمام شکایتوں کے پیچھے علیؑ کا ہاتھ ہے اور وہی ان کی قیادت کر رہے ہیں لہٰذا انہیں قتل کر دیا جائے تو معاملہ خود بخود ٹھنڈا ہو جائے گا۔ حضرت عثمان ان تمام شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور گورنروں کو واپس جا کر اپنا اپنا عہدہ سنبھالنے کی ہدایت کی۔ سعید بن

عاص کے واپس کوفہ پہنچنے سے پہلے ہی عمر بن عاص نے مالکِ اشتر کو اطلاع دی کہ سعید بن عاص اپنے عہدہ پر واپس آ رہا ہے۔ یہ خبر سن کر مالکِ اشتر اپنے ہمنواؤں کے ساتھ راتوں رات کوفہ پہنچے‘ دارالامارہ پر قبضہ کر لیا اور منبر پر جا کر یہ خطبہ دیا:

’’سعید بن عاص پھر تمہارا والی بن کر واپس آ رہا ہے‘ وہ یہ گمان کرتا ہے کہ جس سرزمین کو تم نے اپنی جانیں دے کر اور سر کٹا کر حاصل کیا ہے وہ زمین اور عراق کے باغات اس کی جاگیر اور مالِ فے ہے۔ اٹھو اور اٹھ کر کوفہ اور حیرہ کے درمیان جمع ہو جاؤ‘‘۔

سعید بن عاص جب عذیب کے مقام پر پہنچا تو مالکِ اشتر نے یزید بن قیس ارحبی اور عبداللہ بن کنانہ عبدی کو پانچ پانچ سو فوجیوں کے لشکر کے ساتھ روانہ کیا اور ہدایت کی کہ سعید کو واپس جانے پر مجبور کر دو اور اگر وہ نہ مانے تو وہیں اس کو قتل کر دو اور اس کا سر لے کر واپس آؤ۔ ان دونوں لشکروں نے سعید کو عذیب پر روک دیا۔ اس نے بہانہ بنا کر کہا کہ وہ کوفہ جا کر واپس وہاں سے واپس چلا جائے گا لیکن انہوں نے اسے کوفہ جانے کی اجازت نہیں دی۔ سعید بن عاص مدینہ واپس پلٹ گیا اور لشکر مالکِ اشتر کے پاس واپس آ گیا۔ کوفہ آ کر مالکِ اشتر نے ایک خطبہ دیا اور خدا کی حمد وثناء کے بعد فرمایا:

’’ہم نے جو کچھ کیا وہ خدا کی خوشنودی اور آپ لوگوں کے لئے کیا‘ اس میں ہمارا کوئی ذاتی مقصد نہیں۔ ہم نے سعید بن عاص کو اپنے شہر سے بھگا دیا ہے‘ ہم اب ابوموسیٰ اشعری کو فوجی معاملات کیلئے اور حذیفہ یمانی کو بیت المال کیلئے مقرر کرتے ہیں‘‘۔

یہ کہہ کر مالکِ اشتر منبر سے اترے اور ابوموسیٰ اشعری کو منبر پر جانے کی دعوت دی۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ ’’پہلے تم لوگ حضرت عثمان کیلئے تجدیدِ بیعت کرو‘ جب تک تم لوگ ان کی بیعت کی تجدید نہیں کرو گے میں اس عہدے کو قبول نہیں کروں گا‘‘۔ لوگوں نے اس کی بات کو قبول کیا اور حضرت عثمان سے تجدیدِ بیعت کی۔ حضرت عثمان اگرچہ اس عمل سے راضی ہو گئے لیکن اس سے ان

کی خلافت کو دھچکا لگا۔ حضرت عثمان کے قتل ہونے تک ابوموسیٰ کوفہ کا گورنر رہا اور سعید بن عاص حضرت عثمان کے ساتھ ان کے گھر میں رہا۔ (تاریخِ تہذیب دمشق ج۶، ص۱۳۳)

قرظہ بن کعب الانصاری

قرظہ بن کعب بن ثعلبہ بن عمرو بن کعب الانصاری خزرجی پیغمبر اسلامؐ کے صحابیوں میں سے تھے۔ یہ جنگِ احد میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے اور اس کے بعد بھی تمام جنگوں میں شریک رہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے علاوہ یہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے بھی تھے۔ جنگِ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں حضرت علیؑ کے ساتھ رہے۔ جنگ صفین میں انصار کی فوج کا پرچم ان کے ہاتھ میں تھا۔

جنگ جمل کے موقع پر جب ابوموسیٰ اشعری نے لوگوں کو حضرت علیؑ کے لشکر میں شامل ہونے سے روکا تو حضرت امام حسنؑ، مالکِ اشتر اور حجر بن عدی نے ابوموسیٰ اشعری کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر کے قرظہ بن کعب الانصاری کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

ان کے دو بیٹے تھے ایک بیٹے کا نام عمرو بن قرظہ تھا جو ۶ محرم کو امام حسین علیہ السلام کے لشکر میں شامل ہوا اور امامؑ کے رکاب میں شہید ہوا جب کہ ان کا دوسرا بیٹا علی بن قرظہ عمر سعد کے لشکر میں شریک رہا۔

مغیرہ ابنِ شعبہ

کوفہ کے گورنروں میں سے ایک گورنر مغیرہ بن شعبہ تھا۔ مغیرہ ابن شعبہ مکر و فریب میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس نے خیر و شر دونوں کو مخلوط کیا۔ اپنی جوانی کے زمانہ میں طائف کے ایک گروہ کو جو بارہ یا تیرہ افراد پر مشتمل تھا اپنے یہاں دعوت پر بلایا، ان کو خوب شراب پلائی، شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر جب یہ غافل ہو گئے تو ان سب کو قتل کیا، ان کے تجارتی مال پر جو وہ مصر سے لائے تھے اپنا قبضہ کیا اور فرار ہو کر مدینہ آیا۔ یہاں آ کر پیغمبر اسلامؐ کے ہاتھوں ایمان

لایا اور وہ مال جو وہ لے کر آیا تھا اسے پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا لیکن پیغمبرؐ نے وہ مال قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ اس نے دھوکے سے اسے حاصل کیا تھا۔

اگرچہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس کے حلق سے نیچے نہیں اترا تھا، صرف زبانی حد تک تھا۔ حضرت عمر نے اس کو بصرہ کا گورنر بنایا۔ اپنی گورنری کے دور میں یہ زنا کا مرتکب ہوا، جس کی شکایت لوگوں نے خلیفہ سے کی۔ یہاں تک کہ اس کے اس قبیح فعل کے چار چشم دید گواہ بھی خلیفہ کے سامنے پیش ہوئے۔ تین گواہوں نے مکمل گواہی دی لیکن چوتھے گواہ زیاد بن ابیہ نے گواہی دیتے وقت جان بوجھ کر اپنی زبان میں لکنت پیدا کی اور تردد کی صورت اختیار کی جس کی وجہ سے وہ حد جاری ہونے سے بچ گیا۔

مغیرہ بن شعبہ نے گورنری کے امیدوار کی حیثیت سے جب حضرت عمر کے سامنے خود کو پیش کیا تو حضرت عمر نے کہا کہ تم ایک فاسق انسان ہو، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اسے گورنری کے عہدہ پر فائز کیا۔ کوفہ سے آنے والے لوگوں سے جب خلیفہ نے پوچھا کہ تمہارے گورنر کا کیا حال ہے تو لوگوں نے کہا کہ اس کی فسق و فجور کے بارے میں آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد حضرت علیؑ کو اس نے مشورہ دیا کہ آپؑ سابق گورنروں کو ان کے مقام سے نہ ہٹائیں، لیکن حضرت علیؑ نے اس کے مشورے کو مسترد کر دیا جس کے بعد اس نے حضرت علیؑ سے دوری اختیار کر لی۔ جنگ جمل میں اس نے دونوں فریقین (یعنی حضرت علیؑ اور حضرت عائشہ) سے دوری اختیار کی۔ تحکیم کے موقع پر بھی اس نے ایک کھیل کھیلا اور وہیں سے اس کا رجحان معاویہ کی طرف بڑھ گیا اور شام میں معاویہ سے جا کر مل گیا۔

زیاد بن ابیہ آذربائیجان میں حضرت علیؑ کی طرف سے گورنر مقرر تھا۔ مغیرہ بن شعبہ نے پیغمبرؐ کی روایت کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے زیاد بن ابیہ کو ابوسفیان کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے معاویہ کا نسبی بھائی بنانے کا اعلان کرانے میں رابطے کا اہم کردار ادا کیا۔

مغیرہ بن شعبہ کو جب یہ خبر ملی کہ معاویہ اسے کوفہ کی گورنری سے ہٹانے والا ہے تو یہ فوراً معاویہ کے پاس گیا اور اپنی گورنری بچانے کی خاطر اس نے خوشامد اور چاپلوسی میں معاویہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے فرزند یزید کی ولی عہدی کا اعلان کر دے۔ مغیرہ کا یزید کی ولی عہدی کے اعلان کا یہ خبیث مشورہ اس کا ایک ایسا ناپاک اور مکروہ عمل تھا جس نے تاریخ اسلام کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا یہ قبیح عمل اسلام و مسلمین کے لئے ناقابلِ تلافی صدمہ اور نقصان کا سبب بنا۔ پھر مغیرہ کی بے حیائی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے واپس آ کر کہا کہ میں نے معاویہ کو ایک ایسے گڑھے کے کنارے لا کر کھڑا کیا ہے جہاں سے بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔

معاویہ کے دور میں یہ شخص تقریباً سات سال تک کوفہ کا گورنر رہا۔ اس تمام دور میں لوگوں کو سزا دینے اور تادیب کرنے میں اس نے صرف اس وجہ سے گریز کیا کہ اس میں (جیسا کہ وہ خود کہتا تھا) معاویہ کی تو بہتری تھی لیکن خود اس کی اپنی بربادی تھی۔ لیکن اس نے اس تمام مدت میں حضرت عثمان اور بنی امیہ کی مدح سرائی میں کبھی کوتاہی اور حضرت علی علیہ السلام پر سب و شتم کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اس کے تحتی سے گریز اور نرمی کا رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے خوارج اور شیعوں کو کوفہ کے اندر منظم ہونے اور تحرک کا موقع ملا۔ چنانچہ سیاست دان اور تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ دوسرے گورنروں کے مقابلہ میں اس نے کہیں زیادہ بیک وقت اپنے خلیفہ، اپنی رعیت اور خود اپنے آپ کو راضی رکھا۔

زیاد ابن ابیہ

زیاد بن ابیہ کی ماں سمیہ نامی عورت حاملہ ہوئی اور زیاد ہجرت والے سال یا اس کے بعد شہر طائف میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں سمیہ ایرانی یا ہندی تھی۔ یہ حارث بن کلدہ کی کنیز تھی اور اس کے باپ کا نام عبید تھا جو رومی تھا۔ حارث نے سمیہ کو ایک رومی غلام کے عقد میں دیا۔ سمیہ کا شمار طائف کی بدکار عورتوں میں ہوتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ پر ایک جھنڈا نصب ہوتا تھا جو اس

بات کی علامت سمجھا جاتا تھا کہ یہ بدکاری کا اڈہ ہے۔ سمیہ بدکاری کے پیشہ سے جو رقم حاصل کرتی تھی اس میں سے کچھ رقم حارث کو بطورِ ٹیکس ادا کرتی تھی۔

اسلام قبول کر کے زیاد جب مدینہ آیا تو اس کو زیاد بن ابیہ کہتے تھے، لیکن اس کا یہ نام زیادہ معروف نہیں تھا بلکہ زیادہ تر یہ زیاد ابنِ سمیہ کے نام سے مشہور تھا بعد میں رفتہ رفتہ اسے ابنِ ابیہ یا ابنِ سمیہ کی بجائے زیاد الامیر کہنے لگے۔ ۴۴ ہجری میں جب یہ شخص حضرت علیؑ سے کٹ کر معاویہ سے جا ملا تو حکومت کے لوگ اسے زیاد ابنِ ابی سفیان کہنے لگے جب کہ عام لوگ اس کو زیاد ابنِ ابیہ ہی کہتے تھے۔

حضرت علیؑ کے دورِ خلافت میں حضرت علیؑ نے یا حضرت علیؑ کی طرف سے منصوب گورنر نے اس کو فارس اور آذربائیجان کا گورنر مقرر کیا۔ معاویہ نے اس کو حضرت علیؑ سے منحرف کرنے اور اپنے ساتھ ملانے کیلئے کوشش کی اور اسے دھمکی بھی دی۔ مغیرہ بن شعبہ جو انتہائی سازشی آدمی تھا اور اپنے مکروفریب میں اپنی مثال آپ تھا، زیاد کو حضرت علیؑ سے کاٹ کر معاویہ سے ملانے کی کوشش میں مسلسل لگا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ وہ امام حسن علیہ السلام کے دور میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ زیاد کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ نامعلوم باپ کا بیٹا ہے، اگر تم اسے اپنے باپ سے منسوب کر کے ابوسفیان کا بیٹا اور اپنا بھائی قرار دے دو تو وہ تم سے آ کر مل جائے گا۔ ادھر مغیرہ نے زیاد کو مشورہ دیا کہ تم کچھ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو، تم جو حسنؑ کی طرف داری کرتے ہو یہ تو ایک روز معاویہ سے صلح کر لیں گے، اس کے بعد تم بے سہارا ہو جاؤ گے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ خلافت معاویہ کی طرف منتقل ہونے سے پہلے ہی تم معاویہ سے مل جاؤ، اس میں تمہاری بہتری ہے۔ زیاد ابن ابیہ نے مغیرہ بن شعبہ کی اس تجویز کو اس شرط پر قبول کیا کہ بیت المالِ مسلمین کو اس کی ملکیت قرار دیا جائے اور معاویہ اس کے ابوسفیان کا بیٹا اور اپنا بھائی ہونے کا رسمی طور پر اعلان کرے۔ معاویہ اور زیاد کے درمیان بالواسطہ مذاکرات

کی کامیابی کے بعد زیاد کو دمشق بلا لیا گیا اور وہاں ایک عام اجتماع میں ابومریم سلولی نامی شخص سے جو طائف میں شراب فروخت کرتا تھا گواہی دلوائی گئی۔ ابومریم سلولی نے عام مجمع میں بطورِ شہادت اپنا تفصیلی بیان قلمبند کرایا کہ ابوسفیان نے زیاد کی ماں سمیہ سے زنا کیا۔ چنانچہ اس کے بعد اسے زیاد ابن سمیہ کی بجائے زیاد ابنِ ابی سفیان کہا جانے لگا اور وہ اسی نام سے معروف ہوا۔ اس سازش کو اگرچہ باطل حکمرانوں کے مشن کی بہ ظاہر بڑی کامیابی سمجھا گیا لیکن اس کے نتیجہ میں زیاد اور معاویہ دونوں فریقوں کو بدترین صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ زیاد کو بھری مجلس میں اپنی ماں کے بارے میں ابومریم سلولی کے شرمناک بیان سے ہمیشہ ایک احساسِ حقارت کا سامنا کرنا پڑا جب کہ معاویہ کو اس غیر شرعی فیصلہ اوراعلان پر لوگوں کے مذمتی بیانات کا سامنا کرنا پڑا جو یہ کہہ کر احتجاج کر رہے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا:

''بچہ اسکا کہلاتا ہے جس کے بستر پر اس کی ماں سوتی ہے ...... زانی کا نہیں''۔

۴۵ ہجری میں زیاد بن ابیہ بصرہ کا گورنر بنا۔ ۵۰ ہجری میں مغیرہ بن شعبہ کے مرنے کے بعد کوفہ کا گورنر بھی زیاد بن ابیہ ہی مقرر ہوا۔ یہ چھ مہینے کوفہ میں رہتا تھا اور چھ مہینے بصرہ میں۔ جب کوفہ میں رہتا تھا تو سمرہ ابن جندب یا عمرو بن حریث کو اپنی جگہ مقرر کرتا تھا۔

زیاد ابن ابیہ جب پہلی بار کوفہ میں گورنر بن کر آیا تو اس نے اپنے خطبہ کا آغاز خدا کی حمد وثناء اور پیغمبرؐ پر درود اور سلام کی بجائے لوگوں کو دھونس دھمکی سے شروع کیا اور انہیں خوف وہراس میں مبتلا کیا۔ چنانچہ لوگوں نے اس کے اس خطبہ کو خطبہ بترہ (ابتر) کا نام دیا۔ اس کے اشارہ پر سمرہ ابنِ جندب نے کوفہ اور بصرہ میں آٹھ ہزار افراد کو قتل کیا اور جب اس سے پوچھا گیا کہ اتنے لوگوں کو قتل کرتے ہوئے کیا کبھی تم کو افسوس اور پشیمانی نہیں ہوئی تو اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور کہا کہ اگر میں وہاں تمام لوگوں کو بھی قتل کر دیتا تب بھی مجھے کوئی پشیمانی اور افسوس نہیں ہوتا۔ زیاد بن ابیہ نے اپنے دور میں بیت المالِ مسلمین کو ہڑپ کیا' لوگوں میں خوف

ووہشت پھیلائی' حضرت علی علیہ السلام پر سب وشتم کو رواج دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس کی مخالفت کرنے پر حجر بن عدی اور ان کے تیرہ ساتھی عمرو بن حمق جیسے صحابیِ رسولؐ زیاد بن ابیہ اور معاویہ کے غیظ وغضب کا نشانہ بن کر لقمۂ اجل بنے۔ طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

''زیاد بن ابیہ مکر وفریب' چالاکی اور فہم وفراست میں مغیرہ بن شعبہ سے کہیں آگے تھا۔ اس نے نرم مزاجی' مدارتی سیاست اور لوگوں سے اچھے سلوک کی سنت خلفاء راشدین سے لی جب کہ جباریت اور طاغوطیت کی رسم معاویہ سے لی۔ یہ دونوں چیزیں اس میں مرکب تھیں''۔

زیاد بن ابیہ نے جو تشدد کی خصلت اپنائی اس کے بارے میں طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

''زیاد اور معاویہ کے درمیان عرب کی روایات کے خلاف طے پانے والے طریقۂ کار اور غیر شرعی طور پر ابوسفیان سے منسوب ہونے اور معاویہ کا بھائی قرار پانے کی رسم نے زیاد میں احساسِ کمتری اور لوگوں کی طرف سے اپنے لئے حقارت شدت سے پیدا کر دیا۔ لوگوں کی اس حقارت کو کم کرنے اور ان سے اس بارے میں سوچنے اور سمجھنے کا موقع چھیننے کی غرض سے اس نے اہلِ عراق پر تشدد کا یہ طریقۂ کار اپنایا۔ اس کا ظلم وستم اور تشدد اس حد تک پہنچا کہ جب اس نے سنا کہ شیعیانِ علیؑ کے ستر افراد حضرت علی علیہ السلام پر سب وشتم کئے جانے کے خلاف ہیں تو اس نے ان کو بلا کر دارالامارہ کے دروازے پر کھڑا کیا اور فیصلہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص دارالامارہ میں داخل ہوتے وقت علی علیہ السلام پر سب کرے اور جو انکار کرے اسے وہیں قتل کر دیا جائے۔ ابھی وہ اپنے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے قصر میں ایک عجیب درد میں مبتلا ہوا اور اسی درد میں ۵۳ ہجری میں اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کیلئے واصلِ جہنم ہوا'' (مروج الذہب ج ۳، ص ۳۰، ۱۵' یعقوبی ج ۲، ص ۲۱۸، ۲۲۳' تجارب الامم ج ۲، ص ۲۶' الفتنۃ الکبریٰ ش ۴۸، ص ۲۰۲)

ضحاک بن قیس

اس کا نام ضحاک بن قیس اور کنیت ابوعبدالرحمن ابوسعید الفہری قریشی ہے۔ ۵ ہجری

میں پیدا ہوا۔ اصحاب صفہ میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یہ فتح دمشق میں شامل تھا اور فتح دمشق کے بعد اس نے وہیں سکونت اختیار کی۔ جنگِ صفین میں یہ معاویہ کے ساتھ تھا۔ یزید کی ولی عہدی کی تائید کرنے والوں مین یہ بھی شامل تھا۔

نہج البلاغہ میں امیرالمومنین علی ؑ کے خطبہ/۲۹ کے مطابق جنگِ صفین کے بعد یہ شخص معاویہ کی طرف سے چار ہزار کا لشکر لے کر عراق کی سرزمین میں قتل و غارت گری اور خوف و دہشت پھیلانے پر مامور ہوا۔ معاویہ کی موت کے موقع پر اس کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوا اور یزید کے خلافت سنبھالنے تک چند دن کیلئے اس نے خلافت بھی سنبھالی۔ یزید کے مرنے کے بعد اس نے زبیر کے لئے لوگوں سے بیعت لی اور اس کے بعد دوبارہ اپنے لئے لوگوں سے بیعت لی۔

۵۵ ہجری میں زیاد بن ابیہ کے مرنے کے بعد وقتی طور پر کچھ عرصے کی لئے عبداللہ بن خالد بن اسید کو کوفہ کا گورنر بنایا گیا' اس کے بعد ضحاک بن قیس کوفہ کا گورنر بنا اور ۵۸/ہجری میں اس کو معزول کیا گیا۔

یہ شخص اپنی قساوت اور شقاوت کیلئے مشہور تھا۔ بنی امیہ کی کاسہ لیسی اور خصوصاً اہلِ بیت ؑ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔

نعمان ابن بشیر

نعمان بن بشیر بن سعد بن ثعلبہ بن خلاص ابوعبداللہ انصاری خزرجی کی پیدائش پیغمبرؐ کی مدینہ ہجرت کے ایک سال دوماہ بعد ہوئی۔

نعمان انصار میں اور عبداللہ بن زبیر مہاجرین میں پیغمبرؐ کی ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے لڑکوں میں سے تھے۔ نعمان اور اس کے باپ نے سقیفہ میں انصار کی مخالفت کرتے ہوئے سب سے پہلے حضرت ابوبکر کی بیعت کی۔ جب حضرت علیؑ خلیفہ بنے تو اس شخص نے امیرالمومنین

ؑ کی بیعت نہیں کی بلکہ عثمان کی قمیص اور ان کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلی لے کر معاویہ کی طرف فرار ہوگیا۔ معاویہ نے ابو ہریرہ اور نعمان کو اس مطالبے کے ساتھ حضرت علیؑ کے پاس بھیجا کہ قاتلانِ عثمان کو ان کے سپرد کردیں تاکہ ان سے قصاص لیا جائے۔

معاویہ جانتا تھا کہ علیؑ ایسا نہیں کریں گے' لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ دونوں واپس آئیں گے تو اپنی زبان سے علیؑ کی مذمت کریں گے تو اہلِ شام کو متنفر کرنا آسان ہوجائے گا اور یہ دونوں بھی علیؑ سے دور ہوجائیں گے۔

جب یہ دونوں حضرت علیؑ کے پاس پہنچے تو آپؑ نے فرمایا:

''تم (نعمان) اپنی قوم میں ہدایت یافتہ انسان ہو' تمہاری قوم (انصار) کے چار یا پانچ کے سوا تمام افراد میری پیروی کرتے ہیں۔ کیا تم ان چند افراد کے ساتھ رہوگے؟ تو اس نے کہا: خدا آپؑ کے امور کی اصلاح کرے۔ میں آپؑ کے ساتھ رہنے کے لئے آیا ہوں۔ میں معاویہ کا پیغام اس لئے لایا تاکہ آپؑ کے پاس آنے کا بہانہ مل جائے۔ اس کے بعد نعمان حضرت علیؑ کے پاس رہا جب کہ ابوہریرہ دمشق واپس چلا گیا''۔

چند ماہ بعد نعمان پھر فرار ہوگیا۔ معاویہ کے پاس جاتے ہوئے عین التمر نامی جگہ پر حضرت علیؑ کے گورنر نے اس کو گرفتار کرکے زندان میں ڈال دیا' وہاں قطہ بن کعب نے جو انصار سے تھے' سفارش کرکے اسے آزاد کرایا۔ یہ جلد ہی فرار ہو کر معاویہ کے پاس پہنچ گیا۔

نعمان بن بشیر عثمانی العقیدہ تھا۔ معاویہ سے ایک ہزار کا لشکر لے کر عین التمر پر حملہ آور ہوا لیکن شکست کھا کر واپس چلا گیا۔

نعمان بن بشیر ان اشخاص میں سے تھا جو معاویہ کے فائدے کیلئے حدیث جعل کیا کرتے تھے۔ جنگِ صفین میں معاویہ کے ساتھ انصار میں سے نعمان بن بشیر اور مسلمہ بن خویلد کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

معاویہ کے مرنے سے پہلے یہ شخص کوفہ میں معاویہ کی طرف سے گورنر تھا یہاں تک کہ معاویہ مرگیا۔ کوفہ کے شیعوں نے حضرت امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے خط میں لکھا کہ ہم نعمان بن بشیر کے ساتھ جمعہ و جماعت نیز عیدین میں شرکت نہیں کرتے۔ جب حضرت مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہوئے تو آپ نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں قیام فرمایا اور کوفہ والوں سے امام حسینؑ کے لئے بیعت لی۔

کوفہ والوں کی مسلم بن عقیل کے ساتھ اجتماعات اور سرگرمی دن بہ دن بڑھنے کے باوجود نعمان بن بشیر لاتعلقی اور تجاہل سے کام لیتا رہا اور کوفہ والوں کے امام حسینؑ کے نمائندے کے ساتھ اظہارِ عقیدت کے اعلان اور ان کے گرد جمع ہونے کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ چنانچہ کوفہ میں موجود بنی امیہ نواز شخصیات جن میں عمر بن سعد عبداللہ بن مسلم بن ربیعہ خزرمی، امارہ بن عقبہ وغیرہ تھے، سب نے مل کر نعمان سے مطالبہ کیا کہ وہ کوفہ میں بنی امیہ کے خلاف ہونے والی ان حرکات کے بارے میں اپنا موقف واضح کرے تا کہ اس تحریک کا سدباب کیا جا سکے۔ اس وقت نعمان بن بشیر منبر پر گیا اور حمد وثنائے الٰہی کے بعد اس نے کہا:

"اے لوگو! میں کسی سے جنگ نہیں کروں گا جب تک کوئی مجھ سے نہ لڑے، میں کسی پر حملہ نہیں کروں گا سوا اس کے کہ جو مجھ پر حملہ آور ہو، میں کسی پر تہمت نہیں لگاؤں گا۔ خدا کے بندو خدا سے ڈرو فتنہ و فساد کی طرف جلدی نہ کرو جس میں خونریزی اور انسان کی ہلاکت اور تباہی اور اموال کا زیاں ہے۔ اگر تم نے مجھ سے منہ موڑ لیا اور بیعت کو توڑ لیا اور اپنے امام یزید کے خلاف اقدام کیا تو میں تمہیں تلوار سے قتل کروں گا جب تک یہ تلوار میرے ہاتھ میں رہے گی میں اس سے تنہا لڑوں گا چاہے میرا کوئی مددگار رہو یا نہ ہو اور چاہے میرا کوئی ساتھ دے یا نہ دے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں حق کو چاہنے والے باطل کے چاہنے والوں سے زیادہ ہوں گے"

یہ خطبہ سننے کے بعد عبداللہ بن مسلم بن سعید خزرمی نے کہا:

تمہاری یہ گفتگو غلط ہے۔ یہ بات جو تم نے کہی ہے اس میں دشمن کے خلاف رعب و دبدبہ نہیں، تمہاری گفتگو سے کمزوری جھلکتی ہے۔ نعمان نے جواب دیا کہ خدا کی اطاعت کرتے ہوئے کمزوروں میں سے ہونا میرے لئے بہتر ہے بجائے اس کے کہ معصیت میں رہ کر طاقتور ہوجاؤں۔

عبداللہ بن مسلم اور عمر بن سعد نے فوراً یزید کو خط لکھا کہ اگر کوفہ کو اپنے قبضے میں رکھنا ہے تو نعمان بن بشیر سے قوی تر شخص کو گورنر بنائے جو یہاں تحریک کو کچل سکے۔

نعمان بن بشیر کے اس تجاہل اور نرم رویئے کی وجوہ پر غور کرنے سے پہلے حسبِ ذیل نکات قابلِ توجہ ہیں۔

دنیا میں قدیم زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک حکومتوں کے ذیلی اداروں کے مسئولین کا رویہ اور سلوک اپنی ماتحت رعیت کے ساتھ مختلف ہوتا ہے اور اپنے رئیس اور حاکم کے بارے میں نظریہ بھی مختلف ہوتا ہے۔

(۱) مرکزی سیاست کی پاسداری

یعنی مرکزی سیاست کے کیا مقاصد ہیں؟ مرکز کو کس طریقے سے بچایا جائے؟ مرکزی سیاست کا اجرا اور نفاذ کیسے کیا جائے؟

(۲) ذاتی اور شخصی سیاست

ایک شخص خود لوگوں میں کس طرح محبوب القلوب رہے۔ کس طرح لوگوں پر اس کا تسلط رہے۔ لوگ اسے کیسا اور کیونکر پسند کریں؟

(۳) مرکز سے اختلافِ نظر

مرکزی سیاست کے نفاذ کو مرکز کے مفاد میں نہیں پاتا بلکہ اس وقت کا یہ اقدام مرکز کے خلاف سمجھتا ہے۔ وہ وقتی طور پر مرکز کی ناراضگی کو مول لے لیتا ہے۔ مرکز کی طرف سے ہونے

والے عتاب کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔

اگر مرکز کو یہ احساس ہو جائے کہ یہ شخص مرکز کا مخالف ہے، مرکز کے حق میں نہیں تو مرکز اس کو کچل دیتا ہے یا ختم کر دیتا ہے۔ لیکن اگر مرکز نے درک کیا کہ وہ مرکز کے خلاف نہیں بلکہ وہ مرکز کے حق میں ہے لیکن مرکز کی پالیسی سے اختلافِ نظر رکھتا ہے تو اس وقت اس کو وقتی طور پر اس کے منصب سے ہٹا دیتا ہے اور کسی اور کو اس کی جگہ تعینات کر دیتا ہے۔ اس کے حق میں اتار چڑھاؤ کر کے اس پر اور اس کے ردِعمل پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔

بعد میں اس کو معزول و برطرف کر دیتا ہے یا ترقی دے دیتا ہے لہٰذا کسی بھی سیاسی شخصیت کے بارے میں جلد ہی کوئی رائے قائم کرنا درست نہیں۔ کبھی کوئی انسان حقیقتاً دیانتدار اور باضمیر ہوتا ہے۔ وہ وقتی مصلحت کے تحت کسی حکومت میں آتا ہے اور جونہی اس کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے وہ اس عہدے کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ مثلاً حر بن یزید ریاحی جو عمر بن سعد کا ساتھ دیتے رہے، حسینؑ کا راستہ روکا، کوفہ نہ جانے دیا، کربلا میں لشکر ابنِ سعد میں رہے لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ حسینؑ قتل کر دیئے جائیں گے، خود کو جنت اور جہنم کے درمیان پایا، ایمان کو خطرے میں دیکھا تو لشکرِ سعد سے نکلے اور امام حسینؑ کی خدمت میں آ کر راہِ خدا میں جان دے دی۔

لہٰذا جب تک کسی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ نہیں کیا جائے اچھائی یا برائی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔

ان تمام نکات کو سامنے رکھ کر نعمان ابنِ بشیر کے تجاہل اور نرمی کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

نعمان کے تجاہل کے اسباب

(۱) بہت سے سیاستدان ضعفِ ارادہ اور قوتِ فیصلہ نہ رکھنے کی وجہ سے ہنگامی حالات میں جلد فیصلہ کر پاتے۔

(۲) نعمان ابنِ بشیر حجازی تھا۔ حجازیوں کی طبیعت میں غفلت، جمود اور عدمِ تحرک ہے۔

(۳) وہ اپنی صحابیِ رسولؐ کی حیثیت کو محفوظ رکھنے کا خواہاں تھا کیونکہ صحابیِ رسولؐ ہوتے ہوئے عام مسلمانوں کا خون بہانا مناسب نہیں سمجھتا۔ چہ جائیکہ وہ امام حسینؑ نواسہ رسولؐ کا خون بہانے میں شریک ہو۔ وہ اس بات سے گریز کرتا تھا اگر چہ صحابیِ رسولؐ کا احترام اس کے اندر بہت ضعیف اور کمزور تھا۔ ممکن ہے اس نے اپنی صحابیت کو بچانے کے لئے کوئی ایسا اقدام کرنے سے گریز کیا ہو کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ کوفہ امام حسینؑ کے بارے میں بے تاب ہے اگر کوئی اقدام کرے گا تو خون خرابہ کے بغیر مسئلہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔

(۴) مسلم بن عقیل کا قیام مختار کے گھر تھا اور مختار نعمان ابنِ بشیر کا داماد تھا۔ اگر وہ کوئی اقدام کرتا تو زد میں اس کی بیٹی اور داماد آ جاتے۔ ممکن ہے مسلم بن عقیل کے مختار کے گھر کو اپنی قیام گاہ بنانے کی وجہ بھی یہی ہو۔

(۵) وہ یزید سے خاص خوش نہیں تھا کیونکہ بنی امیہ بالعموم اور یزید بالخصوص انصار کو حقیر اور ذلیل سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کی دو وجہ ہیں۔

(الف) جب پیغمبرؐ نے دعوتِ اسلام دینا شروع کی تو ابوسفیان مشرکین کی قیادت کرتے ہوئے پیغمبرؐ کی مخالفت میں کھڑا ہو گیا۔ اہلِ مدینہ نے پیغمبرؐ کو اپنے یہاں پناہ دی اور جب ابوسفیان نے حضرت محمدؐ کے خلاف جنگ کی تو انصار نے حضورؐ کا ساتھ دے کر معاویہ کے آباؤ اجداد کو بدر اور احد میں قتل کیا۔

(ب) جنگِ صفین اور دیگر جنگوں میں انصار نے علیؑ کا ساتھ دیا جب کہ معاویہ کے ساتھ نعمان ابنِ بشیر اور مسلمہ بن مخلد کے سوا کوئی نہیں تھا۔

(۶) بہت سے سیاستدان حلم، صبر و تحمل اور نرم مزاجی سے مشکل سے مشکل مسائل کو حل کرتے ہیں اور اسی میں مشکلات کا حل مضمر سمجھتے ہیں۔ نعمان ابن بشیر کی سیاست کا رخ اور اس کا سیاسی مزاج

نرمی پر قائم تھا۔ معاویہ نے اس کو اس نرم مزاجی کے سبب کوفہ کی گورنری پر مقرر کیا تھا۔ کیونکہ سفاک اور قسی القلب زیاد ابن ابیہ کے دور کی سفاکی نے اہلِ کوفہ کے دلوں میں بنی امیہ کے خلاف نفرت پیدا کردی تھی۔ وہ بنی امیہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لہٰذا معاویہ نے نعمان ابن بشیر کی نرم مزاجی کی بناء پر اس کو کوفہ کا گورنر بنایا۔ نعمان اپنی نرم مزاجی سے حالات کو ڈھیل دیتا رہا۔ ادھر کوفہ میں امام حسینؑ کے حق میں آواز بلند ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر ان حالات میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو ممکن ہے بنی امیہ کی حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ اگر ایسا ہوا تو خود یزید کی حکومت کی طرف سے موردِ عتاب قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف اہلِ کوفہ کی طرف سے بھی موردِ عتاب قرار پائے۔ دوسری صورت میں چونکہ اپنے آقا کا نمک خوار تھا اس کے سامنے جوابدہ تھا۔ ان کے حالات کے پیشِ نظر یہ بڑی حرکت تھی' یہ بنی امیہ کے خلاف ایک چھوٹی سی جھڑپ نہ تھی۔ لہٰذا اس کے بارے میں مرکزی حکومت کو فیصلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ مرکز سے فیصلہ صادر ہونے تک نعمان مسئلہ کو ڈھیل دیتا رہا۔ اس کی پالیسی کے دلائل یہ ہیں۔

(الف) اس نے اپنے خطبہ میں کہا کہ اگر لوگ دارالامارہ کی طرف بڑھیں گے اور حکومت کے زوال کے لئے قدم اٹھائیں گے تو میں ان سے آخری دم تک تن تنہا لڑوں گا۔

(ب) جب عبیداللہ ابنِ زیاد دارالامارہ کے دروازہ پر پہنچا تو اس نے اسے امام حسینؑ سمجھا اور امام حسینؑ سمجھ کر کہا کہ دارالامارہ میرے پاس امانت ہے میں آپ کے سپرد نہیں کروں گا' برائے مہربانی یہاں سے چلے جائیں۔

(ج) اس نے اہلِ کوفہ سے کہا کہ ''اپنے امامِ وقت یزید کی اطاعت کریں اور بیعت نہ توڑیں۔'' اگر وہ شریف انسان ہوتا تو یزید کو کسی صورت اپنا امام قرار نہ دیتا۔ اگر وہ خود کو جمہوریت کا علمبردار سمجھتا تھا تو یزید کی حکومت کے جبر و تشدد اور رشوت ستانی پر قائم ہونے کے باوجود وہ یزید کی اطاعت کی دعوت کیوں دیتا ہے۔ اس عمل سے تو وہی خوش ہو سکتا ہے جو یزید کے ساتھ

کو اہلِ حق اور اس کے مخالف کو اہلِ باطل کہتا ہے۔

(د) وہ اگر امام حسینؑ کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتا اور دل سے یزید کی حکومت کا مخالف ہوتا تو کوفہ کی گورنری چھوڑ کر امام حسینؑ کے ساتھ مل جاتا یا کم از کم مستعفی ہو جاتا لیکن آخری دم تک اس نے دارالامارہ کو بقول اس کے بنی امیہ کی امانت سمجھا اور اس کی حفاظت کرتا رہا۔

(ہ) اگر اس کی یہ نرم مزاجی اور سستی یزید کی مخالفت پر مبنی ہوتی تو یزید اس کو اس سستی کے نتیجہ میں اس منصب سے ہٹا کر موردِ عتاب قرار دیتا اور اس کو حمص کا گورنر نہ بناتا۔ بلکہ نعمان تو یزید کے مرنے تک حمص کا گورنر رہا۔ یزید کے مرنے کے بعد اس نے عبداللہ ابنِ زبیر کی بیعت کی۔ جب اہلِ حمص نے عبداللہ ابنِ زبیر کے خلاف بغاوت کی تو نعمان وہاں سے فرار ہو گیا۔ جس پر خالد نے اس کا تعاقب کر کے حمص ہی میں اسے قتل کر دیا۔

اس تمام تجزیہ و تحلیل کے بعد اس کا یہ جملہ کہ ''اطاعتِ خدا میں کمزور ہونا مجھے پسند ہے اور معصیتِ خدا میں مبتلا ہو کر صاحبِ عزت ہونے سے بہتر ہے۔'' محض منافقت پر مبنی ہے اور اس کے عقیدے کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اگر وہ امام حسینؑ کے قیام کے موقع پر امامؑ کے خلاف اقدام کو معصیت سمجھتا تھا تو امامؑ کو شہید کئے جانے کے بعد وہ کیوں یزید کے پرچم تلے رہا۔

عبیداللہ ابنِ زیاد بن ابیہ

عبیداللہ ابن زیاد وہ ظالم' سفاک اور شقی ترین انسان تھا جس کے جرائم اور اس کی ماں کا نام مرجانہ تھا۔ یہ شہنشاہِ ایران کے مجوسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی' ایک فاحشہ' زانیہ اور فاجرہ عورت تھی۔ عبیداللہ کا باپ زیاد بھی مجرمانہ ذہنیت کا آدمی تھا جو کسی نامعلوم شخص کے نطفہ سے پیدا ہوا' اسی وجہ سے وہ اپنی ماں کی نسبت سے زیاد بن سمیہ کے نام سے مشہور ہوا' بعد میں معاویہ نے اپنی سیاسی ضروریات کے تحت اس کو اپنے باپ ابوسفیان سے منسوب کر کے اسے اپنا بھائی بنایا۔ تاریخ میں یہ زیاد ابنِ ابیہ کے نام سے مشہور ہے۔ عبیداللہ اسی زیاد ابنِ ابیہ کے نطفہ سے

پیدا ہوا۔اس طرح عبیداللہ کو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے سفاکی اور شقاوت ورثہ میں ملی ۔

عبیداللہ کے پیدا ہونے کے بعد اس کے باپ نے اس کی ماں مرجانہ کو طلاق دے دی اور اس طرح یہ شقی انسان اپنی زانیہ اور فاحشہ ماں مرجانہ کے زیرِ تربیت رہا۔بعد میں اس کی ماں مرجانہ نے شیرہ نامی شخص سے عقد کرلیا۔بڑا ہونے کے بعد عبیداللہ کو اس کے باپ ابنِ زیاد نے تعلیم وتربیت کے لئے پھر اپنے دامنِ شقاوت میں لے لیا۔معروف زاہد حسن بصری اس شقی انسان کو غلامِ سفیہ قرار دیتے ہیں ۔

اس کی ماں چونکہ ایرانی تھی اور اس کا بچپن اپنی ماں کی ہی تربیت میں گزرا اس لئے عبیداللہ عربی زبان روانی سے نہیں بول سکتا تھا۔یہ مرضِ جوع البقر میں مبتلا تھا جس میں بسیار خوری کے باوجود پیٹ نہیں بھرتا ۔

۵۳ رہجری میں جب اس کا باپ زیاد ابنِ ابیہ اپنی مجرمانہ زندگی کے انجام کو پہنچا تو اپنے باپ کے منصب پر مقرر کئے جانے کی خواہش لے کر یہ معاویہ کے پاس دمشق گیا۔معاویہ نے اس کے باپ کی مجرمانہ خدمات کے صلہ میں اس کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔اس کی نا اہلیت' ناتجربہ کاری اور بُرے کردار کی وجہ سے اہلِ خراسان نے جب اس کی شکایت کی تو معاویہ نے اسے معزول کر کے ۵۵ رہجری میں بصرہ کا گورنر بنایا۔

۶۰ رہجری میں معاویہ اپنے آخری ایام میں اپنے شاطرانہ ذہن اور سیاسی دوراندیشی کی بنیاد پر اس وقت کے حالات کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔اسے اپنے خلاف اہلِ کوفہ کی نقل وحرکت' ان کی مدینہ کی طرف آمد ورفت اور امام حسی نؑ کی سرگرمیوں کی رپورٹیں مدینہ کے گورنر کی طرف سے مسلسل مل رہی تھی ۔معاویہ اپنی آخری عمر میں تشدد اور تصادم سے بچنے کی کوشش میں تھا تا کہ دنیا سے جاتے وقت لوگوں میں نیک نامی حاصل کر سکے۔وہ حسینؑ ابنِ علیؑ سے ٹکر لینے کے نتائج سے بخوبی آگاہ تھا' ادھر کوفہ کی بڑھتی ہوئی بے چینی کی وجہ سے بھی وہ بہت

پریشان تھا۔وہ کوفہ کو کنٹرول کرنے اور شیعوں کو دبانے کے لئے کسی زیاد ابنِ ابیہ جیسے جنایت کار شخص کی سختی سے ضرورت محسوس کر رہا تھا۔وہ اسی کشمکش وپیچ میں تھا کہ ایسا شخص کہاں سے لے کر آئے کہ یکا یک اس کے ذہن میں عبیداللہ ابنِ زیاد کا چہرہ ابھرا اور اس نے اسے کوفہ پر مسلط کرنے کا فیصلہ کرلیا۔حکم نامہ تحریر کرایا لیکن یہ حکم نامہ ابھی جاری نہیں ہو پایا تھا کہ معاویہ دنیا سے سدھار گیا۔

کوفہ میں ایک عرصے سے بنی امیہ کے ظلم وستم کی چکی میں پسنے والوں کو جب معاویہ کی موت کی خبر ملی تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔اسی دوران اہلِ کوفہ کو دوسری بشارت یہ ملی کہ ان کے مولیٰ وآقا امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے اپنے قیام وانقلاب کا آغاز مکہ سے کردیا ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی امامؑ کے حکم کے منتظر یہ جانثارانِ امامؑ جلیل صحابی سلیمان ابن صرد خزاعی کے گھر میں جمع ہوئے' پیہم مذاکرات اور گفت وشنید کے بعد امامؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دینے کے لئے مسلسل خطوط اور نمائندے مکہ روانہ کئے ۔جب کثیر تعداد میں خطوط اور نمائندے آپؑ کے پاس پہنچے تو آپؑ نے اپنے خاندان کے عزیزترین فرد مسلم ابنِ عقیل کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ روانہ کیا۔اہلِ بیتؑ کے شیدائیوں نے جب اہلِ بیتؑ کے نمائندہ مسلم ابن عقیل کو کوفہ روانہ کیا۔اہل بیتؑ کے شیدائیوں نے جب اہلِ بیتؑ کے نمائندہ مسلم ابنِ عقیل کو دیکھا تو ایک مرتبہ ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی' آنکھوں میں خوشی اور محبت کے آنسوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کیا' شاید علیؑ کی عادلانہ حکومت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ہو۔عاشقانِ اہلِ بیتؑ اپنے امامؑ کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے ۔

ادھر بنی امیہ کے دسترخوان کے پروردہ دین فروش لوگوں نے جب اہلِ کوفہ کی یہ مصروفیات اور اپنے امامؑ کے استقبال کے لءے یہ انہماک دیکھا تو انہوں نے فوراً اس کی ایک رپوٹ اپنے

فاسق وفاجر حاکم کو دمشق روانہ کی جس میں والی کوفہ نعمان بن بشیر کی سستی اور کاہلی کی شکایت کرتے ہوئے زیاد ابنِ ابیہ جیسے سخت مزاج شخص کو اس کی جگہ مقرر کرنے کی تجویز پیش کی ۔ یہ خط پڑھ کر یزید پریشان ہو گیا ۔اس کو اپنے باپ کی جگہ سنبھالتے ہی دو پریشانیوں کا سامنا تھا' ایک طرف تو اسے اپنے خلاف حسینؑ ابنِ علیؑ کا قیام پریشان کئے ہوئے تھا' دوسری طرف امام حسینؑ کے قیام و تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ایسے گورنر کی ضرورت تھی جس کے رگ و پے میں اہلِ بیتؑ دشمنی بھری ہوئی ہو ۔اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے سرجون غلام سے کہ جو معاویہ کا مشیر رہ چکا تھا اور مسیحی تھا مشورہ کیا ۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد سرجون کو معاویہ کا وہ حکم نامہ یاد آیا جس کے تحت عبیداللہ ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا جانا تھا اور جو معاویہ کی زندگی میں عملی جامہ نہیں پہن سکا تھا ۔وہ اس حکمنامہ کو یزید کے پاس لایا اور ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کرنے کا مشورہ دیا ۔اگرچہ یزید کو ابنِ زیاد پسند نہیں تھا کیونکہ اس نے یزید کی ولی عہدی کی مخالفت کی تھی لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ حسینؑ ابن علیؑ کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے ابن زیاد جیسے سفاک اور شقی کا کوئی نعم البدل نہیں تھا ۔لہٰذا با دلِ نخواستہ اس نے فوراً اس حکم نامہ پر دستخط کر کے اسے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ ابن زیاد کے پاس بصرہ روانہ کیا ۔

ادھر جیسے ہی یہ تقرر نامہ عبیداللہ ابنِ زیاد کو بصرہ میں ملا' یہ درندہ صفت انسان شیعیانِ اہلِ بیتؑ سے انتقام لینے کے لئے بصرہ کی چیدہ چیدہ جلاد صفت شخصیات کو اپنے ہمراہ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہو گیا اور بصرہ میں اپنی جگہ اپنے بھائی عبداللہ الرحمٰن کو اپنا جانشین مقرر کر دیا ۔ ابن زیاد نے اپنی درندگی کی ابتداء امام حسینؑ کے معصوم صفت سفیر سلیمان ابنِ زرین کے قتل سے کی جنہیں اس نے اثناء راہ میں گرفتار کر کے شہید کیا ۔

عبداللہ ابن زیاد اپنی قبیح سیرت میں اپنے باپ کا صحیح وارث اور دغابازی اور مکر و فریب کی سیاست میں اپنی مثال آپ تھا ۔ وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اپنے ہمراہیوں کو بھی پیچھے

چھوڑتا ہوا کوفہ کی طرف روانہ ہوا تا کہ حسینؑ ابنِ علیؑ کے کوفہ پر قبضہ کرنے سے پہلے خود کوفہ پہنچ جائے اور کوفہ پر کنٹرول کر کے حالات کو یکسر بدل دے ۔ ابن زیاد شیعیانِ علیؑ اور کوفہ کے متغیر حالات سے بہت ڈرا ہوا تھا اس لئے فریب کاری کے ساتھ کوفہ میں داخل ہونا چاہتا تھا ۔ چنانچہ وہ باب بصرہ کی بجائے باب حجاز سے کوفہ میں داخل ہوا اور اپنے اصل علیہ میں نہیں بلکہ اپنا لبادہ اتار کر حسینؑ ابن علیؑ کے حلیہ میں اپنا چہرہ چھپاتا ہوا کوفہ میں داخل ہوا ۔یہ ۶۰ ہجری کے آخری ایام میں عالمِ انسانیت کو ہمیشہ کے لئے سوگوار بنانے کے لئے کوفہ میں وارد ہوا ۔

کوفہ معاشرتی طور پر تین حصوں میں بٹا ہوا تھا ان میں سے دو گروہ کوفہ کی قیادت اور رہبری کے دعویدار تھے' لیکن ان دونوں گروہوں سے تعلق نہ رکھنے والے بقیہ لوگ حالات اور اپنے مفادات و رجحانات کو سامنے رکھ کر کسی کی حمایت یا مخالفت کا فیصلہ کرتے تھے ۔جب کوفہ میں امام حسینؑ کے حق میں حالات سازگار ہوئے اور لوگوں نے ان کی رہبری و قیادت کی حمایت کا اعلان کیا تو اس گروہ کے بہت سے لوگ امام حسینؑ کی جانب مائل ہو گئے ۔ لیکن عبیداللہ ابن زیاد کی آمد اور حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد جب ان لوگوں نے بنی امیہ کا پلہ بھاری دیکھا تو ان کی جانب مائل ہو گئے ۔

کوفے کی معاشرتی ترکیب

دنیا کے بہت سے خطے ایسے ہیں جہاں مذہبی اور قومی لحاظ سے غالب اکثریت ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ بعض علاقوں میں مختلف طبقات اور قومیت کے لوگ رہتے ہیں ۔کوفہ وہ اسلامی شہر ہے جہاں مختلف قومیت اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے تھے ۔ یہاں کسی قوم اور قبیلہ کو دیگر تمام قبائل پر اکثریت حاصل نہیں تھی ۔ہم یہاں کوفہ کی اجتماعی ترکیب کا ایک مختصر جائزہ لیں گے ۔

مذہبی ترکیب

یہودی

لفظ یہود ُھود سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں آہستہ رجوع کرنا ۔عرفِ عام میں یہ توبہ کے معنوں میں آتا ہے ۔یہودیوں نے یہ نام سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۶ سے لیا ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ۔

"وفی الاخرۃ انا ھدنا الیک"

"اور آخرت میں بے شک ہم تیری طرف رجوع ہوئے۔"

اس لحاظ سے یہ ایک اچھا لفظ ہے ۔لیکن شریعتِ توریت سے انحراف کے بعد وہ اس لفظ کے اہل نہیں رہے ۔لیکن آج کل جو بھی صحیح راستے سے ہٹ جاتا ہے اسے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی ہو گیا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کے فرزند کا نام یہودا تھا جو حضرت یوسفؑ کے پدری بھائی تھے۔

کوفہ میں وہ یہودی بھی رہتے تھے جنہیں مدینہ اور حجاز سے اس لئے نکالا گیا تھا تاکہ مدینہ میں اسلامی حکومت ان کی سازشوں سے محفوظ رہے ۔وہ یہودی یہاں آ کر آباد ہوئے لیکن اپنی فطری خباثت اور مجرمانہ ذہنیت یہاں بھی ساتھ لے کر آئے ۔

نصاریٰ

نصاریٰ نصر اور نصرت سے مشتق ہے جو اعانت اور مدد کے معنوں میں آتا ہے ۔نصاریٰ کو نصاریٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے حوارین سے کہا کہ -----"کون ہے جو خدا کی راہ میں میری مدد کرے ۔"تو حوارین نے کہا کہ "ہم آپ کے مددگار ہیں ۔"بعض نے کہا ہے کہ "نصرانہ" ایک قریہ کا نام ہے جس کی وجہ سے ان کو نصاریٰ کہتے ہیں۔

نصاریٰ ۔عقائد کے لحاظ سے تثلیث کے قائل ہیں ۔ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے لیکن وہ تین سے مرکب ہے ۔یعنی اب ٗ ابن ٗ روح القدس ۔

نصاریٰ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن پیغمبرِ ختمی مرتبتؐ کی نبوت کے منکر ہیں ۔

کوفہ میں نصاریٰ کے دو گروہ آباد تھے ۔

(۱) نصارائے تغلب ۔

(۲) نصارائے نجران ۔

ان دونوں گروہوں نے ولید ابنِ عقبہ کے دورِ حکومت میں کوفہ میں آ کر سکونت اختیار کی ۔یہ لوگ یہاں اس قدر نفوذ حاصل کر چکے تھے کہ مسجدِ کوفہ کے انتظامی امور میں ایک نصرانی بھی عمل دخل رکھتا تھا ۔کوفہ کے زندان کا انچارج ایک نصرانی تھا ۔اس کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری کا کاتب بھی ایک نصرانی تھا۔

صابیہ

لغت میں "صحابی" یا "صابیہ" اسے کہتے ہیں جو اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو اپنائے ۔فرید وجدی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ صابیہ فرقہ کے لوگ کائنات کا خالق خدا کو مانتے ہیں لیکن توسّل اور واسطے کے لئے فرشتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں ۔چونکہ خدا کی پرستش چھوڑ کر انہوں نے فرشتوں یا ستاروں کی پرستش شروع کی اس لئے ان کو "صابی" یا "صابیہ" کہا جاتا ہے یا اس فکر کی اختراع کرنے والوں کا نام "صبا" ہے۔

قرآنِ کریم میں تین جگہ ----سورۂ بقرہ آیت نمبر ۶۲ ٗ سورۂ مائدہ آیت نمبر ۶۹ اور سورۂ حج آیت نمبر ۱۷ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ صابئین کا ذکر ہوا ہے ۔قرآنِ کریم میں بار بار اس فرق کا ذکر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت یہ لوگ کثرت سے پائے جاتے تھے ۔بہر حال کوفہ میں اس فرقہ کے لوگ بھی موجود تھے ۔

مجوس

مجوس یونانی زبان کا لفظ ہے ۔پہلوی زبان میں اسے ''مغ'' کہتے ہیں ۔یہ زرتشتی مذہب ہے جس کے ماننے والے زرتشتی ہونے سے پہلے قدیم زمانے میں دو مبداء کے قائل تھے ۔

(۱) نور و ظلمت ۔

(۲) یزدان و اہرمن ۔

لیکن شہرستانی نے زرتشتی اور مجوس کو الگ الگ قرار دیا ہے ۔(نقل از فرہنگِ معین)

قومیت کے لحاظ سے ترکیب

قومیت کے لحاظ سے یہاں مندرجہ ذیل قومیتوں کے لوگ آباد تھے ۔

(۱) ترک ---- جو ترکی سے تعلق رکھتے تھے ۔

(۲) کرد

(۳) فارس ----- ایران سے تعلق رکھنے والوں کی ایک اکثریت یہاں آباد تھی ۔

(۴) رومی ۔روم سے تعلق رکھنے والے ۔

(۵) سریانون ۔

(۶) موالی ۔

۱۴ ہجری میں فتح قادسیہ کے موقع پر چار ہزار ایرانی زہرا بنِ جو کی بیعت میں اسلامی لشکر سے آملے تا کہ ان کے ہمرکاب ہو کر ان کے مخالفین سے جنگ کریں ۔ان کو حمرا کہتے تھے ۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ اسود و حمراء پر مبعوث ہوا ہوں ۔یہاں حمرا سے مراد سرخ نہیں بلکہ حمرا سے مراد سفید ہے ۔ان لوگوں نے اسلامی فوجی قیادت کے ساتھ یہ معاہدہ طے کیا کہ جب تک جنگ جاری رہے گی یا آئندہ جب بھی کسی جنگ کے بعد وہ آزاد ہوں گے اور جس شخص یا جس قبیلہ کے ساتھ چاہیں وہ معاہدہ کرنے میں آزاد ہوں گے ۔نیز یہ کہ جنگ کے مالِ غنیمت میں سے انہیں بھی حصہ ملے گا ۔چنانچہ جنگِ قادسیہ کے بعد ان لوگوں نے کچھ قبائل کے ساتھ معاہدہ بھی

کیا ۔لہٰذا جس قبیلہ کے ساتھ وہ معاہدہ کرتے تھے اسی قبیلہ کے وہ موالی کہلاتے تھے ۔اسی مناسبت سے اسلام قبول کرنے کے بعد ایران سے عرب میں آنے والے گروہ اور قبائل کو موالی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا ۔یہ لوگ دوسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے تھے ۔ان لوگوں کا کام تجارت 'دوکانداری' لوگوں کو راستہ بتانا تھا ۔بنی امیہ کے دور میں اس گروہ کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔

عقیدہ مذہب اور ایمان سے ہٹ کر بھی یہ اپنے ہم پیانوں کے ساتھ جنگوں میں شرکت کرتے تھے ۔ ۱۷ ہجری سے ۶۰ ہجری تک کوفہ میں بہت بڑی تعداد میں موالی موجود تھے ۔ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے انصار و اعوان کے ذکر کے موقع پر جب موالیان کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ موالیان ہی ہوتے ہیں ۔

جن موالیان نے امام حسینؑ کے لشکر میں شمولیت اختیار کی اور ان کی نصرت میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے ان کے نام یہ ہیں ۔

(۱) ۔سلیمان مولی الحسین ۔

(۲) ۔قارب الدئلی مولی الحسین ۔

(۳) ۔الحارث بن نبھان مولی الحمزہ بن عبدالمطلب ۔

(۴) ۔نجح مولی الحسین ۔

(۵) ۔عامر بن مسلم مولی السالم ۔

(۶) ۔جابر بن الحجاج مولی العامر بن نہشل ۔

(۷) ۔سعد مولی العمر بن خالد صیداوی ۔

(۸) ۔رافع مولی الاحل شنوہ ۔

(۹) ۔شوذب مولی الشاکر بن عبداللہ ہمدانی شاکری ۔

(۱۰)۔اسلم ترکی مولی الحسین۔

(۱۱)۔جون مولی ابی ذر غفاری۔

(۱۲)۔زاہر مولی العمرہ بن خزاعی۔

سیاسی لحاظ سے ترکیب

کوفے کی آبادی سیاسی اعتبار سے مندرجہ ذیل فکر اور سوچ رکھنے والوں سے تعلق رکھتی تھی۔

خوارج

خوارج مادۂ خروج سے سے لیا گیا ہے۔جو چیز اپنے دائرہ یا حد سے نکلے اسے خروج کہتے ہیں۔اصطلاحِ مذہب میں خارجی یا خوارج اس فرقہ اور گروہ کو کہتے ہیں جو اپنے اس امام کے خلاف بغاوت کرے جس کی وہ بیعت کر چکا ہے اور جس کی اطاعت کا وہ معاہدہ اور اعلان کر چکا ہے۔

یہ گروہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں وجود میں آیا۔آپؑ کے دورِ خلافت میں ایک ایسے ہی گروہ نے آپؑ کے خلاف بغاوت کی۔جنگِ صفین میں معاویہ اور علیؑ کے درمیان جنگ ہوئی۔جب جنگ علیؑ کے حق میں اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی اور علیؑ کے لشکر کو کامیابی ہونے ہی والی تھی کہ عمرو ابنِ عاص نے اپنے ابلیسی مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو قرآن ہی کے ذریعہ اسلام و قرآن کی راہ سے منحرف کرنے کے لئے قرآن کو نیزوں پر بلند کیا اور شاطرانہ چال چلتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم اس جنگ کا فیصلہ قرآن کے ذریعہ کریں گے کہ خلافت ِاسلامی کا مستحق معاویہ ہے یا علیؑ یہ معاویہ، عمرو ابنِ عاص اور ابن ابی معط کی ملی جلی ایک شیطانی سازش تھی۔حضرت علیؑ نے ہر ممکن کوشش کی کہ لوگ اس سازش کے جال میں نہ آئیں اور اب ایسے موقع پر کہ جب فتح و نصرت علیؑ کے لشکر کے قدم چومنے ہی والی تھی، لوگ معاویہ کے خلاف جنگ سے ہاتھ نہ روکیں۔لیکن ایک بڑے گروہ نے علیؑ کے اس فیصلے کو قبول نہ کیا اور اس کے برخلاف اس سازشی ٹولے کے فیصلے کو قبول کرنے کے لئے علیؑ کا گھیراؤ کر لیا۔حضرت علیؑ کو با دلِ نخواستہ ان سازشیوں کے اس فیصلے کو قبول کرنا پڑا کہ حکم تسلیم کر لیا جائے۔ابو موسیٰ اشعری عمرو ابن عاص اور معاویہ کا لشکر شام اور علیؑ کا لشکر کوفہ واپس چلا جائے۔ابو موسیٰ اشعری اور عمرو ابن عاص کو حکم تسلیم کر لینے کے بعد یہی گروہ کہ جس نے حضرت علیؑ کو حکمین کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا پشیمان ہو کر اپنے موقف سے پھر گیا اور حکمین کو تسلیم کر لینے کا مجرم بھی علیؑ ہی کو قرار دینے لگا اور کہنے لگے کہ ہم نے حکمین کو تسلیم کر کے گناہ کیا لیکن علیؑ نے بھی یہ گناہ کیا۔اس کے ساتھ علیؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ پھر میدان جنگ میں واپس جائیں اور معاویہ سے دوبارہ جنگ شروع کریں۔حضرت علیؑ نے کہا کہ اب جب کہ ان کے منع کرنے کے باوجود حکمین کو تسلیم کیا جا چکا ہے وہ اس وقت تک جنگ نہ کرنے کے پابند ہیں جب تک کہ حکمین کا فیصلہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ہاں! اگر حکمین کا فیصلہ قرآن کے خلاف ہوا تو معاویہ کے خلاف جنگ کا جواز بنتا ہے۔لیکن اس گروہ نے علیؑ کی اس منطق کو قبول نہیں کیا بعض اپنے موقف سے ہٹ گئے اور بعض اصرار کرتے رہے۔انکے اصرار کے نتیجے میں خوارج کے خلاف جنگِ نہروان وجود میں آئی۔اس جنگ میں نو (۹) افراد کے سوا تمام خارجی گروہ قتل ہو گیا۔خوارج کی فکر ان باقی ماندہ نو افراد کے ذریعہ پرورش پاتی رہی یہاں تک کہ ۴۱ ہجری سے ۶۱ ہجری تک بیس سال کے عرصے میں اس منحوس فکر کی حامل خوارج کی ایک اچھی خاصی نئی نسل ابھر کر سامنے آئی اور ۶۱ ہجری میں کربلا میں اس گروہ کی ایک خاص تعداد نے امام حسینؑ کے خلاف جنگ کی۔

اموی

اموی نسلِ امیہ بن عبد الشمس بن عبد مناف سے تعلق رکھنے والوں کو کہا جاتا ہے۔مروان بن حکم، ابوسفیان، عثمان بن عفان تینوں امیہ بن عبد الشمس سے تعلق رکھتے تھے، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف مسلسل جنگ وجدال کے بعد فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان، مروان اور اس کا باپ اسلام

کے دائرے میں شامل ہوگئے۔ حضرت عثمان کی خلافت کے دوران اس حزب کو مراکزِ اسلامی میں اعلیٰ عہدوں پر فائض ہونے اور حزبِ اموی کو تقویت دینے کا موقع ملا۔ کوفہ میں بھی ولید ابن عقبہ، سعید ابن عاص، مغیرہ ابن شعبہ اور زیاد ابنِ ابیہ کے توسط سے اس حزب کو خاصی تقویت ملی۔ اگرچہ افرادی طور پر یہ کم ہی کیوں نہ رہے ہوں لیکن اقتدار پر قابض ہونے کی وجہ سے یہ لوگ طاقت رکھتے تھے۔

کوفہ اور شیعہ

لوگوں میں ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ کوفہ کی تمام آبادی شیعہ تھی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر شیعوں کے مخالفین کھل کر یہ پروپیگنڈہ کرتے نظر آتے ہیں کہ اہلِ کوفہ تمام کے تمام شیعہ تھے، انہوں نے ہی امام حسینؑ کو بلایا اور بلا کر قتل کر دیا۔ اپنے اس پروپیگنڈے کی دلیل میں وہ کہتے ہیں کہ جب اسیرانِ آلِ محمدؐ کا قافلہ کوفہ پہنچا تو کوفہ میں شیعوں نے گریہ وبکاء کر کے اپنے فعل پر ندامت و پشیمانی کا مظاہرہ کیا، اس کے علاوہ ہر سال ایامِ عزاء میں شیعہ ماتم و مجلد برپا کر کے، سینہ زنی کر کے اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس الزام کی رد میں بعض شیعہ حضرات نہایت کمزور اور بے بنیاد دلائل پیش کرتے ہیں اور ان اہل کوفہ کی شیعیت ہی سے سرے سے انکار کرتے ہیں جنہوں نے شہدائے کربلا کے سرہائے مقدس اور کربلا کے اسیروں کی کوفہ آمد کے موقع پر اپنے غم واندوہ کا اظہار کیا۔ شیعوں کے مخالفین کی طرف سے یہ الزام اور اس الزام کی رد میں شیعوں کی طرف سے کمزور استدلال دونوں ہی اسلام اور تاریخ اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو تاریخی حقائق کی روشنی میں حل کیا جائے۔

شیعہ اور شیعہ کی تعریف

لغت میں میں لفظ ''شیعہ' متابعت اور موالات کے معنوں میں آیا ہے۔ اصطلاحِ دین ومذہب میں کسی کا صحابی وانصار یا کسی شخصیت کے حزب میں شامل ہونے والوں کو اس کا شیعہ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ دیگر دوسرے لفظوں کی مانند اپنے مفاہیم میں افراط وتفریط کا شکار رہا۔

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت سے لے کر آج تک اس لفظ کا اطلاق مختلف ادوار میں درجِ ذیل گروہوں پر ہوا۔

(۱) پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کی جانشینی کے سلسلے میں فکریں ابھر کر سامنے آئیں۔ ان میں ایک فکر کے حامل وہ لوگ تھے جو پیغمبر اکرمؐ کی واضح ہدایت اور نص کی روشنی میں حضرت علیؑ کو آپؐ کا جانشین اور خلیفہ بلافصل مانتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ شیعیانِ علیؑ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس کے مقابلے میں دوسری فکر کے حامل لوگ صرف پیغمبرؐ کی نص کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سلسلے میں عوام کی رائے کو مقدم اور ضرور سمجھتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ ''عامۃ المسلمین'' کہلائے۔

(۲) حضرت عمر کی خلافت کے بعد پیغمبرؐ کی جانشینی کے مسئلے کو شوریٰ کے سپرد کیا گیا۔ ان میں سے ایک گروہ نے حضرت علیؑ کی حمایت کی اور دوسرے گروہ نے حضرت عثمان کے حق میں اپنی رائے دی۔ چنانچہ جن لوگوں نے حضرت علیؑ کی حمایت کی وہ ''شیعیانِ علیؑ'' کہلائے۔ اگرچہ یہ لوگ حضرت علیؑ کو خلیفہ بلافصل نہیں بلکہ تیسرے نمبر پر ان کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے حضرت عثمان کی حمایت کی وہ ''شیعیانِ عثمان'' کے نام سے موسوم ہوئے۔

(۳) حضرت عثمان کے قتل کے بعد حضرت علیؑ متفقہ طور پر خلیفہ منتخب ہوئے، لیکن طلحہ اور زبیر نے حضرت کی بیعت کر کے اسے توڑ ڈالا جب کہ حضرت عائشہ اور معاویہ نے بیعت سے روگردانی کی اور آپؑ کے مقابلے پر نکل کر آئے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جن لوگوں نے حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ مانتے تھے۔ جب امام حسینؑ نے قیام کیا یہ تینوں قسم کے شیعہ بنی امیہ کے خلاف امام حسینؑ کے حق میں تھے۔ لہٰذا اس وقت کے جن شیعوں پر بے وفائی کی تہمت لگائی جاتی ہے وہ وہ شیعہ نہ تھے جو حضرت علیؑ کو خلیفہ بلافصل مانتے ہیں۔

(۴) بعد میں رفتہ رفتہ وہ تمام لوگ جو ائمہ اور اہل بیت علیہم السلام سے مودت اور محبت رکھتے تھے

اور رکھتے ہیں وہ سب شیعیانِ علیؑ کہلاتے ہیں حالانکہ وہ ائمہؑ سے چھینی گئی حکومت کو واپس دلانے کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی کوشش اور سعی نہیں کرتے بلکہ حکومت اور اقتدار کو ان کے لئے ’’شجرِ ممنوعہ‘‘ سمجھتے ہیں۔

چنانچہ پیغمبر ختمی مرتبتؐ کی رحلت سے لے کر آج تک گروہ شیعہ کے یہ چار تصور پائے جاتے ہیں اور یہ چاروں گروہ شیعیانِ علیؑ کہلاتے ہیں۔

کوفہ میں اگر چہ شیعیت کی بنیاد سلمان، عمار یاسر، حذیفہ یمانی اور عبداللہ مسعود وغیرہ کے توسط سے پڑی لیکن امیر المومنین امام علیؑ اور امام حسنؑ کے دورِ خلافت میں شیعیت کے خدوخال ابھر کر سامنے آئے اور امت کو ان سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ بعد میں بنی امیہ اور بنی امیہ نواز افراد کی غیر اسلامی حرکتیں بھی لوگوں کے شیعیت کی طرف مائل ہونے کا سبب بنیں لہٰذا کوفہ میں شیعوں کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی تھی۔

چنانچہ شیعہ ایک سیاسی حزب اور پارٹی کا نام ہے اور ہر حزب اور پارٹی ہمیشہ متغیر رہتی ہے اور اس کے متغیر ہونے میں حکومت اور حکمرانوں کا ایک بڑا کردار رہتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ کوفہ کی تمام آبادی شیعہ تھی صحیح نہیں ہے بلکہ اہلِ کوفہ کی فکر پر حکومت وقت کا ہمیشہ اثر رہا۔ اس کے علاوہ بھی کوفہ کی آبادی مختلف المذاہب اور مختلف الفکر لوگوں پر مشتمل تھی جیسا کہ ’’کوفہ کی معاشرتی ترکیب‘‘ کے عنوان سے متعلق موضوع میں بیان کیا گیا۔

فوجی تقسیم بندی

جنگ کرنے والی فوج درج ذیل قبائل پر مشتمل تھی۔

(۱) قبیلہ کنانہ اور اس کے حلیف۔

(۲) قضاعہ اور غسان اور ان کے حلیف۔ مزحج، حمیر، ہمدان، اُن کے خلفاء غطفان، ذبیان، طبعہ، تغلب، عبد شمس، بنی طی، قبائل یمانی۔

اقتصادی تقسیم بندی

علم، اقتصاد اور سیاست وہ تین اہم ستون ہیں جن پر کسی ملک و مملکت کی خوشحالی اور سعادت کی زندگی کا محل قائم ہے۔ ان تینوں عنصر کا ایک دوسرے سے کتنا ربط ہے اور ان میں سے کسی عنصر کا کردار کتنی اہمیت اور کتنی فوقیت کا حامل ہے یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ لیکن کسی معاشرے میں اقتصادی بدحالی اور فقر و محرومیت، مہلک جسمانی امراض، طبیعی آفات وحوادث سے کسی طور پر کم نہیں۔ انسانی معاشرے میں فقر و فاقہ کی مصیبت کے عوامل میں طبیعی اور قدرتی وسائل کی کمی سے زیادہ خود بنی نوع انسان کے ظلم وخیانت کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ علماء اقتصاد معاشرے کی اقتصاد بدحالی کے اسباب و علل میں دو عوامل کو اہم سبب گردانتے ہیں۔

(۱) پیداواری قلت۔

(۲) غیر عادلانہ و ظالمانہ تقسیم۔

فقر و محرومیت میں پیداواری قلت سے زیادہ غیر عادلانہ و ظالمانہ تقسیم اہم کردار رکھتی ہے۔ جہاں تک پیداواری قلت کا تعلق ہے تو اس کی ایک وجہ جہل، نادانی اور زمینی ذخائر اور طبیعی وسائل کی موجودگی سے ناآشنائی اور لاعلمی ہے۔ اور دوسری وجہ غیر عادلانہ تقسیم ثروت ہے جس کی وجہ سے دولت چند مخصوص ہاتھوں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنی پسند اور مرضی کے حکمران کو وجود میں لاتا ہے یا سیاست دان ہی اپنے بُرے عزائم، بدنیتی، ظلم وستم کی بناء پر اکثریت سے ملکی ثروت کو چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں؟

پہلی صورت میں سیاست اقتصادی کی پیداوار کہلائے گی جب کہ دوسری صورت میں اقتصاد سیاست کی پیداوار کہی جائے گی۔ اس معاشرتی ناانصافی کے لئے سیاست دان کو قصوروار اور ذمہ دار قرار دیا جائے یا سرمایہ دار کو؟ دو اور دو چار کے اصولوں پر ان دونوں میں سے

کسی ایک کو یا ہر وقت اور ہر جگہ ان دونوں کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔اس سیاسی بازیگری کی چند انواع ہیں۔

(۱) اس سیاسی بازی گری میں ملکی اقتصاد کی قسمت سیاستدانوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔یہ لوگ حکومت کے کاسہ لیسوں کے لئے اقتصاد کے دروازے کھلے رکھتے ہیں اور دوسروں کے لئے اقتصادی خوشحالی کے دروازے بند کرتے ہیں۔ظاہر ہے ایسی حکومت سرمایہ داروں کے ہاتھوں ہی میں ہوتی ہے۔

(۲) کبھی ظالم اور بدنیت حکمران ملکی معیشت تباہ کرنے کے لئے ظالمانہ بڑے بڑے ٹیکس عائد کرتے ہیں جس کی وجہ سے چھوٹے کاروباری لوگ معاشی طور پر مفلوج ہوکر رہ جاتے ہیں۔

لہٰذا قطعی طور پر سیاست دانوں اور سرمایہ داروں میں سے کسی ایک کو یا ہمیشہ اور ہر جگہ دونوں کو اقتصادی بدحالی کا ذمہ داروں میں سے کسی ایک کو یا ہمیشہ اور ہر جگہ دونوں کو اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہوگا۔

جہاں تک کوفہ کا تعلق ہے وہاں چونکہ شیعوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ بنی امیہ سے نفرت اور بیزاری رکھتے تھے اس لئے بنی امیہ کے حکمرانوں اور بنی امیہ نواز لوگوں نے اہل کوفہ کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا رکھنے کی غرض سے کوفہ کی اقتصاد کو چند مخصوص افراد کے ہاتھوں میں دیا ہوا تھا تاکہ وہ افراد حکومت کے مفادات کا تحفظ کریں اور اس میں معاویہ کی حکومت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

اقتصادی طبقہ بندی کے لحاظ سے اہلِ کوفہ کی تقسیم بندی کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) وہ طبقہ جو فقر و فاقہ اور محرومیت کا شکار تھا اور جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔یہ لوگ شیعیانِ اہلِ بیتؑ تھے جو بنی امیہ کی حکومت کی ظلم کی چکی میں مسلسل پس رہے تھے۔

(۲) ایک طبقہ ایسے لوگوں کا تھا کہ جو تھوڑی بہت ملکیت اور چھوٹی موٹی معمولی جائیداد بھی رکھتا تھا لیکن اپنے اصولوں اور اپنے دین کی خاطر امام حسینؑ کا ساتھ دے کر بنی امیہ کی حکومت

کے ہاتھوں اپنی تھوڑی بہت جائیداد اور ملکیت سے محروم ہونے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔چنانچہ کربلا کے واقعہ میں بیشتر ایسے افراد نظر آتے ہیں جنھوں نے امامؑ کا ساتھ نہ دینے کی یہ توجیہ کی کہ انہیں خوف ہے کہ قیامِ امام حسینؑ میں ان کا ساتھ دینے کی صورت میں وہ آپنے گھربار اور جائیداد سے محروم ہوجائیں گے اور حکومت وقت ان کی جائیداد کو قومی ملکیت میں لے لے گی۔

(۳) کوفہ میں ایک بڑے طبقہ کی گزر اوقات صرف جنگی غنائم پر ہوتی تھی۔یہ لوگ پیشہ ورانہ جنگجو تھے اور اپنی روزی کمانے کے لئے ہمیشہ کسی جنگ کے اعلان کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

(۴) اس کے علاوہ ایک بڑا طبقہ وہ تھا جن کو بنی امیہ کی حکومت نے بھاری بھاری مالی اور سیاسی رشوتیں دے کر خریدا ہوا تھا اور انہوں نے اپنا دین وایمان سب کچھ حکومتِ وقت کے ہاتھوں فروخت کیا ہوا تھا۔

(۵) کوفہ میں گنتی کے چند افراد ایسے تھے جو کوفہ کی پوری اقتصاد پر حاوی تھے اور ملکی مقدرات اور ثروت ان کے ہاتھوں میں تھی جیسے عمرو ابنِ حریث اور شبث ابن ربعی وغیرہ جن کا شمار کوفہ کے جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔

جب اقتصادی صورتِ حال ایسی ہو تو فقر و فاقہ سے مجبور اور محرومیت کے شکار لوگوں سے کیسے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے دین و ایمان کے لئے کسی استقامت کا مظاہرہ کرسکیں سوائے ان معدودے چند شخصیتوں کے جو اپنے عقیدے میں راسخ اور اپنے ایمان میں کامل تھیں جو اصول اور دین کی خاطر کسی محرومیت کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں اور ہر فقر و فاقہ اور تنگ دستی کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھیں۔

فکری اور نظریاتی لحاظ سے تقسیم بندی

فکری اور نظریاتی لحاظ سے درج ذیل فکر کے حامل افراد یہاں رہتے تھے۔

جبریہ

جبریہ مادہ جبر سے لیا گیا ہے۔جبر لغت میں کسر کی ضد ہے۔کسر کے معنی ٹوٹنا ہے۔

اصطلاح میں جبریہ ایک مذہب اور فکر کا نام ہے ۔اس مذہب اور فکر کے حامل افراد کے مطابق انسان جو کچھ کرتا ہے ۔یا اسے جو کچھ پیش آتا ہے اس میں انسان کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا بلکہ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ ازل سے اس کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے جس کے خلاف وہ کچھ نہیں کرسکتا۔فرقہ جبریہ کا اعتقاد ہے کہ کسی بھی حادثہ کی تفسیر و توجیہ اسباب و علل کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے ارادے اور اختیار سے نہیں کرتا بلکہ چونکہ ازل سے اس کی تقدیر میں لکھا ہوا ہوتا ہے اس لئے وہ جو کچھ کرتا ہے اسے کرنے پر مجبور ہے اور اپنا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

جبریہ اور قدریہ دونوں مذہب قریب المعنی ہیں۔غرض اس مذہب کے تحت انسان اور جمادات میں کوئی فرق نہیں ۔اس مذہب اور فکر کی بنیاد معاویہ اور معاویہ کے دسترخوان پر بیٹھنے والے درباری علماء نے رکھی ۔اگرچہ اس مذہب و فکر کو فروغ بعد میں ملا۔چنانچہ شہدائے کربلا کے سرہائے مقدس اور اسیرانِ اہلِ بیتِ اطہارؑ کو کوفہ میں دارالامارہ میں ابنِ زیاد کے اور دمشق میں یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو ان دونوں ملعونوں نے قاتلانِ حسینؑ اور شہدائے کربلا کے قاتلوں کو خدا کی طرف نسبت دی ۔یعنی معاذاللہ چونکہ خدا نے ازل سے ان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا تھا اس لئے وہ مجبور تھے کہ ان کو قتل کردیں ۔یعنی وہ اپنے فعل اور ارادے میں مختار نہیں تھے۔

معاویہ کے دورِ خلافت میں اس فرقہ کی بڑی تعداد کوفہ میں پائی جاتی تھی ۔آج بھی اس فکر کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں۔

مرجیہ

مذہب ''مرجیہ'' معاویہ کی خلافت کے دوران وجود میں آیا۔''مرجیہ'' لفظ ''ارجاء'' سے

لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں فیصلے اور حکم میں تاخیر کرنا ۔چنانچہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۶ میں ہے کہ۔

''واٰخرون مرجون لامرِ اللہ امایعذبھم وامایتوب علیہم'' ''اور جو کچھ (لوگ) موقوف رکھے گئے ہیں اللہ کے حکم پر کہ اللہ ان پر عذاب کرے یا ان کی توبہ قبول کرے۔''

معاویہ کی خلافت کے دوران اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے ایک مذہب وجود میں لایا گیا جس کی رو سے خلیفۂ وقت اور خلیفہ سے مربوط وہ حکمران جو دین و شریعت کی پابندی نہیں کرتے تھے یا دین و شریعت کے خلاف جو کچھ بھی عمل کرتے تھے اس پر ان کے خلاف کوئی تنقید و اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی عوام ایسے بدکردار خلیفہ اور حکمران کو برطرف کرنے کا مطالبہ کرسکتے تھے۔اس طرح یہ مذہب سیاسی ''نظریہ ضرورت'' کے تحت معاویہ کی خلافت کے دور میں وجود میں لایا گیا تا کہ اس کی حکومت کو دوام اور استحکام بخشا جاسکے ۔اس مذہب کے ذریعہ عوام کی سوچ اور فکر پر یہ کہہ کر تالے ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ امت کی قیادت و رہبری کے لئے جو شخص کسی بھی طرح منتخب ہو کر امت کی قسمت پر ایک مرتبہ مسلط ہو جائے اس کے گفتار و کردار پر کسی قسم کی تنقید اور تنقیص نہ کی جائے اور اس کی بازپرس کا مسئلہ خدا پر چھوڑ دیا جائے وہ خود ہی قیامت کے دن ان سے حساب لے گا۔

اگرچہ ابتدا میں بنی امیہ اس مذہب کو اپنے تحفظات کے لئے وجود میں لائے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس فکر نے اتنی وسعت پائی اور یہاں تک پہنچی کہ انسان کتنا ہی بڑا جرم و گناہ کرے وہ جرم و گناہ انسان کے ایمان کو کوئی نقصان و ضرر نہیں پہنچا سکتا' کوئی شخص کتنا ہی بڑا گناہ گار اور مجرم کیوں نہ ہو اسے جہنمی نہیں کہا جاسکتا۔یہاں تک کہ بعض شیعوں میں بھی یہ فکر راسخ ہو چکی ہے کہ اہل بیتؑ کی محبت اور ولایت کے ساتھ کوئی بھی گناہ نقصان دہ نہیں ہے ۔یہ فکر اتنی خطرناک ہے کہ اگر اس کو تسلیم کرلیا جائے تو دین و شریعت کی ساری اساس متزلزل ہو کر رہ جائے اور دین و شریعت ایک ڈھونگ اور کہانی بن کر رہ جائے۔

اس گروہ کے حامی افراد بھی کوفہ میں پائے جاتے تھے۔

جیسا کہ کوفہ کی معاشرتی ترکیب کے سلسلے میں واضح کیا گیا کوفہ خطہ اسلامی میں ایک منفرد جگہ تھی۔ یہاں ایک فکر کے افراد نہیں بستے تھے بلکہ مختلف افکار، سوچ اور خیالات رکھنے والے لوگ یہاں پائے جاتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں فکری رشد کی زیادہ گنجائش تھی اور زیادہ مواقع تھے۔ مذہبی لحاظ سے یہاں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے لوگ پائے جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ کسی ایک دین کے ماننے والے نہیں تھے اگرچہ اکثریتی اور حکومتی مذہب مسلمانوں ہی کا تھا۔ دیگر مذاہب وملل کے افراد حکومتی مذہب کے پابند اور تابع تھے۔ جیسا کہ اس وقت ایران میں یہود، نصاریٰ، زردشتی، حنفی اور شافعی تمام مذاہب کے لوگ موجود ہیں اور ان سب کے لئے ایران کے ولی امر کو اپنا رہبر تصور کرنا ضروری ہے۔ ملک کے لئے درپیش مسائل، حوادث اور واقعات میں وہ سب کے سب مرکزی سیاست کے تابع ہیں حالانکہ جب بھی انہیں موقع ملے اور ان کے لئے حالات سازگار رہوں تو ممکن ہے کہ یہ لوگ اپنا اندرونی خواہشات اور امنگوں کو سامنے لائیں۔

اسی طرح کوفہ کے لوگ بھی مرکزی حکومت کے تابع تھے اور اکثریتی فیصلے کے پابند تھے۔ اگر اکثریت حسینؑ کو چاہتی تو وہ بھی چار و نا چار حسینؑ کو چاہنے پر مجبور ہوتے حالانکہ موقع ملنے پر وہ اپنی ہی امنگوں کو ترجیح دیتے۔

انتخاب کوفہ

بلدِ امین مکہ مکرمہ جب رسولِ امینؐ کے نواسہ کے لئے جائے امن نہ رہا جیسا کہ خود فرزند رسولؐ نے فرمایا کہ میں اگر مکہ سے نہ نکلتا تو بنی امیہ کے لوگ مجھے قتل کر دیتے تو اب یہ سوال ہی اپنی جگہ غلط ہے کہ امام حسینؑ نے بلدِ امین کو کیوں چھوڑا۔ مکہ اب حسینؑ کے لئے بلدِ امین کو کیوں چھوڑا۔ مکہ اب حسینؑ کے لئے بلدِ امین رہا کہاں؟ اس لئے عقل و شریعت دونوں کا یہی

تقاضہ تھا کہ حسینؑ اب کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جو ان کے لئے نسبتاً محفوظ ہو۔

اس سلسلے میں قدیم زمانے سے لے کر جدید دور تک کے علماء، مفکرین اور محققین امام حسینؑ کے کوفہ کو منتخب کرنے کی توجیہہ میں درج ذیل چند دلائل پیش کرتے ہیں۔

(ا)۔ اہلِ کوفہ کی دعوت اور ان کے خطوط

مکہ میں قیام کے دوران اہل کوفہ کے بارہ ہزار سے زیادہ خطوط امامؑ کو مل چکے تھے اس کے علاوہ بہت سے نمائندے امامؑ سے آ کر ملے۔ ان سب کا تقاضا یہی تھا کہ۔۔۔

”ہمارے لئے کوئی امام نہیں ہے، آپؑ کوفہ آئیں اور قیادت سنبھالیں۔“

اگرچہ ایک بڑا گروہ یہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ ”حسینؑ“ کو اہلِ کوفہ پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ ان کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہیں، وہ اس بوڑھی عورت کے مانند ہیں جو صبح سے شام تک بڑی محنت سے دھاگہ کاتتی ہے اور شام کو اسی دھاگہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

لیکن۔۔۔

جب کوئی اور جائے امن نہ ہو، حتی مکہ کی سرزمین بھی آپؑ پر تنگ ہو چکی ہو، ایسے میں امید کی کوئی کرن نظر آئے امامؑ کو محبت بھرے دعوت نامے ملیں، اہلِ کوفہ کے نمائندے خود آ کر اپنے خلوص و محبت کا یقین دلائیں، جب کہ ان میں مخلص افراد بھی ہوں کہ جن پر آپؑ کے پدرِ بزرگوار اور آپؑ کے برادرِ عزیز بھی اعتماد و بھروسہ کرتے رہے ہوں تو امامؑ کس منطق کے تحت مخلص لوگوں کو بھی نظر انداز کر دیں؟

پھر۔۔۔۔

امامؑ کے کسی اقدام کا تجزیہ سطحی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ معصومؑ کے نقطہ نظر سے کرنا چاہئے اور یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ آپؑ اپنے خالق و مالک کی طرف سے ایک مسئولیت رکھتے تھے، آپؑ کے پیش نظر آپؑ کے جدؐ، آپؑ کے پدرِ بزرگوار اور آپؑ کے برادرِ عزیز امام حسن مجتبیٰؑ کا مشن بھی

ہے جسے بہر حال آپؑ کو پورا کرنا تھا۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آپؑ کوفہ کا رخ نہ کرتے تو شاید آپؑ کی جان بچ جاتی تب بھی یہ کیونکر ممکن ہے کہ "حسینؑ" اپنی ذمہ داری اور مسئولیت پوری نہ کرے جب کہ اہلِ کوفہ یہ کہہ کر آپؑ کو بلا رہے ہو کہ۔۔۔۔۔

"ہمارے لئے کوئی پیشوا اور امام نہیں ہے۔"

(۲)۔معاہدۂ میثاق

امام حسین علیہ السلام کے کوفہ کو اپنا مرکزِ قیام و انقلاب بنانے کی ایک وجہ وہ معاہدہ ہے جو آپؑ کے برادرِ عزیز امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد شیعیانِ اہلِ کوفہ اور امام حسینؑ کے درمیان خطوط و وفود کے ذریعہ وقتاً فوقتاً طے پایا تھا۔

کوفہ کی مذہبی اور اجتماعی شخصیات امام حسن مجتبیٰؑ کی شہادت پر امام حسینؑ کی خدمت میں تعزیت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آپؑ سے معاویہ کے خلاف قیام کرنے کی درخواست بھی کرتی تھیں۔چنانچہ امام حسینؑ کے نام ان کے ایک خط کا مضمون یوں ہے۔

"امام حسن علیہ السلام کی شہادت پر ہم آپؑ کے شیعہ بھی آپؑ کی مصیبت میں آپؑ کے ساتھ غم زدہ ہیں' آپؑ کے حزن میں ہم بھی محزون ہیں۔امام حسن علیہ السلام کے بعد خداوندِ عالم نے آپؑ کے مبارک وجود کی صورت میں بہترین خلف عطا فرمایا ہے' آپؑ کا غم ہمارا غم اور آپؑ کی خوشی ہماری خوشی ہے ہم آپؑ کے حکم کے منتظر ہیں۔"

امام حسینؑ نے ان کے خط کے جواب میں لکھا کہ۔

"میرے بھائی امام حسنؑ کی معاویہ سے صلح اور معاویہ کے خلاف میرے قیام کرنے کے جواز کے بارے میں تمہاری رائے دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں' لیکن فی الحال جب تک پسرِ ہندہ (معاویہ) زندہ ہے اس وقت تک خاموش بیٹھو' زمین پر خود کو چھپا کر رکھو اور خدا سے ہدایت کے لئے دعا کرتے رہو۔اگر کوئی حادثہ پیش آیا (یعنی معاویہ مرگیا) اور ہم اور تم اس وقت زندہ رہے تو میں تمہیں اپنی رائے سے آگاہ کروں گا۔"

غرض اہلِ کوفہ اپنی نجات کی راہ امام حسین علیہ السلام کے سائے میں دیکھتے تھے اور ان سے اپنی امیدیں باندھے ہوئے تھے۔جب بھی وہ ریاستی ظلم وستم کا نشانہ بنتے' بے تابی سے یکے بعد دیگرے امامؑ کو خطوط لکھتے اور ان سے قیام کرنے مطالبہ کرتے اور امامؑ ان کو صبر کی تلقین کرتے۔چنانچہ معاویہ کے دورِ حیات میں اہلِ کوفہ کی طرف سے آخری خط جو امامؑ کو پہنچا وہ محمد ابنِ بشیر ہمدانی اور صفین ابن لیلیٰ ہمدانی کی قیادت میں ایک وفد لے کر پہنچا تھا۔ان لوگوں نے امامؑ سے ملاقات کی' امامؑ نے فرمایا کہ۔

"جب تک معاویہ زندہ ہے اس وقت تک تم میں سے ہر شخص اپنے گھر میں چھپ کر بیٹھے۔جب یہ ہلاک ہوجائے اور اس وقت تک اگر ہم اور تم زندہ رہے تو خدا کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ خدا ہمارے لئے خیر کی کوئی راہ پیدا کردے گا' خدا ہم کو ہمارے حال پر نہیں چھوڑے گا وہ مومنین اور متقین کے ساتھ ہے۔اس وقت ہماری ہدایت تم کو ملے گی۔" (مع الحسینؑ فی نہضتی)

اہلِ کوفہ اور امام حسینؑ کے درمیان خطوط اور وفود کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ امامؑ کے پاس لوگوں کی آمد ورفت کی خبر حکومت کو بھی لگ گئی اور مدینہ اور دمشق میں حکام پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔چنانچہ معاویہ نے امام حسینؑ کو ایک تہدید آمیز خط تحریر کیا جس میں لکھا کہ۔

"مجھے خبر ملی ہے کہ کوفہ والوں کا ایک گروہ آپؑ کو اختلاف کرنے اور جنگ کرنے کی دعوت دے رہا ہے یہ اہلِ عراق وہی ہیں جنہیں آپ آزما چکے ہیں' آپؑ کے والد اور آپؑ کے بھائی کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا وہ آپؑ کے سامنے ہے' آپؑ خدا سے ڈریں اور ہمارے درمیان طے ہونے والے صلح نامہ کا پاس کریں ورنہ نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔"

معاویہ یزید کے بارے میں اہلِ کوفہ سے بہت پریشان تھا اور ڈر رہا تھا۔چنانچہ اس نے

یزید کوہدایت کی کہ اگر اہل کوفہ تم سے ہر روز ایک گورنر بدلنے کی درخواست کریں تو تم بدل دینا کیونکہ ایک لاکھ تلواروں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ایک آدمی کی ناراضگی مول لینا زیادہ بہتر ہے۔(کتاب مع الحسینؑ فی مفتی۔ص ۳۸۔نقل از انساب الاشراف)

بنی امیہ اہل کوفہ سے اس لئے پریشان تھے کہ اہل کوفہ معاویہ اور بنی امیہ کے مقابلہ میں اہل بیتؑ کے زیادہ حامی اور طرفدار تھے۔اہل کوفہ اور امام حسینؑ کے درمیان ضمنی طور پر ایک معاہدہ پہلے سے موجود تھا۔یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ نے مکہ سے اہل کوفہ کے نام کوئی خط نہیں لکھا بلکہ آپؑ منتظر تھے کہ اہل کوفہ اپنے سابقہ وعدہ اور معاہدہ کی بناء پر خود اٹھیں تب آپؑ ان کی دعوت پر جائیں۔

(۳)۔اہل کوفہ بنی امیہ سے نالاں اور ناراض تھے

کوفہ والے بنی امیہ سے نفرت کرتے تھے اور ان کے ظلم و تشدد سے پریشان اور نالاں تھے۔

ان کی بنی امیہ سے نفرت کی وجوہات میں سے چند وجوہات یہ ہیں۔

(۱)۔معاویہ نے اپنے دور حکومت میں اپنے کارندوں اور گورنروں کے توسط سے عراق میں ڈکٹیٹر شپ اور لاقانونیت کی فضا طاری کی ہوئی تھی۔بنی امیہ کے حکمرانوں کی منطق یہ تھی کہ وہ اہل عراق سے کہتے تھے کہ اگر تمہارے یہاں کے مجرم ہمارے ہاتھ نہیں آئے تو ان کے بدلے میں ہم تمہارے بے گناہ افراد کو پکڑ لیں گے اور جو حکومت سے روگردانی کریں گے ان کے بدلے تم پر تہمت لگا کر تمہیں قتل کریں گے۔چنانچہ عبیداللہ ابن زیادہ نے کوفہ پر مسلط ہوتے ہی ایک ایسا خطبہ دیا۔

(۲)۔امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے دور حکومت میں اسلامی حکومت کا دار الخلافہ کوفہ تھا لیکن معاویہ کے دور حکومت میں یہی کوفہ حکومت کا سب سے زیادہ معتوب صوبہ قرار پایا۔چنانچہ جب بھی علیؑ کا ذکر آتا تو اہل کوفہ کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت و شرافت یاد آتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اہل کوفہ کا اولاد علیؑ سے ایک قلبی رابطہ تھا۔

(۳)۔ کوفہ میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو بنی امیہ کے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنا ہو، جس کے اسلاف و اشراف بنی امیہ کے ہاتھوں قتل اور مبتلائے مصیبت نہ ہوئے ہوں۔

(۴)۔معاویہ کے دور حکومت میں حضرت علی علیہ السلام پر برسر عام منبر سے سب و شتم کیا جاتا تھا۔

(۵)۔بنی امیہ، اہل کوفہ کو دشمنی، ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کا یہ عمل اہل کوفہ کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت اور کراہت پیدا کرتا تھا۔

(۶)۔ ابوعثمان جاحظ اہل کوفہ کی اپنے والیان سے سرکشی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''کوفہ والے اہل نظر، صاحب عقل و شعور اور بحث و تحقیق کرنے والے لوگ تھے، وہ شریعت و سنت میں کسی تغیر و تبدل کا فوری نوٹس لیتے تھے، اچھا اور برا کردار رکھنے والوں اور اس کا مظاہرہ کرنے والوں پر نظر رکھتے تھے۔صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اپنے امراء پر کڑی نظر رکھتے تھے۔اور ان کی غلطیوں کو برداشت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو برملا ظاہر کرتے تھے۔اس کے برخلاف اہل شام کند ذہن، بحث و تحقیق سے عاری اور علم و فکر میں جمود رکھنے والے لوگ تھے اور اہل تقلید تھے۔جو چیز ان کی نظروں سے اوجھل ہوا سے کبھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور آنکھ بند کر کے اپنے امراء کی اطاعت کرتے تھے، جو کچھ وہ کہہ دیتے اسی کو حقیقت سمجھتے تھے۔''(شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید۔ج۱۔ص۳۴۳)

(۴)۔اہل کوفہ کے دلوں میں امام حسینؑ کی محبوبیت

اہل کوفہ کے دلوں میں امام حسین علیہ السلام کے لئے ایک مقام و منزلت اور محبت و مودت تھی۔رہا یہ کہ ان کی یہ محبت اور اخلاص امامؑ کے نواسہ رسول اور دلبند فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا ہونے کے ناطے تھا یا ان کے ذاتی فضائل، کمالات اور صفات و اخلاق کی وجہ سے۔اس کی

رضاحت اور تفصیلی ذکر کا یہاں موقع نہیں ۔لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اگر اہلِ کوفہ کو آزادی رائے کا موقع ملتا اور انہیں خودمختار آزادانہ اور اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنا قائد و رہبر انتخاب کرنے کا موقع دیا جاتا تو وہ حسین ابنِ علیؑ کے علاوہ کسی اور کو منتخب کرتے ۔اس حقیقت کے بہت سے شواہد ہیں کہ امام حسینؑ اہلِ کوفہ میں ہر دل عزیز تھے ان میں سے چند شواہد ہم یہاں پیش کرتے ہیں ۔

(۱) منزلِ صفاح پر جب آپؑ کی ملاقات فرزدق سے ہوئی اور آپؑ نے اس سے اہل کوفہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ۔

"لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں' لیکن ان کی تلواریں آپؑ کے خلاف ہیں۔"

(۲) ۔منزلِ ذاتِ عرق پر جب آپؑ کی ملاقات بنی اسد کے ایک شخص بشر ابنِ غالب سے ہوئی تو آپؑ نے اسے پوچھا کہ "تم کہاں سے آرہے ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "عراق سے ۔" امامؑ نے اس سے پوچھا کہ "تم نے اہل عراق کو کس حال میں چھوڑا؟" تو اس نے جواب دیا کہ۔۔۔

"لوگوں کے دلوں میں آپؑ ہیں لیکن ان کی تلواریں ل آپؑ کے خلاف ہیں۔"

(۳) منزلِ عذیب الھجانات پر امامؑ کی ملاقات ہلال ابنِ نافع سے ہوئی جو کوفہ سے آئے تھے ۔ آپؑ نے ان سے جب کوفہ کے لوگوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ۔

"وہاں کے امراء اور روٴسا کو تو بڑی بڑی رشوتیں ملی ہیں لیکن عوام کے دلوں میں آپؑ ہیں۔"

(۴) ۔منزل حاجر سے امامؑ نے قیس ابنِ مسہر صیداوی کے ہاتھ کوفہ والوں کے نام ایک خط روانہ کیا اور اس میں لکھا کہ "مسلم نے مجھے لکھا ہے کہ تم سب ہمارا حق ہمیں دلانے کے لئے متحد اور متفق ہو چکے ہو۔"

(۵) ۔حضرت مسلم بن عقیل نے اپنے خط میں امامؑ کو لکھا کہ۔

"اہلِ کوفہ آپؑ کے سوا کسی کے حق میں نہیں۔"

(۶) ۔عبیداللہ ابن زیاد جب کوفہ میں داخل ہوا تو وہ امام حسینؑ کا روپ دھار کر اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کوفہ میں داخل ہوا تا کہ لوگ اسے "حسینؑ" سمجھ کر اس کا استقبال کریں' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوفہ والوں کے دلوں میں حسینؑ کا مقام ہے ۔

(۷) ۔حر ابن یزید ریاحی جب راہ میں امامؑ کے مزاحم ہوا تو اس نے امامؑ کو ناراض کرنے سے حتی الامکان گریز کیا اور گفت و شنید کے دوران جب نماز کا وقت ہو گیا تو نماز کے لئے اس نے اپنی علیحدہ جماعت قائم کرنے سے بھی احتراز کیا یہاں تک کہ روزِ عاشورا اپنی حرکتوں اور اپنے اقدام پر نادم ہو کر شدید کرب و پریشانی کے بعد پشیمانی کے عالم میں امامؑ سے جا ملا ۔

یہ تمام شاہد اس بات کی دلیل ہیں کہ اہلِ کوفہ کے دلوں میں امام حسینؑ کا ایک مقام و منزلت تھی ۔

(۵) ۔اہلِ عراق حسینؑ سے جنگ کرنا پسند نہیں کرتے تھے بنی امیہ کی حمایت اور ان کی حکومت کی تمام تر کاسہ لیسیوں کے باوجود اہلِ عراق نہیں چاہتے تھے کہ امام حسینؑ کے خلاف مخالفت اس حد تک بڑھے اور نوبت یہاں تک پہنچے کہ انہیں امامؑ کے خلاف خود کو جنگ میں شریک کرنا پڑے ۔ چنانچہ حر ابنِ یزید ریاحی نے جب امام حسینؑ کا راستہ روکا اور ان کو کوفہ لے جانا چاہا تو امام حسینؑ اور حر کے درمیان تلخ کلامی ہوئی ۔ آخر حر نے یہ تجویز پیش کی کہ آپؑ ایسا راستہ اختیار کریں کہ جو نہ کوفہ جاتا ہو اور نہ ہی مدینہ ۔اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ: شاید خدا ایسے حالات پیدا کر دے کہ میں آپؑ کا خون بہانے اور آپؑ کے قتل میں ملوث ہونے سے بچ جاؤں ۔"

مندرجہ ذیل شواہد اس بات کی تصدیق کرتے ہیں ۔

(۱) ۔شبث ابن ربعی خوارج سے تعلق رکھتا تھا ۔عبیداللہ ابنِ زیاد نے جب اس کو امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بھیجنا چاہا تو اس نے بیماری کا بہانہ کیا ۔عبیداللہ کو جب یہ خبر ملی کہ وہ بیمار نہیں ہے بلکہ بیماری کا بہانہ کر رہا ہے تو اس نے دوبارہ اس کو پیغام بھیجا اور کہا کہ میرے مخبر نے

مجھے خبر دی ہے کہ تم بیمار نہیں ہو بلکہ تم نے بیماری کا بہانہ کر کے خود کو قرآن کی اس آیت کا مصداق بنایا ہے جس میں کہا گیا ہے۔

''یہ لوگ جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور جب مشرکین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔

یہ شخص کربلا کے میدان میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ۔

''خدا اس شہر کے رہنے والوں کو خیر نصیب نہ کرے خدا کرے یہ کبھی اچھائی تک نہ پہنچیں۔ یہ کتنی ضلالت اور گمراہی کی بات ہے کہ ہم نے زمین میں بسنے والے بہترین خلائق کے خلاف جنگ کی اور آلِ معاویہ اور آلِ زادزانیہ کی حمایت کی۔'' (حیاتِ امام حسینؑ از باقر قرشی ج ۳۔ص ۲۱۵)

(۲)۔عمرِ سعد کے لشکر میں بہت سے افراد امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے سے ہچکچا رہے تھے اور تردد کا شکار تھے۔انہیں میں سے ایک گروہ ایک گوشہ میں رہ کر خدا سے ان الفاظ میں دعا گو تھا:

''خداوندا! اپنے پیغمبرؐ کے نواسہ کی مدد فرما۔''

یہاں تک کہ عمرِ سعد کے لشکر کے قائد عمر ابنِ حجاج نے اپنے لشکر کو مخاطب کر کے کہا کہ:

''(حسینؑ) دین سے نکل چکے ہیں اس لئے ان سے جنگ کرنے میں تم شک وشبہ نہ کرو۔'' (معاذ اللہ)

عبیداللہ ابن زیاد نے ایک عام حکم جاری کیا کہ تمام لوگ حسینؑ کے خلاف جنگ کے لئے نکلیں۔یہ حکم جاری کر کے وہ نخیلہ گیا اور وہاں کیمپ لگایا۔شہر میں صرف کثیر ابنِ شہاب رہ گیا۔وہ امام حسینؑ کے خلاف جنگ کے لئے نہ نکلنے والوں کو ڈراتا' دھمکاتا اور خوف وہراس پھیلاتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ ایک سپاہی نے ایک شامی کو پکڑ لیا جو کوفہ میں اپنا قرض وصول کرنے آیا تھا۔سپاہی نے اس کو پکڑ کر ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔اس نے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ''گو یہ سچ ہے کہ تم بے گناہ ہو اور ایک مسافر ہو لیکن پھر بھی تمہیں قتل کرنے سے لوگوں کو عبرت ہوگی۔''

(۳)۔بلاذری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ عبیداللہ ابنِ زیاد ایک ایک ہزار افراد پر مشتمل فوج بنا کر کربلا بھیجتا تھا' لیکن کربلا پہنچنے تک اس فوج میں تین یا چار سو افراد باقی رہ جاتے تھے۔لوگ اس جنگ میں شامل ہونے سے کتراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خدا' اس کے رسولؐ اور ان کے ذوی القربٰی کے خلاف جنگ ہے۔

(۴)۔ابنِ زیاد کو خبر ملی کہ ایک ایک' دو دو آدمی رات میں اس کے لشکر سے نکل کر حسینؑ کے لشکر سے جا ملتے ہیں تو اس نے حکم دیا کہ فرات کے پُل پر تعینات افراد کی تعداد بڑھائی جائے اور نگرانی کو سخت کیا جائے۔

(۵) عمر ابنِ سعد بنی امیہ کے قریبی کارندوں میں سے تھا۔حضرت مسلم ابن عقیل جب کوفہ پہنچے اور ان کے بارے میں کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر نے لاپرواہی' سستی' نرمی اور رعایت سے کام لیا تو یہ عمر ابنِ سعد ہی تھا جس نے اس کی رپوٹ یزید کو بھیج کر نعمان کی شکایت کی۔حضرت مسلم جب گرفتار کر کے دارالامارہ میں لائے گئے تو انہوں نے عمر سعد کو قریشی ہونے کی بنا پر وصیت کے لئے بلایا تو اس نے وصیت سننے سے انکار کر دیا۔یہ شخص خود کو بنی امیہ کا بڑا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔لیکن اس کے باوجود جب عبیداللہ ابنِ زیادہ نے امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اس کو لشکر کا قائد بنا کر بھیجنا چاہا تو اس نے معذرت چاہی۔ابنِ زیاد نے جب اس سے حکومتِ رے کی سند واپس لینے کی دھمکی دی تو اس نے کہا کہ مجھے سوچنے کی مہلت دو میں اس مسئلہ پر سوچوں گا۔رے کی حکومت عمرِ سعد کی محبوب ترین اور دیرینہ خواہش تھی۔جب وہ حکومتِ رے کے حصول اور امام حسینؑ کے خون میں ہاتھ رنگنے کے جرم کا موازنہ کرتا تو کہتا کہ۔

''حکومتِ رے کا حصول میرا مطلوب ومقصود ہے' لیکن حسینؑ کے خون میں ہاتھ رنگنے کی کم سے کم سزا جہنم ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمرِ سعد جیسا شقی اور خبیث شخص بھی حسینؑ کے قتل میں ملوث ہونے کو برا سمجھتا تھا۔

یہ شخص جب کربلا پہنچا تو اس نے عبداللہ شعبی سے کہا کہ وہ امام حسینؑ سے جا کر پوچھے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ عبداللہ شعبی نے کہا کہ اگر تو چاہے تو میں حسینؑ کو قتل کر کے بھی آ سکتا ہوں تو عمر سعد اس پر ناراض ہو گیا۔

عمر سعد نے کربلا میں امام حسینؑ سے مذاکرات کرنے کے بعد ابن زیاد کو ایک خط لکھا کہ۔

"خداوندِ عالم نے فتنہ کی آگ کو ٹھنڈا کیا ہے اور امت کی اصلاح فرمائی ہے۔ حسینؑ یہاں سے واپس جانے کے لئے راضی ہیں۔"

اس کے علاوہ اس نے اس خط میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ۔

"حسینؑ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہیں۔"

یہ اضافہ اس نے صرف اس لئے کیا کہ وہ اپنے دامن کو قتلِ حسینؑ کے جرم سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن شمر ذی الجوشن نے عبیداللہ ابنِ زیاد کو عمر سعد کی تجویز پر عمل کرنے سے روکا اور ایک حتمی جنگ کے فیصلہ کا حکم نامہ لے کر عمر سعد کے پاس پہنچا۔ عمر سعد نے یہ حکم نامہ دیکھ کر شمر سے کہا کہ۔

"خدا تجھے گھر پہنچنا اور خیر نصیب نہ کرے تو جو چیز لے کر آیا ہے وہ بہت ہی بری ہے تو نے ہی ابنِ زیاد کو میرے مشورے پر عمل کرنے سے روکا ہے اور میری امیدوں اور خواہشات پر پانی پھیرا ہے' لیکن یاد رکھنا کہ حسینؑ کے جسم میں ان کے باپ کی روح ہے وہ کبھی سر نہیں جھکائیں گے۔"

(۶)۔ حر ابنِ یزید ریاحی نے جب عمر سعد سے پوچھا کہ۔

"تمہارے اور حسینؑ کے درمیان گفتگو و مذاکرات کہاں تک پہنچے ہیں اور جو تجاویز حسینؑ

نے پیش کی ہیں کیا وہ قابلِ عمل قرار پائی ہیں یا نہیں؟"

تو عمر سعد نے کہا کہ۔

"اگر اختیار میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ان کی تجاویز ضرور تسلیم کر لیتا لیکن تمہارا امیر ان کو قبول نہیں کرتا۔"

(۷)۔ مدینہ میں ولید ابنِ عتبہ نے مروان کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے جب امام حسینؑ کو اپنی مجلس سے یزید کی بیعت کئے بغیر واپس جانے اور مسئلہ پر سوچ بچار کرنے کی اجازت دے دی تو مروان نے ولید سے کہا کہ "تو نے میری رائے کے خلاف حسینؑ کو واپس جانے دیا' اب وہ کبھی تیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔" اس پر ولید نے کہا کہ۔

"وائے ہو تجھ پر تو نے مجھے ایک ایسا مشورہ دیا تھا کہ جس سے میرا دین اور دنیا دونوں برباد ہو جاتے' خدا کی قسم مجھے اگر پوری دنیا کا مالک بنا دیا جائے اور کہا جائے کہ میں حسینؑ کو قتل کر دوں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا' کیا میں حسینؑ کو قتل کر دوں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا' کیا میں حسینؑ کو صرف اس بات پر قتل کر دیتا کہ انہوں نے بیعت سے انکار کیا' خدا کی قسم جو بھی حسینؑ کے خون سے ہاتھ رنگے گا قیامت کے دن اسے اس خون کا حساب دینا پڑے گا' اس کا میزانِ عمل خفیف ہوگا اور خداوندِ عالم اس پر اپنی رحمت کی نظر نہیں کرے گا۔" (حیاتِ امام حسینؑ۔ ج ۲۔ ص ۲۵۶)

غرض یہ تمام شواہد اس بات کی دلیل ہیں کہ اہلِ عراق امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے سے ناخوش تھے اور اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ عمر سعد جیسا شقی اور فاسق و فاجر انسان جو ہوسِ اقتدار میں سر سے پیر تک ڈوبا ہوا تھا اور کرسی اقتدار کی خاطر اپنی دنیا و آخرت کی سعادت تک بیچنے پر آمادہ تھا وہ بھی امام حسینؑ سے جنگ کرنے اور ان کے خون میں ہاتھ رنگنے سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتا رہا تو پھر عوام الناس کیوں کر اس جنگ اور خونِ ناحق سے راضی ہو سکتے تھے۔

تعمیم

تنعیم اس وادی کا نام ہے جو مکہ اور سرف کے درمیان واقع ہے۔ یہ مکہ سے تین یا چار فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے دائیں جانب ایک پہاڑ ہے جسے "نعیم" کہتے ہیں اور ایک پہاڑ جو اس کے بائیں جانب ہے اسے "ناعم" کہتے ہیں۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان واقع وادی کو "نعمان" کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "تنعیم" ہے۔ "تنعیم" مدینہ سے آنے والوں کے لئے مکہ کی سرحد ہے۔ باب عمرہ سے اس کا فاصلہ ۶۱۴۸ میٹر ہے۔ یہاں دونشانیاں ہیں جسے عرب انصاب کہتے ہیں۔ یہ دونشانیاں بنی عباس کے خلیفہ مقتدر عباسی نے ۳۱۵ھ میں نصب کروائی تھیں۔ یہاں ایک مسجد ہے جسے اس وادی کے نام کی مناسبت سے "مسجدِ تنعیم" کہتے ہیں۔ اس مسجد کو مسجد "عائشہ" بھی کہتے ہیں۔ اسے مسجد عائشہ اس لئے کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے عبدالرحمان ابنِ ابوبکر سے کہا کہ حضرت عائشہ کو یہاں سے احرام بندھوائیں۔ اس مسجد کو مسجدِ عمرہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ مکہ سے قریب ترین میقات ہے' یہاں سے عمرۂ مفردہ کے لئے احرام باندھتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام ۸ ذی الحجہ کو جب مکہ سے عراق کے لئے نکلے تو آپ کی پہلی منزل یہی وادی تھی جہاں آپ نے قیام کیا۔ یہاں پر چند واقعات پیش آئے۔

(۱) مکہ کے نئے گورنر عمرابنِ سعیداشدق کو جب یہ خبر ہوئی کہ حسینؑ مکہ سے عراق کے لئے نکلے ہیں تو اس نے اپنے بھائی یحیٰی ابنِ سعیداشدق کی کمان میں ایک مختصر سا لشکر امامؑ کے تعاقب میں روانہ کیا اور یحیٰی کے ہاتھ امامؑ کے نام ایک خط بھی بھیجا۔ یہ خط کتاب "موسوعہ کلماتِ امام حسینؑ" میں اس طرح نقل ہوا ہے۔

"میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپؑ کو عقل و رشد عطا فرمائے اور اس عمل سے آپؑ کو باز رکھے جس میں آپؑ کی ہلاکت ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپؑ نے عراق کے سفر کا ارادہ کیا ہے۔ میں آپؑ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپؑ اختلاف' فتنہ اور فساد سے

باز رہیں۔ اگر آپؑ کو کوئی خوف ہے تو آپؑ میرے پاس آجائیں' میرے پاس آپ کے لئے امان ہے اور میرے دل میں آپؑ کے لئے نیکی اور صلۂ رحمی ہے۔"

یہ خط مکہ کے گورنر کی ڈپلومیٹک پالیسی (Diplomatic policy) کا عکاس ہے۔ ایک طرف تو اس نے امامؑ سے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات اور پند و نصیحت کا اظہار کیا ہے اور طمع و لالچ بھی دیا ہے جب کہ دوسری طرف اس نے امامؑ پر نادان' جاہل اور فتنہ انگیز ہونے کی تہمت لگا کر آپؑ کی اہانت کرنے کی جسارت کی ہے۔ اس خط کے چند محرکات اور وجوہات ہیں جس کی وجہ سے اسے یہ خط لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

☆ عمرابنِ سعیداشدق مطمئن تھا کہ امام حسینؑ اس کے پنجے میں ہیں اور اب اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ اس کا منصوبہ تھا کہ مکہ سے حجاج کی واپسی کے بعد خالی ہونے کے بعد ان کا کوئی حامی اور ناصر بھی نہیں ہوگا اور یزید کی حکومت کے خلاف سازش کا ذمہ دار بھی حسینؑ کو ہی سمجھا جائے گا لیکن جب اسے یہ اطلاع ملی کہ حسینؑ مکہ سے نکل چکے ہیں اور ان کا رخ عراق کی طرف ہے تو اسے پریشانی ہوئی کہ دشمن ہاتھ سے نکل گیا۔ چنانچہ یہ پریشانی اس خط لکھنے کا محرک بنی۔

☆ خط لکھنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جس طرح مدینہ سے ولید کے ہاتھ سے امام حسینؑ کا نکل جانا اس کی نا اہلیت کا ثبوت بنا ویسے ہی امام حسینؑ کا اس وقت اس کے ہاتھ سے نکل جانا یزید کے سامنے اس کی نا اہلیت کا ثبوت قرار پاتا اور اس کی سبکی کا سبب بنتا۔

☆ تیسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت مکہ میں موجود حجاج میں یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ حسینؑ مکہ میں اپنے لئے خطرہ محسوس کر کے یہاں سے نکلے ہیں اور یہ بات مکہ کے گورنر کے خلاف حجاج کے دل میں غیظ و غضب کا سبب بن رہی تھی اس لئے وہ پریشان تھا۔

☆ اس کے علاوہ حاکمِ مکہ نے دیکھا کہ امام حسینؑ نے عراق کا سفر اختیار کیا ہے جب کہ عراق ہی بنی امیہ کے مخالفین کا مرکز اور حکومتِ بنی امیہ کے لئے معارض بنا ہوا تھا۔ یہ بات اس کے لئے

پریشانی کا سبب تھی۔ اگر امامؑ عراق کے علاوہ کسی اور جگہ کا عزم کرتے تو حکومت کو زیادہ تشویش نہ ہوتی۔

غرض وادی تنعیم میں امامؑ کی یحییٰ ابن سعید کے لشکر سے جھڑپ ہوئی اور امامؑ نے اسے واپس پلٹنے پر مجبور کردیا۔ عمرابن سعید کے خط کے جواب میں آپؑ نے لکھا کہ:

''تم نے اپنے خط میں جس نیکی اور صلہ رحمی کا اظہار کیا ہے (اگر وہ حقیقت پر مبنی ہے) تو خدا تمہیں دنیا وآخرت میں جزائے خیر دے۔ تمہاری طرف سے مجھے اختلاف اور فتنہ سے باز آنے کی نصیحت کا جہاں تک تعلق ہے تو سمجھ لو کہ جو مسلمان عملِ صالح کرتے ہیں اور لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ فتنہ برپا نہیں کرتے۔ جہاں تک تمہاری امان کا تعلق ہے جس کا تم نے اپنے خط میں وعدہ کیا ہے تو جان لو کہ بہترین امان صرف خدا کی امان ہے۔ اس شخص کے لئے خدا کی امان نہیں جو اس دنیا میں خدا سے نہ ڈرے۔

میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ خوفِ خدا کرو تاکہ آخرت میں خدا کی امان ملے۔''

کتنا عجیب اتفاق اور عبرت کا مقام ہے کہ عمرابن سعید اشدق جس نے حسینؑ کو امان دینے کا لالچ دیا وہ خود بنی امیہ کے ظلم سے نہ بچ سکا اور بنی امیہ نے اس کو اور اس کے اہل اور اقربا کو قتل کرکے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اس طرح وہ دنیا اور آخرت دونوں کی امان سے محروم ہوا۔

(۲) تنعیم میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جناب زینب سلام اللہ علیہا کے شوہر حضرت عبداللہ ابن جعفر کو جب یہ خبر ملی کہ امام حسینؑ مکہ چھوڑ کر عراق روانہ ہوئے ہیں تو انہوں نے بے تاب ہوکر ادھر تو اپنے دو فرزندوں کو یہ کہہ کر امامؑ کی طرف روانہ کیا کہ وہ جہاں بھی ملیں انہیں روکیں اور کہیں کہ میں بھی پہنچ رہا ہوں۔ ادھر خود عبداللہ ابن جعفر والی مکہ عمرابن سعید اشدق کے پاس گئے اور اس سے امام حسینؑ کے لئے ایک امان نامہ طلب کیا۔ ان کا امان نامہ طلب کرنا چوں کہ خود والی مکہ کی عین خواہش کے مطابق تھا اس لئے اس نے بغیر پس وپیش فوراً ایک

امان نامہ لکھ کر اپنے بھائی یحییٰ ابن سعید اشدق کے ہاتھ میں دیا (شاید یہ وہی امان نامہ ہو جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔) غرض عبداللہ امامؑ کی خدمت میں پہنچے تو امامؑ نے ان کے ساتھ واپس جانے سے انکار کیا۔ انہوں نے جب آپؑ سے واپس نہ چلنے کی وجہ پوچھی تو آپؑ نے جواب دیا کہ مجھے رسول اللہؐ نے ایک حکم دیا ہے جسے مجھے بہر حال انجام تک پہنچانا ہے۔ جب آپؑ سے اس حکم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیا حکم ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ وہ نہ میں نے کسی کو بتایا ہے اور نہ بتاؤں گا۔ یہ سن کر عبداللہ ابن جعفر واپس مکہ آئے اور امامؑ نے اپنا سفر جاری رکھا۔

(۳) تنعیم میں تیسرا واقعہ جو رونما ہوا وہ جیسا کہ اکثر مقاتل میں بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ امام حسینؑ جب یہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک قافلہ اونٹوں پر لدے ہوئے تحفہ وتحائف لے کر شام کی طرف جارہا ہے۔ یہ تحائف والی یمن بحیرا ابن یسار نے یزید کے لئے بھیجے تھے۔ امام حسینؑ نے ان تحائف پر قبضہ کیا اور قافلہ والوں سے کہا کہ تم میں سے جو شخص یہاں سے واپس جانا چاہے واپس جاسکتا ہے، ہم اسے یہاں تک کی اجرت دیں گے اور جو بھی یہاں سے آگے ہمارے ساتھ چلنا چاہے ہم انہیں بھی ان کا حق ادا کریں گے۔

بعض جید علماء نے اس واقعہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اقدام امام حسین علیہ السلام کی شان اور مقام کے منافی ہے۔ آپؑ کی شان اس سے کہیں بلند وارفع ہے کہ آپؑ ایسے کوئی اقدام کریں۔ جب کہ بعض سیرت نگار اور جید علماء نے نہ صرف اس واقعہ کی صحت کا اقرار کیا ہے بلکہ امام کے اس اقدام کو صحیح اور ضروری اقدام قرار دیا ہے۔ اس اقدام کے صحیح اور ضروری ہونے کی سند میں وہ اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں کہ جب یمن سے ایسے ہی تحفے وتحائف لے کر ایک قافلہ معاویہ کی طرف جارہا تھا تو امام حسینؑ نے مدینہ میں ان تحائف پر قبضہ کرکے معاویہ کو خط لکھا تھا کہ:

''یہ تحفے وتحائف شام کے خزانہ میں جمع ہونے کے لئے جارہے تھے لیکن ان تحائف کے زیادہ حقدار مدینہ کے نادار ومسکین ہیں اس لئے ہم نے ان تحائف کو ان مستحق حاجتمندوں میں تقسیم

کرنے کے لئے لے لیا ہے۔"

دوسری سند یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو ابوسفیان اور مشرکین کے ظلم وستم سے تنگ آ کر جب مکہ چھوڑ کر مدینہ آنا پڑا تو آپؐ نے مکہ اور شام کے درمیانی راستہ پر ایک دستہ مقرر کیا جس نے ابوسفیان کے قافلہ کے اس مال پر قبضہ کیا جو وہ شام سے مکہ لے کر جا رہا تھا۔ اس طرح پیغمبر اکرمؐ نے مشرکین مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کی۔

تیسری سند یہ ہے کہ یزید کی حکومت ایک غاصب حکومت تھی اور مالِ مسلمین پر اس کا قبضہ غاصبانہ تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے اس اقدام کو اسی صورت میں غلط قرار دیا جا سکتا ہے جب اس کی خلافت وحکومت کو جائز اور مالِ مسلمین پر اس کو اولی بالتصرف مان لیا جائے۔ لیکن اگر اس حکومت ناجائز تھی اور یقیناً ناجائز تھی تو پھر امامؑ کا اقدام سو فیصد درست اور صحیح تھا نیز کسی کے مال کا ضبط کرنا اس صورت میں درست نہیں جب وہ اس کا مال ہو لیکن اگر وہ مال ہی غصبی ہو تو پھر اسے ضبط کرنے کا اختیار امامؑ کے پاس موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر امام حسینؑ کے اس اقدام کو غلط قرار دیا جائے تو امام علی علیہ السلام کے اس اعلان اور فرمان کو کیا کہیں گے جہاں آپؑ نے خلیفہ سوم کے دورِ خلافت میں بیت المالِ مسلمین سے ناجائز طور پر غیر مستحق لوگوں کو دیئے گئے مال کے متعلق فرمایا کہ:

"خدا کی قسم، میں ایسا سب مال بیت المال میں واپس لاؤں گا اگرچہ وہ عورتوں کے جہیز میں ہی کیوں نہ دیا گیا ہو اور اس کو چاہے کنیزوں کی خریداری پر ہی کیوں نہ صرف کیا گیا ہو۔" (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۵)

ازروئے اسلام وشریعت نہ پیغمبر اکرمؐ کا ابوسفیان کے مال پر قبضہ کرنا غلط تھا، نہ امام علی علیہ السلام کا یہ فرمان اور اعلان اور نہ ہی امام حسین علیہ السلام کا یہ اقدام۔

چنانچہ امام علی علیہ السلام نے سب سے پہلا اقدام جو کیا وہ یہ تھا کہ حضرت عثمان نے جو مال

غیر شرعی طور پر تقسیم کیا تھا آپؑ نے اسے غیر مستحق افراد سے واپس لے کر بیت المال میں جمع کرنے کا حکم نافذ فرمایا۔

نوٹ

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام وانقلاب کے دوران آپؑ کے بہت سے اقدامات، خطبات اور کلمات پیچیدہ، مشکل اور ناقابلِ فہم اس لئے قرار پاتے ہیں کہ عموماً لوگ آپؑ کے قیام کو ایک بے بس، مجبور اور ایک غیر ارادی عام انسان کا قیام سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ امامؑ کو یزید کی حکومت سے کوئی مخالفت نہیں تھی اور وہ اس کی غاصبانہ حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ وہ تو صرف یزید ہے جو امام حسینؑ کو چھیڑ بیٹھا ورنہ اگر یزید امامؑ کو نہ چھیڑتا تو امام حسینؑ (معاذ اللہ) خاموش رہتے اور یزید کے خلاف قیام نہ کرتے۔

یہ ایک سطحی فکر ہے اور ان لوگوں کی فکر ہے جو خلافت اور حکومت کو ائمہؑ کے لئے شجرِ ممنوعہ اور ایک ناپاک چیز سمجھتے ہیں۔ اس فکر کے حامل لوگوں کے لئے نہ صرف لوگوں کے ناجائز اور غیر شرعی قبضہ سے اموال کو امامؑ کا واپس لینا بلکہ امام حسینؑ علیہ السلام کے بہت سے خطبات اور کلمات بھی قابلِ ہضم نہیں ہیں۔ اس قسم کا تصور آج بھی ہمارے درمیان بڑی شد ومد سے فروغ پا چکا ہے۔ لوگ استعمار کے تمام استحصالی اور استعماری کارناموں اور دھاندلیوں پر خاموش رہتے ہیں اور انہیں جائز اور قانونی قرار دیتے اور مسلمانوں کی اس سلسلہ میں جوابی کاروائی کو غیر اسلامی اور غیر قانونی قرار دیتے اور مسلمانوں کی اس سلسلہ میں جوابی کاروائی کو غیر اسلامی اور غیر قانونی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ استعمار کے نمائندے مسلمانوں کے علاقوں میں جب سیاحی یا کسی اور روپ میں جاسوسی کے لئے آتے ہیں تو ان کی جاسوسی پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا گویا وہ ان کے اس عمل کو قانونی قرار دیتے ہیں لیکن ان جاسوسوں کو پکڑنا غیر قانونی سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی ممالک میں ہزاروں مسلمان روزانہ قتل کئے جاتے ہیں اور ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوتی

لیکن ظالم حکومت کے افراد اگر کہیں قتل ہو جائیں تو وہ غیر قانونی قرار پاتا ہے۔

بہر حال امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام و انقلاب میں آپؑ کے بہت سے اقدامات 'خطبات اور کلمات کے نا قابلِ ہضم اور سمجھ میں نہ آنے کی وجہ ہمارے ذاکرین کا ایک مخصوص کردار ہے' جو واقعہ کربلا بیان کرتے ہوئے امامؑ کے ایک مجبور، بے کس و بے بس انسان کی حیثیت سے مدینہ سے نکلنے کی خبر' آپؑ کی اور آپؑ کے انصار کی مظلومانہ شہادت اور اہلِ بیتؑ کے اسیر ہونے کے واقعات کو تو بیان کرتے ہیں لیکن آپؑ کے قیام و تحریک کے عوامل اور آپؑ کے قیام کے دوران مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا میں شہادت تک جو واقعات پیش آئے ان کا تاریخ جائزہ پیش نہیں کرتے اور نہ ہی آپؑ کے خطبات و کلمات کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان تمام واقعات اور امامؑ کے ان اقدامات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ان کے مزاجِ ذاکری کے خلاف ہوں۔

منزلِ صفاح

صفاح' صفحہ کی جمع ہے اور صفحہ عراق میں صاف ستھری جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ جگہ مکہ سے عراق جانے والے راستے پر حنین اور انصاب حرم کے درمیان واقع ہے۔ انصاب حرم سے عراق جانے والے راستے پر جبلِ ستار ہے۔

مکہ سے نکلنے کے بعد امام حسین علیہ السلام کی پہلی منزل تنعیم اور اس کے بعد آپؑ کی دوسری منزل صفاح تھی جہاں آپؑ نے کچھ دیر قیام کیا۔ یہاں پر آپؑ کی ملاقات فرزدق شاعر سے ہوئی ۔فرزدق نے اس ملاقات پر ایک شعر انشاء کیا جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔

''میں منزلِ صفاح پر حسینؑ سے ملا اس وقت ان کے جسم پر قبا اور زرہ تھی۔''

فرزدق نے سلام دعا کے بعد امامؑ نے تعجب سے پوچھا کہ۔

''اس وقت جب کہ پوری دنیا مکہ کی طرف متوجہ ہے' آپؑ کو کس مہم نے مکہ چھوڑنے

پر مجبور کیا اور اس عجلت کی وجہ کیا ہے؟''

امامؑ نے جواب دیا کہ۔

''اگر میں جلد نہ کوچ کروں تو مجھے قتل ہو جانے کا خطرہ ہے۔''

امامؑ نے اس سے پوچھا کہ۔۔۔۔۔''کوفہ کی کیا خبر ہے؟''تو اس نے جواب دیا کہ۔

''آپؑ نے بہت اچھا کیا کہ ایک باخبر شخص سے آپؑ نے یہ معلوم کیا۔''

اس کے بعد کہا کہ۔

''لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں جب کہ ان کی تلواریں بنی امیہ کی حمایت میں ہیں ۔ قضا آسمان سے نازل ہوتی ہے اور خدا ہر آن نئی شان میں ہے۔''(یعنی خدا دائماً تخلیق و ایجاد میں ہے۔)

امامؑ نے اس کے اس جملے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔

''(یقیناً) خدا ہر آن نئی شان میں ہے۔ اگر قضائے الٰہی ہماری خواہش کے مطابق ہمارے حق میں نازل ہوئی تو بھی تمام حمد و ستائش اسی خدا کے لئے سزاوار ہے' ہم اس کی نعمتوں پر حمد کرنے کے لئے بھی اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ اور اگر قضائے الٰہی ہماری خواہش اور ہمارا مقصد کے خلاف نازل ہوئی تب بھی جس کی نیت اور مقصد حق ہو اور تقویٰ جس کا شیوہ ہو' وہ جادۂ حق سے منحرف قرار نہیں پاتا۔''

آخر میں امامؑ نے اس سے پوچھا کہ ''تم کون ہو؟'' تو اس نے گول مول جواب دیا کہ ''میں عراق کا رہنے والا ہوں۔'' اور اپنا مکمل تعارف کرانے سے گریز کیا۔ امامؑ نے اسکے بعد مزید اس سے نہیں پوچھا کہ ''تم کہاں سے آئے ہو' یا عرب میں کس جگہ سے تمہارا تعلق ہے۔ اس پر فرزدق کہتا ہے کہ ''خدا کا شکر ہے کہ امامؑ نے مجھ سے میرے بارے میں مزید وضاحت طلب نہیں کی۔''

امامؑ اور فرزدق کے درمیان اس گفتگو سے جو نکات روشن ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

☆فرزدق ایک معاشرہ شناس انسان تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب امامؑ نے اس سے کوفہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ”لوگوں کی تلواریں آپؑ کے خلاف ہیں لیکن ان کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں۔“

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت سے آشنائی رکھتا تھا۔

☆فرزدق عقائدِ اسلامی کے حقائق ودقائق سے آگاہی اور آشنائی رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے تبصرے کے بعد اس نے کوفہ کے بارے میں اپنی معلومات کو مشیتِ الٰہی سے مربوط کیا اور وضاحت کی کہ یہ میری معلومات ہیں لیکن نہیں معلوم خدا کا فیصد کیا ہے' پس پردہ حقیقی فیصلہ خدا کا ہی فیصلہ ہوتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔

☆امام حسینؑ اپنا اس سفر میں ایک اعلیٰ وارفع مقصد کے لئے نکلے تھے۔ آپ کے یہ اہداف اتنے عظیم با مقصد اور ان کے حصول کے لئے آپؑ کے عزائم اتنے راسخ تھے کہ زمانہ کے نشیب فراز اور فتح وشکست کا تصور ان کو متزلزل نہیں کرسکتے تھے' چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں کہ۔

”ہم اگر اپنا مقصد حاصل نہ بھی کرسکے تب بھی ہم خسارے میں نہیں کیونکہ جس کی نیت حق اور شیوۂ تقویٰ ہو وہ جادۂ حق سے منحرف نہیں کہلاتا۔“

یہاں انسان کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ۔

امامؑ نے اپنے قیام وانقلاب کے لئے فرزدق جیسے دانا وبینا اور معاشرہ شناس شخص سے کیوں مدد طلب نہیں کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ۔

امامؑ نے جب اس سے یہ پوچھا کہ تم کون ہو تو اس نے اپنا نام بتانے سے گریز کیا۔ چنانچہ

امامؑ نے سمجھ لیا کہ وہ آپؑ کی نصرت سے اپنا پہلو بچانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ حسینؑ جیسا بامروت شخصیت اس سے مدد طلب کرکے اسے شرمسار کرتی۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ لوگ امام حسینؑ کو حق پر سمجھتے تھے جیسا کہ خود فرزدق کے اس جملہ سے واضح ہے کہ۔

”لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں۔“

لیکن امامؑ کو حق پر سمجھتے ہوئے بھی ان کی نصرت سے جان چراتے تھے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ حق کے مقابلے میں لوگوں کو اپنی جانیں زیادہ پیاری تھیں۔

البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وہی فرزدق ہے جس نے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد امام سجادؑ کی حمایت میں ہشام بن عبدالملک جیسے ظالم وجابر طاغوت سے ٹکر لے کر اپنے لئے خطرہ مول لیا۔ کل کے اس فرزدق اور آج کے اس فرزدق میں یہ فرق بتاتا ہے کہ۔

”کل کا فاسد انسان آج کا انقلابی اور کل کا انقلابی انسان آج کا فاسد انسان ہوسکتا ہے۔“

ذاتِ عرق

یہ اہل عراق کی میقات ہے اور نجد اور تہامہ کے درمیان واقع ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مکہ جاتے وقت ایک پہاڑ راستے میں آتا ہے جس کا نام عرق ہے' اس پہاڑ کی مناسبت سے اسے ذاتِ عرق کہتے ہیں۔

عہد جاہلیت میں یہاں کچھ آبادی تھی' جب یہ آبادی بڑھ گئی تو لوگ یہاں سے منتقل ہوگئے۔ پیغمبر اکرمؐ نے یہاں ایک جگہ پر نماز پڑھی تھی اور اس کو اہلِ عراق کے لئے میقات قرار دیا تھا بعد میں اس جگہ پر مہدی عباسی نے ایک مسجد بنائی۔ میں ابن یوسف جعفری کہتے ہیں کہ ذاتِ عرق سے ڈھائی میل پہلے ایک مسجد ہے جو مسجدِ نبی کے نام سے مشہور ہے درحقیقت میقات وہ ہے۔ یہ مسجد تہامہ کے شروع میں ہے۔ اس کو مسجدِ نجد بھی کہتے ہیں۔ وہ مسجد جو ذات

عرق میں ہے اسے مسجدِ عرق جبل کہتے ہیں۔غرض مکہ سے عراق جاتے ہوئے ذاتِ عرق راستے میں آتا ہے۔آج کل اس کو "طریق شرق" یا ذاتِ عرق مندرثہ کہتے ہیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ امام حسینؑ جب یہاں پہنچے تو بشر ابن غالب نے عراق سے آتے ہوئے یہاں امامؑ سے ملاقات کی، امامؑ نے اس سے اہلِ عراق کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ۔

"کے دل آپؑ کے ساتھ لیکن ان کی تلواریں بنی امیہ کی حمایت میں ہیں۔"

اس پر امام حسینؑ نے فرمایا کہ۔

"برادرِ اسدی نے صحیح کہا، خدا جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔"

ذاتِ عرق پر عبداللہ ریاشی نے بھی امام حسینؑ سے ملاقات کی۔وہ کہتا ہے کہ۔

"فریضہ حج سے فارغ ہونے کے بعد میں تنہا اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھا کہ میری نظر ایک خیمہ پر پڑی، میں اس خیمہ کی طرف گیا اور معلوم کیا کہ یہ کس کا خیمہ ہے تو معلوم ہوا کہ یہ حسینؑ ابنِ علیؑ کا خیمہ ہے۔میں خیمہ کے نزدیک گیا تو دیکھا کہ امامؑ اپنے خیمہ کے دروازے پر تکیہ کئے ہوئے کچھ خطوط پڑھ رہے ہیں۔میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپؑ پر فدا ہوں۔ آپؑ اس دشتِ بیابان میں کیسے کہ جہاں نہ کوئی آبادی ہے اور نہ رہائش؟"

امامؑ نے جواب دیا کہ۔

"بنی امیہ نے مجھے ڈرایا ہے۔یہ اہلِ کوفہ کے خطوط ہیں جنہوں نے مجھے بلایا ہے، یہی اہلِ کوفہ مجھے قتل کریں گے (اور دیکھنا کہ) مجھے قتل کرنے کے بعد یہ ہر حرمت کو پامال کریں گے۔خداوندِ عالم ان پر ایسا شخص مسلط کرے گا جو ان کو ختم کردے گا اور ان کو ذلیل و رسوا کرے گا یہاں تک کہ یہ لوگ خرقہ حیض سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے۔"

امام حسین علیہ السلام کے اس جواب میں اور مختصر کلمات میں چند نکات اور حقائق غور طلب ہیں۔

☆ امامؑ کا قیام ایک عام اور عادی قیام نہیں بلکہ اس وقت یہ قیام ہنگامی حالت اور خوف کے عالم میں تھا۔

☆ کوفہ کی طرف یہ سفر آپؑ نے اہلِ کوفہ کی دعوت پر اختیار کیا ہے۔

☆ امامؑ یہ جانتے ہیں کہ اہلِ کوفہ آپؑ کو قتل کریں گے۔

☆ اپنے قتل کئے جانے کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے آپؑ نے بتایا کہ۔

(الف) میرے قتل کے بعد شریعت اور حرماتِ خدا پہلے سے زیادہ پامال ہوگی اور ان کی اہانت ہوگی۔

(ب) میرے قتل کے بعد اہلِ کوفہ بھی محفوظ و مامون نہیں رہیں گے جس طرح مجھے قتل کیا گیا ان کو بھی قتل کیا جائے گا۔

(ج) میرے قتل کے بعد یہ لوگ ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔

ہم یہاں امام حسینؑ علیہ السلام کے قتل کے نتائج میں سے پہلے دو شقوں کے بارے میں کوئی بحث نہیں کریں گے (کیونکہ اس موضوع پر ہماری ایک کتاب انشاءاللہ جلد منظرِ عام پر آئے گی) بلکہ تیسری شق کے بارے میں گفتگو کریں گے جس میں آپؑ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ "میرے قتل کے بعد یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے۔"

قتلِ امامؑ کے نتیجے میں امت کی ذلت و خواری

اپنے قتل کے بعد امت کو جس ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے بارے میں متعدد بار آپؑ امت کو اپنے قتل کے بعد برآمد ہونے والے نتائج سے آگاہ کر چکے تھے چنانچہ۔

(ا) بطنِ عقبہ میں جعفر ابنِ سلیمان ضبعی سے فرمایا کہ۔

"یہ لوگ میرا خون بہا کر دم لیں گے، میرے قتل کے بعد خداوندِ عالم ایک ایسے شخص کو ان

پر مسلط کرے گا جو ان کو فرقِ حیض سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کرے گا۔"

(۲) منزلِ رہیمیہ پر کوفہ سے آنے والے ابوھرم نامی شخص نے جب آپؑ سے اس سفر کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا کہ۔

"بنی امیہ نے میرے ناموس کو سب و شتم کیا میں نے صبر کیا' میرے مال کو لوٹا میں نے صبر کیا' اب یہ میرا خون بہانا چاہتے ہیں تو میں نکل کر آیا ہوں۔ خدا کی قسم اگر انہوں نے مجھے قتل کیا تو خداوندِ عالم ان کے سروں پر ایسی تلوار مسلط کرے گا جو (مسلسل) ان کو قتل کرتی رہے گی۔ خدا ان پر ایسے شخص کو مسلط کرے گا جو ان کو ذلیل و خوار کرے گا اور یہ اس قومِ سبا سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا ہوں گے جن پر ایک عورت حکمرانی کرتی تھیں۔

(۳) امام حسین علیہ السلام نے یومِ عاشورا اپنے خطبہ میں فرمایا کہ۔

"لوگو! ہوش میں آ جاؤ اور آگاہ ہو جاؤ۔ میرے قتل کے بعد تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔ تمہیں اتنی فرصت اور مہلت بھی نہیں ملے گی جتنی (سوار ہوتے وقت) ایک رکاب میں پیر ڈالنے کے بعد دوسری رکاب میں پیر ڈالنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ انسانوں کو پیسنے والی چکی کا دور تم پر آنے کا منتظر ہے' تمہاری گردنیں اڑائے جانے کا وقت قریب ہے۔ (یاد رکھو!) یہ ایک ایسا وعدہ ہے جو میرے جد سے میرے پدر بزرگوار کے ذریعہ مجھ تک پہنچا ہے۔"

اس کے بعد امامؑ نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کئے اور فرمایا کہ۔

"خداوندا! آسمان کی بارش ان پر بند کر دے' خداوندا! جس طرح حضرت یوسفؑ کی زندانی کے دور میں اہل مصر کو قحط سالی میں مبتلا فرمایا ان کو بھی قحط سالی میں مبتلا فرما' ان پر ایک غلام ثقیف کو مسلط فرما جو انہیں موت کا مزا چکھائے کیونکہ انہوں نے ہمیں جھٹلایا ہے اور تنہا چھوڑا ہے۔ خداوندا! تو میرا رب ہے' تیری ہی ذات پر میرا بھروسہ اور توکل ہے۔"

"خدا کی قسم ان میں سے کوئی نہیں بچے گا' خدا ان سے میرا انتقام لے گا اور ہمارے ہر مقتول

کے بدلے میں ان کے ایک ایک شخص کو قتل کرے گا۔ وہ میرے اور میرے اہلِ بیتؑ اور شیعوں کی مدد کرے گا۔"

چنانچہ امام حسینؑ نے متعدد مقامات پر اپنے قتل کے بعد پیش آنے والے نتائج اور اپنے قاتلوں کے انجام سے امت کو آگاہ کیا اور بتایا کہ میرے قتل کے نتیجہ میں۔

☆ یہ لوگ بھوک' پیاس' فقر و فاقہ اور قحط سالی میں مبتلا ہوں گے۔

☆ یہ لوگ ذلیل و خوار ہوں گے۔

☆ ان سب سے انتقام لیا جائے گا۔

☆ یہ لوگ آپس میں دست و گریباں ہوں گے۔

☆ ظالم' جابر' شقی اور نا اہل حکمران ان پر مسلط ہوں گے۔

مندرجہ بالا آثار و نتائج جن کی پیشین گوئی امامؑ نے جا بجا فرمائی ان میں ایک نکتہ غور اور تحقیق طلب ہے اور قارئین کے لئے لمحہ فکریہ ہے' اور وہ یہ کہ۔

کیا یہ سب امامؑ کی بد دعا کا نتیجہ ہیں جو انہوں نے اپنے دشمنوں کے رویے' عناد و دشمنی' ظلم و ستم سے تنگ آ کر خدا کی بارگاہ میں کی اور اس یقین کے ساتھ کی کہ "حسینؑ" کا خدا امت کے حق میں "حسینؑ" کی اس بد دعا کو مستجاب فرمائے گا اور یہ امت اسی عذاب میں مبتلا ہوگی؟

یا

یہ نتائج جن کی امامؑ نے خبر دی ایک غیبی خبر ہے جو معصومؑ نے اپنے پدر و جد کے توسط سے سنی اور امت تک پہنچائی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے؟

یا پھر۔

یہ آثار و نتائج ایک قانونِ قدرت اور سنتِ الٰہی ہیں کہ جب بھی کوئی قوم اہل اور صالح قیادت کو چھوڑ کر نا اہل اور فاسد قیادت کو معاشرے میں جگہ دیتی ہے تو اس کے فطری آثار و نتائج بھی

ہوتے ہیں؟

تاریخ انسانی کا عقل و فطرت، روایاتِ ائمہؑ، انبیاءؑ اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ایک دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو اسی تیسری اور آخری شق کی تائید و توثیق ہوتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں اہل اور صالح رہبر کی قیادت سے منہ موڑ کر نااہل حکمرانوں کی قیادت کو قبول کیا جائے گا تو ان نتائج اور سزاؤں کا وقوع پذیر ہونا ایک حتمی قانون ہے، چاہے اس فاسد قیادت کو غیر شعوری اور غیر ذمہ داری کے نتیجے میں قبول کیا گیا ہو، طمع و لالچ کے تحت قبول کیا گیا ہو یا خوف و ہراس کی وجہ سے۔ اس حقیقت کا تحلیل و تجزیہ (چاہے جملہ معترضہ کی حیثیت ہی کیوں نہ رکھتا ہو) نہایت اہم اور ضروری ہے۔

(۱)۔معاشرے میں رہبر کی ضرورت

انسانی معاشرے کی ضروریات میں رہبر کی ضرورت ایسے ہی ہے جیسے لباس، غذا اور مکان کی ضرورت۔ دین و مذہب ہی نے رہبری کی ضرورت کا احساس نہیں دلایا بلکہ دین و مذہب سے پہلے بھی ہر معاشرے میں رہبر کی ضرورت انسانی زندگی کی ضروریات میں شمار ہوتی تھی۔ لہٰذا ہر انسانی معاشرہ چاہے وہ صالح ہو یا غیر صالح، مومن ہو یا منافق، مسلمان ہو یا کافر۔ کسی نہ کسی رہبر کا محتاج اور نیازمند ہے۔

(۲)۔شریعت میں رہبر کی اہمیت

شریعتِ اسلامی میں جہاں نماز، روزہ، حج، زکات اور جہاد کی اہمیت کو واضح کیا گیا وہاں ایک صالح رہبر کی اہمیت کو بھی شد و مد کے ساتھ نہ صرف اجاگر کیا گیا ہے بلکہ ان سب پر مسئلہ رہبریت کو فوقیت اور اولویت دی گئی ہے۔ چنانچہ بعض روایات کے تحت شریعت میں فروعِ دین اور اصولِ دین کی اہم شقوں کے فروغ و نفاذ کو رہبریت کے مسئلہ سے مربوط کیا گیا ہے۔ اور اس کا انحصار ایک صالح رہبر کے وجود کا مرہونِ منت بتایا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ ایک صالح رہبر ہی

معاشرے میں توحید، خدا پرستی، انبیاء اور مرسلین کے احترام و تکریم اور عقیدۂ معاد کی طرف رغبت و تشویق دلاتا ہے۔

چنانچہ امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ۔

"اسلام کی بنیاد نماز، روزہ، حج، زکات اور ولایت پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ لیکن جتنی اہمیت ولایت کو حاصل ہے اور اسلام میں جتنی سفارش ولایت کے بارے میں کی گئی ہے اتنی پہلے چار ستونوں کے بارے میں نہیں کیونکہ ولایت ہی ان چار ستونوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن لوگوں نے بدقسمتی سے پہلے چار ستونوں کو اہمیت دی اور ولایت سے روگردانی اختیار کی۔"

(۳)۔فاسد اور نااہل رہبر اور جرائم کا فروغ

بعض آیاتِ قرآنی اور روایاتِ پیغمبر اور ائمہؑ کے تحت معاشرے میں موجود تمام برائیوں کی جڑ فاسد اور فاسق رہبر ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ تمام برائیاں فاسد قیادت ہی کے ذریعے پھیلتی ہیں۔

حکمرانوں کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی حکومت کی مدت کو دراز کریں۔ اس کے لئے وہ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے اور اپنی حکومت کو دوام و بقا بخشنے کی خاطر ان کے لئے ناپسندیدہ امور، برائیوں اور جرائم سے پرہیز ناگزیر ہے۔ ان کی اس پرہیزگاری کو دو قوتوں کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک داخلی قوت اور دوسرے بیرونی قوت۔

داخلی قوت

نااہل اور فاسد حکمرانوں کی زندگی چونکہ علم و تقویٰ جیسی نعمت سے عاری ہوتی ہے۔ وہ اپنی نادانی و جہالت، نفسانی خواہشات اور اندرونی خباثت کہ جو ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے زیادہ دیر تک چھپا کر اور دبا کر نہیں رکھ سکتے۔ ان کی اندرونی خباثت انہیں بار بار سرکشی پر ابھارتی رہتی ہے

اور آخر کار پردہ چاک ہو جاتا ہے اور ان کے جرائم جب آشکار ہونے لگتے ہیں تو وہ ان پر پردہ ڈالنے اور چھپانے کے لئے مزید جرائم کا ارتکاب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ایک گناہ کو چھپانے کے لئے انہیں دوسرا گناہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ نا اہل اور فاسد حکمرانوں کی مجرمانہ ذہنیت جو بار بار ان کو ایک کے بعد دوسرے جرم پر مجبور کرتی ہے ان کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے جس کا انہیں سامنا ہوتا ہے۔

بیرونی قوت

ہر قوم و معاشرہ میں نا اہل اور فاسد حکمرانوں کے مقابلے میں باشعور لائق اور اہل افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو ایک صالح قیادت کے اہل بھی ہوتے ہیں اور خواہاں بھی۔ چنانچہ یہ لوگ ہمیشہ حکمرانوں کے لئے ایک خطرہ اور چیلنج ثابت ہوتے ہیں لہٰذا حکمرانوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مقام و منصب یا ثروت و دولت کی رشوت دے کر ان کو خاموش کر دیا جائے یا خوف و ہراس دھونس دھمکی قید و بند اور جلا وطنی کے ذریعہ انہیں دور رکھا جائے ورنہ پھر ان کے وجود ہی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس قسم کے جرائم کا ارتکاب فاسد اور نا اہل حکمرانوں کو اپنی حکومت کے بقاء دوام کے لئے ناگزیر ہے۔

(۴) ۔امتِ واحدہ یا منتشر اور متفرق امت

انسانی معاشرہ میں با فضیلت، شرافت اور عدالت پسند افراد کی نگاہیں ہمیشہ ایک صالح رہبر کی طرف لگی رہتی ہیں اور ان کی امیدیں اسی صالح قیادت سے وابستہ رہتی ہیں۔ ایک صالح رہبر کی امیدوں کا مرکز بھی ایسی ہی باشعور امت ہوتی ہے جس کی مدد اور تعاون سے وہ ظالم و فاسد حکمرانوں سے ٹکر لینے اور نبرد آزما ہونے کے لئے کمر باندھتا ہے۔ ادھر فاسد حکمران امت کی توجہ ایسی صالح قیادت کی طرف سے ہٹانے کے لئے خود کو فعال اور با کردار حکمران کے روپ میں پیش کرنے کے لئے اصلاحات کا ڈھونگ رچاتے ہیں، خود اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش

کرتے اور معاشرے میں جرائم پر قابو پانے کے لئے خود کو فعال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور امت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بیت المال کے دروازے کھولنے اور خزانوں کو لٹانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کبھی عام معافی کا اعلان کر کے عادی مجرموں کو بھی آزاد کرتے ہیں تا کہ امت کے نہ صرف نیک اور صالح افراد بلکہ فاسق و فاجر لوگ بھی وقتی طور پر خوش ہو جائیں۔ ان کی تمام نیکیاں اور عوام سے ہمدردیاں صرف دکھاوے کی ہوتی ہیں۔ ان کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد امت کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ مقصود عوام کو صالح قیادت سے کاٹنا اور صالح رہبر کو یک و تنہا کرنا ہوتا ہے تا کہ بعد میں اسے مفسد فی الارض اور قانونی سزا کا مستحق قرار دے کر راستے سے ہٹایا جا سکے۔ صالح قیادت کو ایک مرتبہ راستہ سے ہٹا کر اور میدان کو اپنے حریف و رقیب سے خالی دیکھ کر یہ سیاسی بازی گر پھر اپنے ابلیسی عزائم میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کی انتقامی حس پھر جوش میں آ جاتی ہے اور پھر ان تمام لوگوں سے یہ گن گن کر بدلہ لیتے ہیں جنہوں نے صالح قیادت کا ساتھ دیا تھا۔ معاشرے میں ان کو ذلیل و خوار کیا جاتا ہے، کبھی ان کو خانہ جنگیوں میں مصروف رکھتے ہیں اور کبھی جنگوں میں دھکیل دیتے ہیں، ان کو نان و نفقہ کی فکر میں مصروف کر کے اقتصادی طور پر مفلوج کرتے ہیں تا کہ وہ کوئی آواز نہ اٹھا سکیں یہاں تک کہ ان کی سوچ بھی مفلوج ہو کر رہ جائے اور آئندہ اہل و نا اہل رہبر کے بارے میں وہ سوچ ہی نہ سکیں۔

چنانچہ یہ وہ طبیعی اور ناگزیر آثار ہیں جو کسی نا اہل اور فاسد حکمران کے برسر اقتدار آنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل اور مسلم ہے کہ ایک مرتبہ اگر کسی نا اہل اور فاسد رہبر کو قبول کر لیا جائے چاہے وقتی اور مختصر مدت کے لئے ہی کیوں نہ ہو تو پھر کسی صالح قیادت کا میسر آنا اتنا آسان نہیں۔ کسی فاسد حکومت کی وراثت میں اس سے بدتر اور فاسد تر حکومت تو وجود میں آ سکتی ہے صالح قیادت نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صالح قیادت

کے وجود میں آنے کے امکانات معدوم سے معدوم تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھر کسی صالح قیادت کو وجود میں لانے کے لئے نہ معلوم آگ و خون کے کتنے دریا عبور کرنا پڑتے ہیں؟

پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد جب قیادت کا رخ اپنے صحیح مرکز سے ہٹا کر نااہل لوگوں کی طرف موڑ دیا گیا اور قائد کو نہیں بلکہ قیادت کو اس کے اہل اور شرعی وارثِ حقیقی سے محروم کر دیا گیا تو جناب زہرا سلام اللہ علیہا نے اپنے پدر بزرگوار کی امت اور عالمِ انسانیت کو پیش آنے والی مصیبتوں کو درک کیا اور بے تابانہ گھر سے نکل آئیں اور کبھی فدک کے بہانے اور کبھی کسی اور وسیلہ سے سقیفہ کی نااہل قیادت کے خلاف اپنی صدائے احتجاج کو ہر ہر موقع پر بلند کرتی رہیں اور ساتھ ہی امت کو آئندہ پیش آنے والی مصیبتوں سے خبردار کرتی رہیں جو انہوں نے ابوالحسنؑ کی صالح قیادت سے منہ موڑ کر اور نااہل قیادت کا دامن تھام کر خود مول لیں تھیں۔ چنانچہ زہراء مرضیہؑ کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق دنیائے انسانیت ان فاسد اور نااہل حکمرانوں کے ظلم وستم کی چکی میں آج تک پستی چلی آ رہی ہے اور معاویہ، عبیداللہ ابن زیاد، یزید، خلفائے بنی عباس، سلطنتِ عثمانیہ، برطانوی امپیریلزم، روسی سوشلزم، صدام اور امریکہ کی یہود نواز حکومت کے شکنجے میں آج تک انسانیت سسک رہی ہے۔

حاجر

لفظ حاجر حجر سے لیا گیا ہے جس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ یہ ایک وادی ہے جو بطن رمہ کے بعد آتی ہے۔ اسی وادی کا نام حاجر ہے۔ بصرہ سے مدینہ جانے والے اور کوفہ سے مدینہ جانے والے یہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں، یعنی یہ بصرہ سے مدینہ جانے والے اور کوفہ سے مدینہ جانے والے راستے کا سنگم ہے۔

امام حسین علیہ السلام جب حاجر پہنچے تو آپؑ نے قیس ابن مسہر صیداوی کے ہاتھ ایک خط کوفہ والوں کو روانہ کیا۔

قیس ابنِ مسہر صیداوی ایک صالح جوان تھے اور اشراف بنی اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ امام حسینؑ کے مکہ آنے کی خبر سن کر یہ اہلِ کوفہ کی طرف سے خط لے کر امامؑ کو دعوت دینے مکہ گئے۔ مکہ سے امامؑ کے سفیر حضرت مسلم بن عقیل کے ہمراہ واپس کوفہ آئے اور کوفہ سے اہلِ کوفہ کا خط لے کر دوبارہ مکہ گئے، مکہ سے امام حسینؑ کے ساتھ نکلے۔ امامؑ جب حاجر میں بطنِ رمہ کے مقام پر پہنچے تو قیس ابنِ مسہر صیداوی دوبارہ امامؑ کی طرف سے خط لے کر امامؑ کی آمد کی خوشخبری دینے کے لئے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب قادسیہ پہنچے تو حصین ابنِ نمیر نے ان کو گرفتار کر لیا۔ قیس ابنِ مسہر نے گرفتار ہوتے ہی وہ خط پھاڑ دیا۔ حصین ابن نمیر نے ان کو عبیداللہ ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے ان سے ان لوگوں کے نام معلوم کرنے کی کوشش کی جن کے نام وہ امام حسینؑ کا خط لائے تھے لیکن انہوں نے ان کے نام بتانے سے بالکل انکار کر دیا۔ عبیداللہ ابنِ زیاد نے ان کو مجبور کیا کہ وہ منبر پر جا کر امیرالمومنین امام علی علیہ السلام اور امام حسینؑ پر سب وشتم کریں۔ قیس ابنِ مسہر منبر پر گئے اور وہاں جا کر حضرت علی اور امام حسینؑ کی بجائے الٹا عبیداللہ اور اس کے باپ اور اس کے امیر پر لعنت کی اور کوفہ والوں کو امامؑ کی آمد سے آگاہ کیا۔ (نقل از طبری۔ جلد ۵)

بعض مقاتل اور تاریخوں کے مطابق آپؑ نے یہ خط عبداللہ ابن یقطر الحمیری ☆ کے ساتھ روانہ کیا۔ لیکن زیادہ تر تاریخ میں قیس ابنِ مسہر صیداوی کا نام آیا ہے کہ وہ یہ خط لے کر کوفہ گئے۔ لیکن چونکہ عبداللہ ابن یقطر بھی عبداللہ ابن زیاد کے ہاتھوں شہید ہوئے جیسا کہ قیس ابنِ مسہر شہید ہوئے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ جب حضرت مسلم کے ساتھ کوفہ گئے تو واپسی پر کوفہ سے نکلتے ہوئے قادسیہ کے مقام پر حصین ابن نمیر کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ہوں اور ابن زیاد نے انہیں شہید کیا ہو یا پھر امام حسینؑ نے ان کو کسی اور جگہ سے کوفہ بھیجا ہو۔

☆ (نوٹ): عبداللہ ابن یقطر کو امام حسین علیہ السلام کا رضاعی بھائی کہا جاتا ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے۔ اس لئے کہ روایات بتاتی ہیں کہ امام حسینؑ نے کسی خاتون کا دودھ نہیں

پیا۔ یہاں تک کہ اپنی مادرِ گرامی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کا بھی دودھ نہیں پیا کیونکہ وہ اس وقت علیل تھیں ۔امام حسینؑ نے عہدِ طفلی میں اپنی خدا پیغمبر اکرمؐ کی زبانِ مبارک اور انگشتِ مبارک سے حاصل کی ۔(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)(بقیہ گزشتہ صفے کا حاشیہ)بعض روایات کے مطابق آپؑ نے جناب زہراء مرضیہؑ کے دودھ اور پیغمبر اکرمؐ کی زبان اور انگشت کے علاوہ کسی خاتون کا دودھ نہیں پیا۔

یہ اشتباہ شاید اس وجہ سے ہوا کہ عبداللہ ابنِ یقطر کی والدہ امام حسینؑ کی مربی تھیں جیسا کہ فضل ابنِ عباس کی والدہ ام الفضل لبابہ آپؑ کی مربی تھیں ۔درحقیقت عبداللہ یقطر لدہ امام حسینؑ ہیں ۔یعنی عبداللہ یقطر بھی اسی روز پیدا ہوئے تھے کہ جس روز امام حسینؑ پیدا ہوئے تھے۔

بہر حال امام حسینؑ کے اس خط کا مضمون یہ تھا۔

”درود وسلام کے بعد معلوم ہو کہ مجھے مسلم ابن عقیل کا خط ملا جس سے معلوم ہوا تم سب اس بات پر متفق ہو کہ میں تمہارے پاس کوفہ پہنچوں ۔ میں خداوندِ بزرگ و برتر کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں نیک توفیق اور تمہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

تمہاری متفقہ اور متحدہ دعوت پر میں ۸/ذی الحجہ بروز منگل مکہ چھوڑ کر تمہاری طرف آنے کے لئے نکل کھڑا ہوا ہوں ۔ میں جلد ہی تمہارے پاس پہنچنے والا ہوں ۔ میرا یہ خط ملتے ہی تم منظم اور مربوط طور پر اپنی تحریک میں تیزی شروع کردو۔“

امامؑ کے اس خط سے آپؑ کے قیام وانقلاب کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔

☆ امامؑ نے ان کے اتحاد واتفاق پر خوش اور مطمئن ہو کر ان کے حق میں دعا فرمائی۔

☆ آپؑ اس وقت مکہ سے نہیں نکلے جب تک حضرت مسلم بن عقیل نے اس امر کی تائید وتصدیق نہیں کردی کہ اہل کوفہ واقعاً متفق اور متحد ہو کر آپؑ کی قیادت کے منتظر ہیں ۔یعنی آپؑ اہلِ کوفہ کے خطوط اور ان کے نمائندوں کی دعوت پر اس وقت تک نہیں گئے جب تک کہ ان کے صدق وخلوص کی تائید حضرت مسلم کی طرف سے نہیں ہوگئی۔

☆ کوفہ والوں کی دعوت اور امامؑ کا اس دعوت کو قبول کرنے کا مرکزی نقطہ امامؑ کی نصرت کرنا اور غاصبوں سے ان کا حق چھین کر آپؑ کو دلوانا ہے۔

☆امامؑ کا اپنے اس خط میں یہ تحریر کرنا کہ تم منظم اور مربوط انداز میں اپنی تحریک میں تیزی شروع کردو۔اس بات کو واضح کرتا ہے کہ آپؑ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ دشمن بڑی تیزی سے آپؑ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں لہٰذا دشمن سے یہ موقع چھین لینا چاہئے۔

عیون

حاجر سے آگے یہ ایک جگہ ہے جہاں سے چند چشمے نکلتے ہیں ۔عبداللہ ابنِ مطیع عدلی یہاں رہتے تھے ۔وہ کہتے ہیں کہ۔

”میں نے جب دیکھا کہ امام حسینؑ کا رخ عراق کی طرف ہے تو میں ان کی خدمت میں گیا اور کہا کہ فرزندِ رسولؐ خدا آپؑ کی حرمت کو بچانے میں آپؑ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپؑ اپنی حرمت کو ضائع ہونے سے بچائیں ۔خدا کی قسم جو چیز بنی امیہ کے قبضہ میں ہے اسے اگر آپؑ کو قتل کردیں گے اور آپؑ کو قتل کرنے کے بعد تو وہ اور بھی نڈر ہو جائیں گے اور کسی کو بھی قتل کرنے سے نہیں جھجکیں گے ۔قریش کو بھی قتل کردیں گے ۔خدا کے لئے آپؑ قریش کی حرمت کو بچائیں۔“

امامؑ نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔عبداللہ ابن مطیع کے اس خطاب سے اس کی سوچ وفکر کے چند پہلو سامنے آتے ہیں ۔

☆عبداللہ ابن مطیع کی فکر میں عربی تعصب اور نیشنلزم رچی بسی ہوئی تھی ۔ وہ اسلام کو قریش اور عرب نیشنلزم کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور امامؑ کو اپنے ارادے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں

-

☆وہ "حسین" کو فرزند رسولؐ ہونے کی حیثیت سے زیادہ ان کے ذاتی حسن وجمال' کمال وشجاعت اور ان کی محبت وشفقت کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور ان سے اپنی ذاتی محبت ووابستگی کے نتیجہ میں ان کی جان کے زیاں کے خیال سے انہیں اپنے اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے آگے وہ "حسینؑ" کی معرفت نہیں رکھتے اور نہیں جانتے کہ "حسینؑ کے کاندھوں پر کتنی عظیم ذمہ داری ہے اور وہ اپنی کس الٰہی مسئولیت کی ادائیگی کے لئے نکلے ہیں۔

چنانچہ آج بھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں عبداللہ بن مطیع "حسینؑ" سے اپنی وابستگی اور پیوستگی کا اظہار صرف علم وضریح اور ذوالجناح سے عقیدت میں سمجھتے ہیں اور نہ "حسینؑ" کو درک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ان کے ہدف ومقصد کو۔

یہ لاکھوں عبداللہ ابن مطیع نہیں جانتے کہ "حسینؑ" ابن علیؑ کے مشن کی تکمیل کی ذمہ داری آج بھی اسی طرح ان کے ذمہ ہے جس طرح کل کربلا میں "حسینؑ" کے انصار واعوان کے ذمہ تھی۔ یہ لوگ صرف "حسینؑ" کی ذات سے وابستہ اور پیوستہ ہیں ان کے مشن اور ہدف سے نہیں۔ یہ لوگ نہیں پہچانتے کہ "حسینؑ" فرزند رسولؐ ہونے اور ذاتی فضائل وکمالات کے حامل ہونے کے علاوہ محافظِ قرآن وشریعت بھی ہیں' وارثِ انبیاء بھی اور اسلام کے رکھوالے بھی۔

چنانچہ عبداللہ ابن مطیع جیسے لوگوں نے "حسینؑ" کی ذات کے لئے خطرہ دیکھا انہوں نے حسینؑ کا ساتھ نہیں دیا اور جن لوگوں نے اسلام اور دین وشریعت کے لئے خطرہ محسوس کیا ان لوگوں نے امامؑ کا ساتھ دیا۔

☆عبداللہ ابن مطیع کے خطاب سے ایک اور چیز واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ امامؑ جس چیز کے حصول کے لئے جا رہے ہیں وہ بنی امیہ کے قبضہ میں ہے اور وہ چیز حکومت وخلافت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔

عبداللہ ابن مطیع یہ بھی درک کر رہا تھا کہ "حسینؑ" بنی امیہ سے جس چیز کے حصول کے لئے

جا رہے ہیں اس کے حصول کی کوشش کی سزا بنی امیہ کی طرف سے کم از کم موت ہے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ظالم حکومتیں اپنے خلاف کسی قیام اور انقلاب کی سزا موت سے کم نہیں دیتیں۔

☆عبداللہ ابن مطیع نے جب یہ کہا کہ بنی امیہ سے جو چیز آپ چھیننے جا رہے ہیں اس کا نتیجہ موت ہے تو امامؑ نے اس کی تردید نہیں کی۔ اس سے کم از کم یہ بات تو واضح ہے کہ اس کا تجزیہ غلط نہیں تھا ورنہ امامؑ اس کی تردید کرتے۔

☆امامؑ نے عبداللہ ابن مطیع کے مشورہ کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کو کوئی جواب دیئے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھا۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ وہ قتل ہو جانے کے خوف سے امامؑ کو ان کے ہدف ومقصد سے روکنے کی بات کر رہا تھا اس لئے آپؑ نے اسے جواب دینے سے گریز کیا۔

خزیمیہ

خزیمیہ خزم کا اسمِ تصغیر ہے۔ مکہ اور کوفہ کے درمیانی منازل میں سے کوفہ سے نزدیک یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ کوفہ سے مکہ آتے ہوئے یہ جگہ زورد کے بعد آتی ہے۔ بعض نے کہا کہ کوفہ سے آتے ہوئے یہ جگہ ثعلبیہ کے بعد آتی ہے۔ معجم بلدان میں لکھا ہے کہ خزیمیہ اور ثعلبیہ کے درمیان بتیس میل کا فاصلہ ہے۔ یہ جگہ بنی نہشل اور اسد سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں چھ کنویں ہیں' پانی کے چشمے ہیں' درخت ہیں اور کچھ آبادی ہے۔ امام حسینؑ نے یہاں ایک دن اور ایک رات قیام کیا۔ اسی جگہ پر عقیلہ قریش زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے امام حسین علیہ السلام سے کہا کہ میں نے ہاتف سے صدا سنی جو یہ شعر کہہ رہا تھا کہ۔

"یہ قافلہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے اور موت ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

امامؑ نے کہا کہ۔

"بہن! خدا کی جو مشیت ہے وہ پوری ہو کر رہے گی۔"

زورد

اوردا ایک جگہ کا نام ہے جہاں کوفہ سے آنے والے حاجی قیام کرتے ہیں ۔یہ مقام کوفہ سے آتے ہوئے خزیمیہ سے ایک میل پہلے واقع ہے ۔اس کو زورد کہنے کی دو وجہ ہیں ۔

(۱) ۔حلق سے نیچے اتر جانے کو زورد کہتے ہیں ۔چونکہ یہ ریگستانی علاقہ ہے اور یہاں کی زمین بارش کے پانی کو فوراً جذب کر لیتی ہے اس لحاظ سے اس جگہ کو ''زورد'' کہتے ہیں ۔

(۲) ۔ابن کلبی کہتے ہیں کہ یثرب بن قانیہ کی تین بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک کا نام زورد تھا ۔چنانچہ اس کی بیٹی ''زورد'' کے نام سے یہ جگہ منسوب ہے ۔اس کے علاوہ ایام جاہلیت میں بنی ترعب اور بنی یربوع کے درمیان اس جگہ جنگ لڑی گئی لہٰذا تاریخ عرب میں وہ دن یوم زورد کے نام سے مشہور ہے ۔

یہ وہ مقام ہے جہاں زہیر ابن قین بجلی کی ملاقات امام حسین علیہ السلام سے ہوئی ۔زہیر ابن قین شیعیانِ امام حسینؑ یا شیعیانِ علیؑ میں سے نہیں تھے بلکہ وہ عثمانی العقیدہ تھے ۔زہیر حج کے بعد مکہ سے واپس آ رہے تھے ۔ادہر امام حسینؑ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے ۔اثنائے سفر میں زہیر امام حسینؑ کا سامنا کرنے سے گریز کر رہے تھے ۔وہ اپنے کاروان کا خیمہ امامؑ کے خیمہ سے آگے یا پیچھے ذرا فاصلہ پر نصب کرتے تھے تاکہ آمنا سامنا نہ ہو ۔ایک مرتبہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ان کو اپنا خیمہ امامؑ کے خیمہ کے قریب نصب کرنا پڑا ۔خیمہ نصب کرنے کے بعد وہ کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے کہ امامؑ کا قاصد ان کے پاس پہنچا اور سلام کے بعد پوچھا کہ آپ میں سے زہیر کون ہیں اُنہیں امام بُلا رہے ہیں ۔یہ سن کر ایک خاموشی طاری ہو گئی کسی نے کوئی جواب نہیں دیا ۔اس خاموشی کو زہیر ابنِ قین کی نیک اور صالحہ زوجہ دلہم بنتِ عمرو نے توڑا اور تعجب سے زہیر سے کہا کہ ۔

''سبحان اللہ !فرزندِ رسولؐ تم کو بلا رہے ہیں اور تم ان کی آواز پر لبیک نہیں کہتے ۔''

تاریخ اور مقاتل لکھتے ہیں زہیر بادلِ نخواستہ اور چہرے پر ناگواری کے تاثرات کے ساتھ امامؑ کے خیمہ میں گئے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد فرحاں وشاداں امامؑ کے خیمہ سے واپس آئے ۔اپنے خیمہ میں واپس پہنچے اور اپنے خیموں کو امامؑ کے خیموں کے ساتھ لگانے کے لئے کہا ۔اپنی نیک صفت زوجہ سے کہا کہ میں تم کو اجازت دیتا ہوں 'تم چلی جاؤ' میں نہیں چاہتا کہ تم خیر کے علاوہ کوئی بُری خبر سنو ۔پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ ۔

''ہم سلمان فارسی کے ہمراہ بلنجر میں جنگ کے لئے گئے ہوئے تھے جس میں ہمیں فتح نصیب ہوئی بلنجر فتح ہوا اور ہمیں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا ۔ہم بہت شاداں اور مسرور تھے ۔ہمیں خوش ومسرور دیکھ کر سلمان فارسی نے کہا کہ اگر تم جوانانِ آلِ محمدؐ کو درک کر سکو تو اس مالِ غنیمت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خوشی اور مسرت محسوس کرو گے ۔جس دن تم نے آلِ محمدؐ کو درک کر لیا اس کے بعد ان کے مقابلہ میں اس مالِ غنیمت کی تمہاری نظروں میں کوئی قیمت وقعت نہیں رہے گی ۔''

یہ واقعہ سنا کر زہیر نے اپنے ساتھیوں کو الوداع کہا اور کہا کہ تم میں سے جو بھی میرے ساتھ امام حسینؑ کی نصرت کرنا چاہتا ہے وہ میرے ساتھ آ جائے ورنہ یہ ہماری اور تمہاری آخری ملاقات ہے ۔یہ سن کر زہیر کی زوجہ مومنہ نے اپنے شوہر کے لئے دعائے خیر کی اور استدعا کی جب حسینؑ کے جد سے ملاقات ہو تو مجھے فراموش نہ کر دینا ۔

ثعلبیہ

ثعلبیہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے کوفہ کے راستہ میں خزیمیہ کے بعد آتی ہے ۔ثعلبیہ کے بعد شقوق آتا ہے ۔مکہ سے ثعلبیہ پہنچنے کے بعد کوفہ کا دو تہائی راستہ طے ہو جاتا ہے ۔زجاجی کے قول کے مطابق یہ جگہ ثعلبہ بن مالک بن وودان بن اسد سے منسوب ہے ۔اس نے یہاں ایک کنواں کھودوا تھا ۔

جیسا کہ کتاب ''زندگانی امام حسینؑ'' اور ''اعیان الشیعہ'' میں لکھا ہے۔

ثعلبیہ پر امام حسین علیہ السلام کی ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جس نے آپ سے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت اے ''یوم ندعوا کل اناس بامامھم ۔۔۔۔۔'' کی تفسیر پوچھی۔ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ امام و رداعی دو قسم کے ہوتے ہیں اسی طرح ان کی دعوت کو قبول کرنے والے لوگ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔ ایک وہ امام جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں اور لوگوں کا ایک گروہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسے قبول کر لیتا ہے۔ جب کہ کچھ امام ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو ضلالت اور گمراہی کی طرف بلاتے ہیں اور وہ ان کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے آپؑ نے فرمایا کہ ''پہلا گروہ جنت میں جائے گا جب کہ دوسرا گروہ جہنم میں۔'' آپؑ اپنی اس تفسیر کے استدلال میں قرآن کی یہ آیت پیش کی ۔

''فریق فی الجنۃ فریق فی السعیر ۔۔۔۔''

(نقل از کتاب نہج الشہادۃ۔ص ۲۴۶)

آپؑ نے دونوں قسموں کے ائمہ کے نسب و خاندان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ہم نے اور بنی امیہ نے خدا کے بارے میں ایک دوسرے سے دشمنی کی ہماری یہ دشمنی قیامت تک باقی رہے گی۔ حضرت جبرئیل ایک پرچم لے کر آئے جو انہوں نے ہمارے درمیان نصب کیا۔ (اس کے مقابلہ میں) ابلیس بھی اپنا باطل پرچم لے کر آیا جو اس نے بنی امیہ کے درمیان نصب کیا۔'' (نہج الشہادۃ۔ص ۳۸۸)

امام علیہ السلام نے یہاں حق و باطل کی شناخت کے لئے کسوٹی اور معیار نسب و خاندان کو قرار دیا۔ یعنی و باطل کی تمیز کرنے والے کے ذہن میں یہ امر واضح رہے کہ ایک طرف ''بیت نبوت'' ہے اور دوسری طرف ''بیت امیہ''۔

جب نصر ابن مالک نے امامؑ سے آیت ''ھذاان خصمان ۔۔۔۔'' (سورہ حج۔ آیت

۱۹) کی تفسیر پوچھی تو آپؑ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ہمارے اور بنی امیہ کے درمیان خدا کے بارے میں اختلاف ہے۔''

یعنی آپؑ نے حق باطل کا معیار اور کسوٹی ''قول و فعل'' کو قرار دیا اور فرمایا کہ ہمارا جھگڑا نہ خاندانی ہے اور نہ مقام و منصب کے لئے اور نہ ہی زر و زمین کے لی ء ے بلکہ ہمارا جھگڑا خدا کے بارے میں ہے۔ ہم نے کہا کہ ''خداوند عالم نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے چنانچہ ہم نے اپنے قول و فعل سے خدا کی تصدیق کی جب کہ بنی امیہ نے خدا کو جھٹلایا۔''

حارث ابن عاذر نے امام حسینؑ سے ''والشمس والضحٰھا، والقمر اذا تلٰھا والنھار اذا جلّٰھا واللیل اذا یغشٰھا'' کی تفسیر پوچھی تو آپؑ نے فرمایا کہ:

''شمس'' سے مراد پیغمبرؐ ہیں۔

''قمر'' سے مراد علیؑ ہیں۔

''نہار'' سے مراد امام زمانہ ہیں۔

اور

''لیل'' سے مراد بنی امیہ ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے امام و داعی کی شناخت کے لئے آثار و علامات کی وضاحت فرمائی ہے کہ امام حق کی پہچان ۔۔۔۔۔ نور و ضیاء ہے۔ امام حق لوگوں کو تاریکی میں نہیں رکھتا بلکہ اس کی دعوت ہمیشہ روشن اور واضح ہوتی ہے۔ جب کہ امام باطل کی علامت تاریکی اور ضلالت ہے وہ لوگوں کو دھوکے اور تاریکی میں رکھتا ہے اور ایک دن ضلالت کی گمرائیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے پوچھا کہ۔

''ناس'' کون ہیں؟

''اشباہ الناس'' کون ہیں؟

اور ''نسناس'' کون ہیں؟

تو حضرتؑ نے اپنے فرزند امام حسینؑ سے سائل کے سوال کا جواب دینے کے لئے کہا۔امام حسینؑ نے فرمایا کہ:

''ناس'' ہم ہیں۔

یعنی وہ تمام خصوصیات اور امتیازات جو ایک انسانِ کامل میں ہونا چاہئیں اس کا مصداق ہم ہیں۔آپؑ نے اپنے جواب کا استدلال اس آیت سے کیا۔

''افیضوا من حیث افاض الناس'' (سورۂ بقرہ۔آیت ۱۹۹)

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا کہ:

''اشباہ الناس'' ہمارے تابعین اور شیعہ ہیں۔وہ ہم سے ہیں۔''

اپنے اس جواب کا استدلال آپؑ نے اس آیت سے فرمایا۔

''فمن تبعنی فانہ منی''

پھر آپؑ نے فرمایا کہ:

''نسناس'' تمام عام لوگ ہیں۔

اور اس کے استدلال میں آپؑ نے یہ آیت پیش فرمائی۔

''۔۔۔۔کالانعام بل ھم اضل۔۔۔۔'' (سورۂ اعراف۔آیت ۱۷۹)

ثعلبیہ میں عبداللہ ابن سلیم اور منذر ابن مشعل نامی دو اشخاص نے امام حسینؑ سے ملاقات کی۔یہ دونوں آدمی امام حسینؑ کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔انہوں نے منزلِ زرود پر دیکھا کہ امام حسینؑ کوفہ سے آنے والے ایک شخص کی طرف شاید اس خیال سے بڑھے کہ اس سے کوفہ کے حالات معلوم کریں تو اس شخص نے اپنا راستہ بدل دیا اور امامؑ سے ملاقات سے گریز کیا۔لیکن عبداللہ ابن سلیم اور منذر ابن مشعل نے کہ جو امامؑ کے پیچھے پیچھے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے اس شخص کو

جالیا اور اس سے کوفہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔کوفہ کی خبروں میں سے اہم خبر حضرت مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبر تھی۔منزل ثعلبیہ پر یہ دونوں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارے پاس کچھ خبریں ہیں' آپ چاہیں تو ہم یہیں بیان کریں اور اگر چاہیں تو خلوت میں بیان کریں۔امامؑ نے اپنے اصحاب کی طرف نظر کی اور فرمایا کہ میں اپنے اصحاب سے کچھ نہیں چھپاتا' تمہارے پاس جو خبر ہے سناؤ۔انہوں نے عرض کیا کہ منزلِ زرود پر جس شخص سے آپ کوفہ کے حالات پوچھنا چاہتے تھے وہ ہم نے اس سے معلوم کر لئے ہیں۔وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور معتبر انسان ہے۔اس نے بتایا کہ ''میں ابھی کوفہ سے نکلا نہیں تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو شہید کر دیا گیا۔امامؑ نے اپنے دو جانثاروں کی خبر سن کر آیتِ عہد کی تلاوت فرمائی اور ان کی مصیبت پر گریہ اور افسوس کرنے کے بعد صلاح اور مشورے کے لئے اپنے اصحاب کا ایک اجلاس طلب کیا۔

ثعلبیہ میں امام حسینؑ کی اپنے اصحاب کے ساتھ میٹنگ

اگر چہ کسی مقاتل یا تاریخ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ امامؑ نے صلاح و مشورے کے لئے اپنے اصحاب کا کوئی اجلاس طلب کیا ہو' لیکن قرائن' حالات اولادِ عقیل سے امام کی گفتگو' آگے سفر جاری رکھنے یا واپس لوٹ جانے کے سلسلہ میں اصحاب امامؑ میں اختلاف رائے۔۔۔۔۔یہ تمام حقائق نشاندہی کرتے ہیں کہ ایک ایسا اجتماع یقیناً وجود میں آیا ہو گا۔اس سلسلے میں ہم چند شواہد پیش کرنا چاہیں گے۔

☆مقاتل میں لکھا ہے کہ منزلِ ثعلبیہ پر امامؑ کو جب حضرت مسلم بن عقیل اور ہانی ابن عروہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپؑ نے کلمہ استرجع اپنی زبان پر جاری کیا' اولادِ عقیل کی طرف نظر کر کے دیکھا' ان کو پرسہ دیا اور ان سے پوچھا کہ اب ان کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے یک زبان ایک عزم کے ساتھ کہا کہ ہم وہی راہ اپنائیں گے جس راہ میں مسلمؑ قربانی دی۔

امامؑ نے فرمایا کہ:

''ان کے بعد اب زندگی بے کیف ہے۔''

چنانچہ مقاتل کی رو سے کم از کم یہ تو ثابت ہے کہ امامؑ نے اولادِ عقیل کو جمع کیا اور ان سے رائے طلب کی۔

☆مقاتل اور تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت مسلمؑ اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبر سننے کے بعد امامؑ کے بعض اصحاب نے کہا کہ ''ہمیں یہاں سے واپس جانا چاہیے'' جب کہ بعض نے کہا کہ ''نہیں ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے' حالات جو بھی ہوں ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔''

بعض اصحاب کا یہ کہنا کہ ''ہمیں یہاں سے واپس جانا چاہئے'' اور بعض اصحاب کا یہ کہنا کہ ''ہم سفر کو جاری رکھیں گے۔۔۔'' ظاہر ہے کہ یہ اختلافِ رائے ایک بے ساختہ اور افراتفری کا عمل نہیں ہوسکتا کیونکہ ان اصحاب میں امامؑ کے تربیت یافتہ افراد بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ امامؑ کے اجلاس طلب کرنے اور لوگوں سے اس موضوع پر رائے طلب کرنے کے نتیجہ میں ہوا ہوگا۔

☆امامؑ کا یہ سفر ایک انفرادی سفر نہیں تھا' امامؑ کسی سیر و سیاحت پر نہیں نکلے تھے اور نہ ہی آپؑ نے کسی کی انفرادی دعوت یا اپنے خاندانی اعزاء اور احباب کی دعوت پر یہ سفر اختیار کیا تھا۔ بلکہ اس سفر میں سو کے قریب افراد آپ کے ہم سفر تھے یہاں تک کہ ان کے اہل وعیال بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ان میں نہ صرف بنی ہاشم کی شخصیات شامل تھیں بلکہ یمن سے آنے والے افراد بھی تھے' بصرہ سے آنے والے بھی تھے' اس کے علاوہ دیگر مختلف افراد حتیٰ کہ وہ لوگ بھی شامل تھے جو اہل کوفہ کے نمائندے تھے اور کوفہ سے آپ کو بلانے آئے تھے۔ ان کا اپنا کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ ان سب کے سفر کے مقاصد آپؑ ہی کے مقاصد سے مربوط تھے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ امامؑ صرف اولادِ عقیل کے جوانوں سے مشورہ کر کے ان کے مشوروں پر عمل کریں اور اپنے ان اصحاب کو نظر انداز کر کے ان سے رائے نہ لیں۔

لہٰذا ضروری امامؑ نے اپنے تمام اصحاب کو مشورہ کے لئے جمع کیا ہوگا۔

☆امام علیہ السلام اگر چہ مکہ سے اپنی جان بچانے اور اس سے زیادہ حرمتِ بیت اللہ کو بچانے کے لئے وہاں سے نکلے تھے لیکن بنیادی مقصد کوفہ کی طرف سفر تھا۔ یہ سفر اتفاقی طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اہلِ کوفہ کی طرف سے سینکڑوں خطوط ملنے اور بہت سے وفود آنے کے بعد آپ نے اس سفر کا ارادہ کیا۔ نہ صرف اہلِ کوفہ کے خطوط و وفود کے بعد بلکہ آپ نے یہ سفر اسی وقت اختیار فرمایا جب آپ کے بھائی مسلم ابنِ عقیل نے یہ تائید و توثیق کردی کہ کوفہ کی اجتماعی اور سیاسی قیادت سنبھالنے کے لئے لوگ آپ کے منتظر ہیں۔ لیکن ایک ایسے موڑ پر کہ جب اثناء راہ میں آپ کو یہ خبر ملتی ہے کہ آپ کے نمائندے مسلمؑ اور ان کے میزبان ہانی بن عروہ کو بے دردی سے شہید کردیا گیا' کوفہ پر عبیداللہ ابنِ زیاد جیسا سفاک شخص مسلط ہو چکا ہے' آپ کو دعوت دینے اور بلانے والے جیلوں میں ہیں یا روپوش ہیں۔۔۔ اپنے سفر کو جاری رکھنا خود کو خطرہ میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ حالات میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ کوفہ میں آپ کا استقبال ہاروں اور پھولوں سے کیا جائے گا بلکہ اس کے برخلاف یہ امر یقینی ہے کہ اب آپ کا استقبال نیزوں' تلواروں' طوق و زنجیر اور قید و بند کے ذریعہ کیا جائے گا۔ ایسے حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ امامؑ خود کو' اپنے عزیز و اقرباء کو اور اپنے ان تمام اصحاب کو پہلے سے آمادہ کئے بغیر اور اعتماد میں لئے بغیر ان خطرات میں جھونک دیں
۔

چنانچہ اگر چہ پیغمبر اکرمؐ کا انصارِ مدینہ سے پہلے سے معاہدہ تھا کہ وہ ہر حال میں پیغمبرؐ کا ساتھ دیں گے لیکن اس کے باوجود جنگِ بدر کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ نے ان کو دوبارہ بلایا' ان سے پوچھا اور مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا ہے؟ جب ان سب نے پیغمبرؐ کو یقین دہانی کرائی کہ وہ آپ کے ہم رکاب ہو کر مشرکینِ مکہ سے جنگ کریں گے تب آپؐ جنگ کے لئے مدینہ سے نکلے۔ پھر نواسۂ رسولؐ سے کیونکر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اصحاب کو بھیڑ بکریوں کی طرح (معاذاللہ

)قربان گاہ کی طرف لے جائیں گے اورانہیں موت کے منہ میں دھکیل دیں گے۔لہٰذا یہ ایک یقینی امر ہے کہ امامؑ نے اپنے اصحاب کی ایک میٹنگ طلب کی ہوگی انہیں اعتماد میں لے کر حالات کی نزاکت اور سنگینی کو ان کے سامنے رکھا ہوگا ان سے سفر کو جاری رکھنے یا نہ رکھنے کے لئے مشورہ طلب کیا ہوگا اور اپنے قیام وانقلاب کے اگلے مرحلہ کے لئے لائحہ عمل طے کرنے کے لئے ثعلبیہ میں اپنے اصحاب کی ایک میٹنگ طلب کی ہوگی۔اور قرین قیاس یہ ہے کہ اس میٹنگ کا ایجنڈا کچھ یوں ہوگا۔

ایجنڈے کے ممکنہ نکات

(۱)۔کوفہ کے ان حالات کے تحت مکہ یا مدینہ واپس جائیں۔

(۲)۔اگر مکہ یا مدینہ واپس نہ جائیں تو پناہ کی خاطر اسلامی مملکت کے کسی خطہ میں یا غیر مسلم مملکتوں میں سے کسی جگہ چلے جائیں ---یا ایک عرصہ کے لئے پہاڑ کے کسی درے یا غار میں روپوش ہو جائیں۔

(۳)۔یا -----کوفہ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھیں۔

ہمارے پاس یقینی طور پر تو کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس موقع پر امامؑ اور ان کے اصحاب کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن قرآئن کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ موضوع بحث یہی نکات رہے ہوں گے۔ہم چاہیں گے کہ مندرجہ بالا تینوں امکانات کا ایک سرسری جائزہ لیں اور دیکھیں کہ عقلی ومنطقی لحاظ سے امامؑ کا آئندہ اقدام کیا ہونا چاہئے۔

ان نکات پر تبصرہ

اگر کہا جائے کہ ان نازک اور سنگین حالات میں امامؑ کو واپس مکہ یا مدینہ چلا جانا چاہئے تھا۔بہ ظاہر یہ بات منطقی نظر آتی ہے۔کہ حالات کا یہ رخ اختیار کر لینے کے بعد اب کوفہ جانا لا حاصل تھا۔لہٰذا امامؑ کو واپس مکہ یا مدینہ چلا جانا چاہئے۔ویسے بھی ان حالات میں عام آدمی یہی

سوچتا ہے کہ مرنا ہی ہے تو اپنے گھر اور اپنے وطن میں جا کر موت کا سامنا کرے کہ کم از کم وہاں رونے اور گریہ کرنے والے تو ہوں گے۔ہوسکتا ہے یہی سوچ کر بعض افراد نے امامؑ کو یہ مشورہ دیا بھی ہو۔لیکن یہ ایک عام آدمی کی سوچ تو ہوسکتی ہے کسی عاقل کی نہیں۔بالخصوص امام حسینؑ جیسی صاحب شخصیت ان بنیادوں پر نہیں سوچ سکتی۔بھلا امامؑ کیونکہ اس مدینہ کا رخ کرسکتے ہیں جہاں سے وہ رات کی تاریکی اور خوف وہراس کے عالم میں آیتِ خوف کی تلاوت کرتے ہوئے ریاستی جبر وتشدد سے بچنے کے نکلے ہوں اور اب تو مدینہ کے حالات اور بھی بدتر ہو چکے ہیں۔مدینہ کا گورنر ولید ابنِ عتبہ اپنی تمام تر برائیوں کے باوجود ایک سنجیدہ انسان تھا لیکن اب تو وہ امامؑ کے سلسلہ میں کاہلی اور تساہل کا مظاہرہ کرنے کے الزام میں معزول ہو چکا ہے اور اس کی جگہ پر شقی مروان بن حکم کے خوابوں کی تعبیر عمرابنِ سعید اشدق جیسا شقی ترین انسان مدینہ پر مسلط ہو چکا ہے۔

کیا امامؑ مکہ واپس لوٹ جائیں؟ وہ مکہ کہ جس کو آپؑ اس لئے چھوڑنے پر مجبور ہوئے کہ عمرابنِ سعید اشدق اپنی ہمراہ مسلح افراد کے ساتھ اس عزم وارادے سے وہاں پہنچ چکا تھا کہ آپ کو ایامِ حج ہی میں قتل کردے یا گرفتار کرلے؟ مکہ میں نہ صرف یہ کہ آپؑ کی جان کو خطرہ بدستور موجود ہے بلکہ حرم خدا کی ہتکِ حرمت کا بھی اندیشہ ہے جو حسینؑ جیسا شخصیت کسی صورت میں گوارا نہیں کرسکتی تھی۔پھر دشمن بھی تو چاہتا تھا کہ کسی طرح حسینؑ کو مکہ واپس لایا جائے تاکہ مکہ جب حاجیوں سے خالی ہو جائے تو انہیں قتل کردیا جائے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کے کسی اور خطے میں پناہ لینے کا تعلق ہے ---

تو اسلامی مملکت کا کیا کوئی خطہ ایسا تھا جو یزید کے علاوہ کسی اور کے تسلط میں ہو؟ یا اسلامی مملکت میں کوئی ایسی جگہ تھی جہاں سے بنی امیہ کی حکومت کے خلاف آواز اٹھی ہو یا امامؑ کو قیام کرنے کی دعوت ملی ہو؟ اگر ایسے کوئی خطے تھے بھی تو قیام وانقلاب کے لئے ان کی نظریں بصرہ اور کوفہ پر لگی

ہوئیں تھیں۔ جب کوفہ ہی کی ناکہ بندی ہوجائے تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ دوسرے شہروں کے دروازے حسینؑ ابنِ علیؑ کے لئے کھلے ہوں جب کہ یزید کے خلاف امامؑ کے قیام و انقلاب کی اطلاع تمام گورنروں کو یقیناً پہنچ چکی تھی۔

کیا حسینؑ اپنے رفقاء، اصحاب اور اہل و عیال کے ساتھ کسی پہاڑ کے درے میں یا کسی قلعہ میں روپوش ہوجائیں؟ لیکن کب تک؟ کیا اس صورت میں ان کے لئے محاصرہ کا خطرہ نہیں؟

اب رہ گیا کسی غیر مسلم ملک میں پناہ لینے کا تعلق ۔۔۔۔ تو کسی غیر مسلم ملک کے حکمرانوں پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے جب کہ حکومتیں ایک دوسرے سے تعلقات قائم رکھنے اور افراد کی بجائے ایک دوسرے کی رضا و خوشی کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں۔ پھر سیاسی سمجھوتے کے تحت ایک غیر مسلم حکومت کسی وقت بھی حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو بنی امیہ کے حوالے کرسکتی تھی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ امام حسینؑ ایک تحریک کے بانی اور حامی تھے۔ ایک غیر مسلم حکومت کس طرح اس کی آزادی ان کو دے سکتی تھی؟

اب حسینؑ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں۔ کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کا عقلی، منطقی اور شرعی جواز بھی ہے۔ چنانچہ سیاسی، اجتماعی اور مذہبی نقطۂ نظر سے تجزیہ اور تحلیل کرنے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ حسینؑ کو کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے تھا۔ مندرجہ ذیل حقائق امامؑ کے اس اقدام کی تائید کرتے ہیں۔

☆ کوفہ کی طرف امامؑ کا یہ سفر اہل کوفہ اور امامؑ کے درمیان متعدد معاہدوں، عہد و پیمان اور بہت سے نمائندوں کی آمد و رفت کے نتیجہ میں وجود میں آیا۔ امامؑ نے ان سے حتمی وعدہ کیا کہ ان کے پاس پہنچیں گے۔ اس معاہدے اور عہد و پیمان کی رو سے امامؑ پر یہ واجب ہوگیا تھا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ان کے پاس جائیں اور بتائیں کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ورنہ کوفہ والوں کو یہ حق پہنچتا تھا اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ ''ہم تو اپنے وعدے پر قائم تھے، امامؑ

نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا اور ہمیں موقع دیئے بغیر ہی وہ واپس چلے گئے۔'' چنانچہ بعض افراد نے جب امامؑ کو کوفہ نہ جانے اور واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا تو آپؑ نے فرمایا کہ:

''ہمارے اور ان کے درمیان ایک معاہدہ ہے، مجھے بہرحال اس معاہدے کو پورا کرنا ہے۔''

اس کے علاوہ کربلا میں لشکر حر سے خطاب کرتے ہوئے امامؑ نے اسی معاہدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''میں اپنے وعدے کی ایفا کے لئے آیا ہوں، اب تمہاری باری ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔''

☆ کوفہ کی طرف امامؑ کا سفر صرف اس بناء پر نہیں ہے کہ وہاں سے آپؑ کو بارہ ہزار خطوط مل چکے ہیں اور متعدد نمائندے آپؑ کو قیادت سنبھالنے کی دعوت دے چکے ہیں بلکہ اس کے علاوہ آپؑ کے اور اہل کوفہ کی جید اور ممتاز شخصیتوں کے درمیان کئی سال تک معاہدے اور مذاکرات جاری ہو چکے تھے۔

☆ اس وقت کی جید اور برجستہ شخصیات قرائن، شواہد اور حالات کی بناء پر یہ بخوبی جانتی تھیں کہ اہل کوفہ کے دلوں میں بنی امیہ، عبیداللہ ابن زیاد کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی ہے۔

☆ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مسلم بن عقیلؑ، امام حسین علیہ السلام کی حمایت و نصرت میں اہل کوفہ کو جمع اور متحد کرنے میں خاطر خواہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہے تب بھی ابھی یہ احتمال باقی ہے کہ امامؑ کی کوفہ میں موجودگی اور ان کی شخصیت لوگوں پر اثر انداز ہو اور امامؑ کو بہ نفسِ نفیس سامنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ امامؑ کے لشکر میں شامل ہوجائیں۔ چنانچہ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ کربلا میں کچھ لوگ عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امامؑ کے ساتھ ہوگئے۔

☆ ابھی تک کوفہ سے جو خبریں ملی تھیں وہ حضرت مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہ کی شہادت کی خبریں تھیں۔ کوفہ میں حبیب ابنِ مظاہر، مسلم بن عوسجہ، سلیمان ابن صرد خزاعی جیسی شخصیات ابھی

موجود تھیں جن کی جانثاری اور وفاداری پر امامؑ کو مکمل اطمینان تھا۔ان کے بارے میں خیانت اور کسی بدعہدی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا امید کی کرن ابھی باقی تھی لہٰذا اس بات کو اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ عبید اللہ ابنِ زیاد کے کوفہ پر مسلط ہونے کے بعد کوفہ امامؑ کے خلاف منقلب ہوگیا تھا تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ کوفہ میں کم از کم ایک گروہ ایسا ہے جو امامؑ کی نصرت سے کسی بھی حالت میں منہ نہ موڑے گا۔چنانچہ تجربہ نے ثابت بھی کیا کہ گو امامؑ ان تک نہیں پہنچ سکے ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو امامؑ کی خدمت میں پہنچایا اور آپؑ پر اپنی جان نثار کی۔

اس کے برخلاف مدینہ یا مکہ واپس لوٹنے کی صورت میں کسی گروہ کے آپؑ کے ساتھ شامل ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔اور آپؑ اس کا تجربہ بھی کر چکے تھے کہ ان لوگوں نے آپؑ کا ساتھ نہیں دیا اور آپؑ مظلومانہ عالم میں مدینہ سے بھی نکلے اور مکہ سے بھی.....لہٰذا اب اگر خطرات کی طرف بڑھنا ہی ہے تو عقل اور منطق کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اس طرف قدم بڑھائے جہاں دفاع کی کوئی نہ کوئی امید ہو......نہ کہ اس طرف جہاں سے انسان مایوس ہو چکا ہو۔

شقوق

یہ ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے کوفہ جاتے ہوئے زبالہ سے پہلے آتا ہے۔امام حسینؑ جب اس منزل پر پہنچے تو ایک شخص کو دیکھا جو کوفہ سے آ رہا تھا۔آپؑ نے اس سے کوفہ کے حالات پوچھے تو اس نے بتایا کہ کوفہ کے لوگ آپؑ سے جنگ کرنے کے لئے متحد ہو چکے ہیں اور انہوں نے آپؑ سے جنگ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔اس پر آپؑ نے فرمایا کہ۔

”خدا ہر آن نئی شان میں ہے۔ہر امر خدا کے ہاتھ میں ہے۔وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے کچھ اشعار پڑھے جن کا مفہوم کچھ یوں ہے۔

”لوگوں کی نظر میں دنیا اگر اتنی ہی پرکشش اور قدر و قیمت کی حامل ہے تو آخرت اس سے کہیں

زیادہ ارزش و قیمت رکھتی ہے۔وہ مال و دولت جو انسان جمع کرتا ہے آخر ایک دن اسے یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔پھر ایسے مال و دولت کے لئے آدمی کیوں حرص کرے جسے چھوڑ کر ایک دن چلے جانا ہے۔انسان کا رزق اگر پہلے ہی سے مقرر و مقدر ہو چکا ہے تو ایسے مال کے لئے حرص نہیں کرنا چاہئے۔انسان کا جسم اگر فانی ہے اور اگر وہ مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے تو پھر کیوں نہ خدا کی راہ میں جان دے۔“

اگرچہ امامؑ کا قیام پہلے ہی روز سے عرفان و آگہی کی بنیادوں پر استوار تھا‘ لیکن اس منزل پر خصوصیت کے ساتھ اپنے عرفانِ عقیدتی اور عرفانِ عملی کی طرف آپؑ ایک واضح اشارہ فرماتے ہیں۔

عرفان عقیدتی

اس عراقی نے جب آپؑ کو اہلِ کوفہ کے عزائم اور آپؑ کے خلاف ان کے عزم و ارادہ سے آگاہ کیا تو ان کے مقابلہ میں امامؑ نے اپنے عزم و ارادے کا اظہار کرتے ہوئے اس عقیدتی عرفان کی طرف اشارہ فرمایا۔

”مردانِ حق کا شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اور پوری دنیا کے بارے میں مؤثر حقیقی خدا کو سمجھیں۔دنیا کے ہر اسباب و علل‘ عزم و ارادے‘ جد و جہد اور سعی و کوشش کے پیچھے ایک ارادۂ لایزال موجود ہے جس کے مقابلے میں نہ کوئی اسباب و علل کارفرما ہے اور نہ عزم و ارادہ۔اس لئے انسان کو چاہئے کہ نہ وہ اپنے اسباب و علل پر بھروسہ کرے اور نہ اپنے عزم و ارادے پر تکیہ کرے اور نہ ہی حق کی راہ میں کسی سے خوف زدہ ہو کیونکہ جب مسبب حقیقی خدا ہے تو انسان کیوں نہ اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کر لے؟“

لہٰذا بنی امیہ کو اگر اپنی جاہل و نادان اور حریص و لالچی رعایا پر بھروسہ ہے اور ان احمق و نادان لوگوں اور حریص و لالچی ہوا خواہانِ حکومت کو بنی امیہ کی حکومت پر اعتماد و بھروسہ ہے تو پھر ”حسینؑ

"کیوں نہ اپنے مالکِ حقیقی پر بھروسہ کرے جو سب سے قوی اور عظیم ہے کہ جس کی مشیت کے سامنے ہر عزم وارادہ ہیچ ہے اور جس کے سامنے کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی؟ مردِ مومن کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ خدائے لایزال کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔

عرفانِ عملی

عملی عرفان کا آغاز دو سے وابستگی ترک کرنے اور دنیا پر عدم اعتماد سے ہوتا ہے۔ یعنی انسان مال ودولت، شان وشوکت، جاہ وجلال، کرسی واقتدار پر تکیہ وبھروسہ نہ کرے۔ گو دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے وابستہ چھوڑنا آسان کام نہیں ہے چنانچہ جب امامؑ سے پوچھا گیا کہ دنیا میں رہتے ہوے انسان کے لئے دنیا سے وابستگی ترک کرنا کیوں کر ممکن ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ عقل وفکر کے نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو دنیا ومافیھا بذاتہٖ حقیر اور بے قیمت چیز ہے اور قابلِ بھروسہ نہیں۔ انسان کا دنیا پر تکیہ کرنا بھوسہ کو پہاڑ سمجھنے کے مترادف ہے۔ پھر بھی اگر مان لیا جائے کہ دنیا کوئی ارزش وقیمت رکھتی ہے تو دارِ آخرت اس دنیا سے کہیں زیادہ قدر وقیمت رکھتا ہے۔ اس لئے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس دنیا کے مقابلے میں آخرت کا انتخاب کیا جائے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جس کا اجر وثواب اس دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اگر انسان خدا کی رزاقیت پر یقین رکھتا ہے تو مالِ دنیا جمع کرنے کا حریص کیوں بنے؟ مالِ دنیا جمع کرنے میں اگر کوئی حسن ہے تو اسے راہِ خدا میں خرچ کرنا کہیں زیادہ احسن ہے۔ اسی طرح مآلِ زندگی اگر یہ ہے کہ انسان کو ایک دن اس دنیا کو بہر حال چھوڑ کر جانا ہے تو پھر شہادت کی راہ اختیار کر کے کیوں نہ خدا کی راہ میں جان دے۔

زبالہ

زبالہ وہ جگہ ہے جو مکہ سے کوفہ جاتے ہوئے شقوق کے بعد آتی ہے یہ واقصہ اور ثعلبیہ کے درمیان ہے یہاں ایک قلعہ ہے اور بنی غاضرہ کی ایک مسجد بھی ہے۔ اس جگہ کو زبالہ کہنے کی دو وجہ بیان کی

جاتیں ہیں۔۔۔۔ایک یہ کہ زبالہ بنتِ مسعود یا زبالہ بنتِ معاسر نے جو قبیلہ زبالغہ سے تھی۔ یہاں سکونت اختیار کی اور اس کے نام پر اس جگہ کا نا زبالہ پڑا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ "زبل" دراصل مشک میں پانی جمع کرنے کو کہتے ہیں یہاں چونکہ بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اس لحاظ سے اسے زبالہ کہتے ہیں۔ جس طرح اس جگہ کا نام زبالہ ہے اسی طرح عربوں کے یہاں ایک دن بھی ہے جو یوم زبالہ کے نام سے معروف ہے۔

امام حسینؑ جب منزل زبالہ پر پہنچے اور آپؑ کو حضرت مسلم ابنِ عقیل، ہانی بن عروہ اور قیس ابنِ مسہر صیداوی کی شہادت کی خبر ملی تو آپؑ نے جیسا کہ بعض مقاتل میں ہے خود یا اپنے کچھ اصحاب کے توسط سے ایک اعلان کیا کہ۔

"ہمیں ایک بری خبر ملی ہے کہ مسلم ابنِ عقیل، ہانی بن عروہ اور ہمارے کچھ اصحاب باوفا شہید ہو چکے ہیں اور ہمارے شیعوں نے ہمارے ساتھ بے وفائی کی ہے اور ہمیں تنہا چھوڑا ہے۔ ان حالات کے تحت تم لوگوں میں سے اگر کوئی واپس جانا چاہے تو وہ یہیں سے واپس چلا جائے۔"

مقاتل میں لکھا ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد جو لوگ آپؑ کے ساتھ یہاں تک آئے تھے وہ سب آپؑ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

منزلِ زبالہ کے علاوہ امام حسینؑ نے اسی طرح دوسرا اعلان کربلا میں شبِ عاشور فرمایا تھا اور اپنے اصحاب کو واپس چلے جانے کی اجازت دی تھی۔ لیکن شبِ عاشور آپ کی کھلی اجازت کے باوجود کوئی بھی آپؑ سے جدا نہیں ہوا بلکہ آپؑ پر اپنی جان نثار کرنے کے عزم وارادے کا اظہار کیا اگر چہ بعض مقاتل منزلِ زبالہ سے امامؑ کا ساتھ چھوڑ کر لوگوں کے چلے جانے کے واقعے کو شبِ عاشور سے مخلوط کر کے یہ اشتباہ کرتے ہیں کہ کچھ لوگ شبِ عاشور امامؑ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

بہر حال امام حسین علیہ السلام کا ایک مرتبہ منزلِ زبالہ پر اور دوسری مرتبہ کربلا میں شبِ

عاشورا اپنے اصحاب کو واپس چلے جانے کی اجازت دینا ایسے اقدامات ہیں جو غور طلب اور تشریح طلب ہیں۔

مرحلہ تاسیس اور مرحلہ تصحیح و تطہیر

ہر قیام وانقلاب دو مرحلوں کے درمیان اپنا سفر طے کرتا ہے۔ ایک مرحلہ تاسیس اور دوسرا مرحلہ تصحیح و تطہیر۔

(۱)۔ مرحلہ تاسیس

کسی بھی قیام وانقلاب کے لئے پہلا مرحلہ اس قیام ونہضت کے لئے لوگوں کو دعوت دینا ہے۔ یہ دعوت عمومی ہوتی ہے جو بھی اسے قبول کرے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ جب انقلاب کا پیغام لے کر اٹھے تو انہوں نے اپنے انقلاب کی خصوصیات بیان کر کے سب کو ایک عام دعوت دی۔ جس نے بھی اس دعوت پر لبیک کہا اور اس کو قبول کیا اس کو آپؐ نے اپنے کیمپ میں شامل کیا۔ کسی کو بھی رد نہیں کیا چاہے اس نے آپؐ کی پوری کی پوری دعوت کو قبول کیا ہو یا جزوی طور پر قبول کیا ہو۔ یہاں تک کہ منافقین کو بھی اپنے کیمپ اور اسلام کے دائرے میں شامل کر لیا۔ حتیٰ عبداللہ ابن ابیہ جیسے منافق بھی اپنی پوری منافقت کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی دعوت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ قرآن ایسے منافقین کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہیں کہ۔

''ومن حولكم من الاعراب منافقون ومن اهل المدينة مردوا على النفاق لاتعلمهم ونحن نعلمهم ''اور تمہارے گرد و پیش دیہاتیوں میں بھی منافقین ہیں اور اہلِ مدینہ میں تو وہ بھی ہیں جو نفاق میں ماہر اور سرکش ہیں، تم ان کو نہیں جانتے لیکن ہم خوب جانتے ہیں۔'' (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۱)

ایسے لوگوں کو نہ صرف یہ کہ آپؐ نے قبول کر لیا بلکہ انہیں مقام و منصب بھی دیا اور ان کے اس جزوی ایمان سے استفادہ بھی کیا۔ اگر ان کو آپؐ اپنی دعوت میں اس ابتدائی مرحلہ پر شامل نہ

کرتے تو یہ دعوت چند افراد تک محدود رہتی اور آخر کار منجمد ہو کر ختم ہو جاتی۔ اس لئے کسی قیام وانقلاب کی تاسیس کے وقت ابتدائی مرحلہ میں دعوت کو قبول کرنے والے ہر شخص کے لئے دروازے کھلے رکھنا ناگزیر ہے۔

(۲)۔ مرحلہ تصحیح و تطہیر

دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ جب اپنے قیام وانقلاب کو منظم، متحرک اور مضبوط بنانے اور مضر اثرات اور ناپسندیدہ عناصر سے محفوظ رکھنے کے لئے تصحیح اور تطہیر کا عمل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ائمہ اطہارؑ کا دور قیام وانقلاب میں شریک افراد میں سے ان چہروں کو سامنے لانے کا ہے جو اس قیام وانقلاب کو درک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ صرف درک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ استقامت بھی رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اپنے قیام وانقلاب کو ایسے تمام عناصر سے پاک کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ جو اس قیام کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا سبب بنیں۔ پہلا مرحلہ نسبتاً آسان ہے۔ دعوت کے پیغام میں اگر جاذبیت ہے تو لوگ جوق در جوق دعوت میں شریک ہوتے ہیں۔ ''یدخلون فی دین اللہ افواجا'' لیکن دوسرا مرحلہ یعنی باصلاحیت، باکردار، مستقل مزاج اور پیغام کی روح کو درک کرنے والوں کو چھانٹ کر سامنے لانا دشوار مرحلہ ہے، لیکن ناگزیر ہے کیونکہ کسی تحریک کا دارومدار اسی پر ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں امت جس انحراف کا شکار ہوئی اس کی وجہ ہی یہ تھی کہ لوگ پیغام کی روح کو درک نہیں کر سکے تھے۔ امیرالمومنین علی علیہ السلام اور جناب زہراءؑ نے امت کے لئے اس خطرے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد جناب زہراء مرضیہؑ کو اسی بات کا قلق تھا جس کے نتائج اور عواقب سے وہ ہر ہر موقع پر امت کو آگاہ کرتی رہیں۔

خلفائے راشدین کا دور تو عہدِ پیغمبرؐ سے قریب اور متصل ہونے کی وجہ سے پھر غنیمت تھا، لیکن ایک وقت گزرنے کے بعد حضرت علیؑ کو طلحہ و زبیر اور مروان سے مقابلہ کرنے میں اسی وجہ سے دشواری

پیش آئی کہ لوگوں میں حق کو درک کرنے کی صلاحیت کا فقدان تھا۔ صفین میں معاویہ کے ساتھ جنگ میں علیؑ کو اسی دشواری کا سامنا تھا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ کے جید اصحاب اور علیؑ کے قریبی اصحاب بھی آپؑ کے لشکر میں ہوتے ہوئے معاویہ کے خلاف جنگ کرنے کے مسلئہ پر ششش و پنج میں مبتلا تھے اور اس کے خلاف اپنی تلواروں کو نیام سے نکالتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

لہٰذا ایسے افراد کو کہ جو حق و باطل میں تمیز کرنے کا شعور نہ رکھتے ہوں کسی قیام و انقلاب اور کسی تحریک میں ساتھ نہیں لیا جا سکتا' چاہے وہ کسی بھی مقام و منصب پر فائز ہوں۔ چنانچہ جب حضرت علیؑ کو مغیرہ ابن شعبہ اور دوسرے افراد نے معاویہ اور عمر عاص جیسے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کا مشورہ دیا تو آپؑ نے صاف انکار کر دیا۔ اس کا ذکر نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۶ میں ہے۔ حالانکہ آپؑ کو اس انکار کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ پیغمبر اکرمؐ نے علیؑ کی تربیت کرتے ہوئے پہلے ہی ان کو یہ بتا دیا تھا کہ میرا دور دورِ تاسیس اور تمہارا دور دورِ تصحیح اور دورِ تطہیر ہوگا۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا۔

''یا علیؑ! میرا قیام تنزیل کے لئے ہے جب کہ تمہیں تاویل کے لئے قیام کرنا پڑے گا۔''

امام حسین علیہ السلام کو بھی اپنے قیام و انقلاب میں انہی دشواریوں کا سامنا تھا۔ عوام تو ایک طرف اس وقت کے علماء اور دانشوروں کو بھی یزید کے تمام انحرافات اور جرائم کے باوجود اس کے خلیفہ مسلمین اور امیر المومنین کے منصب پر قابض ہونے پر انہیں کوئی اشکال نظر نہیں آتا تھا اور اس کے خلاف کسی قیام و انقلاب کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے مقدس قیام میں جہاں ایک طرف اپنی آواز اور اپنی دعوت دور دور تک ہر جگہ پہنچانے کی کوشش کی وہاں دوسری طرف اپنی آواز اور اپنی دعوت دور دور تک ہر جگہ پہنچانے کی کوشش کی وہاں دوسری طرف اپنی تحریک کو ہر قسم کے انحراف سے بچانے کے لئے ہر ہر موقع پر تصحیح و تطہیر کا اہتمام بھی کیا۔ اس لئے آپ کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو اسلامی اور مسلمین کو اس وقت درپیش مسائل

کو اچھی طرح درک کر سکتے ہوں' قیادت کی صحیح شناخت اور معرفت رکھتے ہوں اور قائد کی تحریک پر جان کے نذرانے کو حقیر سمجھتے ہوں۔ ایسے افراد جب اور جہاں آپؑ کو مل جاتے تھے آپؑ ان کو ابدی سعادت کی بشارت دیتے اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا فرماتے تھے جب کہ ان صفات اور شعور سے عاری اور خالی افراد کو اپنے حلقہ اور بزم سے پاک رکھتے تھے تا کہ آپؑ کی تحریک اور آپؑ کا قیام کسی انحراف اور ناکامی کا شکار نہ ہو۔

دینی تحریکوں اور تنظیموں کے لئے درس

امام حسین علیہ السلام کا لوگوں پر حقائق واضح کرنے کے بعد واپس جانے کی کھلی اجازت دینا آج کی اور آئندہ آنے والی دینی تحریکوں اور تنظیموں کے لئے ایک درس ہے جس کو ہم اپنی عملی زندگی میں نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ اسلامی تحریکوں میں لوگوں کی شمولیت کی بنیاد اور معیار ''کمیت'' اور ''کیفیت'' دونوں کو ہونا چاہئے۔ یعنی نہ تنہا کمیت ''ملحوظِ خاطر رہے اور نہ صرف ''کیفیت'' ۔بلکہ کسی تحریک کی کامیابی کے لئے کمیت اور کیفیت دونوں پر نظر رکھنا چاہئے اور دونوں میں ایک تناسب رکھنا ضروری ہے۔

چنانچہ امام علیہ السلام اپنی افرادی قوت کو بڑھانے کے لئے اپنی تحریک کے آغاز سے لے کر اپنی شہادت تک ہر ہر موقع اور ہر ہر منزل پر لوگوں کو اپنی تحریک کی طرف دعوت دیتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپؑ نے ہر اس شخص کو جو امامؑ کے مشن اور پیغام سے ذہنی موافقت اور آمادگی نہیں رکھتا اس کو رخصت کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی بلکہ ہر ہر موقع پر لوگوں کو حقائق اور اپنے ہدف اور مقصد سے آگاہ کر کے انہیں مکمل آزادی دی کہ وہ جو راہ چاہیں اختیار کریں۔

لوگوں کا کثیر تعداد میں آپؑ کے ساتھ شامل ہونا اور رفتہ رفتہ امامؑ سے کٹتے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ بہت سے لوگ اس وہم و گمان کے ساتھ آپؑ کے ساتھ شامل ہوئے تھے کہ امامؑ کوفہ میں اقتدار سنبھالیں گے اور ان کو بھی مقام و منصب ملے گا۔ لیکن جب لوگوں نے آپؑ سے اہلِ

کوفہ کی بے وفائی کی خبر سنی اور امامؑ نے ان پر اس حقیقت کو واضح کر کے واپس چلے جانے کی اجازت دی کہ اب مقام و منصب کی کوئی امید نہ رکھے تو لوگ دائیں بائیں منتشر ہونے لگے۔

بطنِ عقبہ

منزلِ زبالہ کے بعد امامؑ نے بطنِ عقبہ پر قیام فرمایا۔ یہاں آپؑ نے اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

”میں نے خواب میں دیکھا کہ کچھ کتے مجھ پر حملہ کر رہے ہیں ان کتوں میں سے ایک کتا جو مجھ پر بڑھ چڑھ کر حملہ کر رہا ہے وہ برص میں مبتلا ہے۔“

آپؑ نے اپنے اس خواب کی تعبیر کرتے ہوئے بتایا کہ۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ میں شہید ہو جاؤں گا‘ یہ لوگ مجھے قتل کر کے دم لیں گے۔“

عمر ابنِ لوذان بن عکرمہ مدینہ جاتے ہوئے بطنِ عقبہ پر امام حسین علیہ السلام سے ملا اور اہلِ کوفہ کے مزاج و طبیعت سے امامؑ کو آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ بے وفائی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس نے امامؑ سے اس سفر کو ترک کرنے کی درخواست کی۔ امامؑ نے اس کو جواب دیا کہ جو بات تم مجھے بتا رہے ہو میں اس سے خوب آگاہ ہوں‘ یہ باتیں مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ خدا کی مشیت پوری ہو کر رہتی ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

اسی مقام پر جعفر ابنِ سلیمان زباعی سے امامؑ نے فرمایا کہ یہ لوگ (بنی امیہ) جب تک میرا خون نہ بہالیں مجھے نہیں چھوڑیں گے‘ لیکن مجھے قتل کرنے کے بعد لوگوں کو چین نصیب نہیں ہوگا‘ خداوندِ عالم ایسے شخص کو ان پر مسلط کرے گا جو نہیں ذلیل و خوار کرے گا۔ ان کی ذلت و پستی اس حد تک پہنچے گی کہ ان کی حیثیت ایامِ حیض میں استعمال ہونے والے حرقہ سے بھی بدتر ہوگی۔

چند چیزیں جو واضح ہو کر یہاں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

☆ امامؑ نے کسی کو دھوکے میں نہیں رکھا

امامؑ ہر ہر منزل اور ہر ہر مقام پر اپنے اس سفر میں پیش آنے والے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہے۔ لوگوں کو ان خطرات سے بھی آگاہ کیا جن کا سامنا کرنا یقینی تھا اور ان خطرات سے بھی جن کا کسی نہ کسی صورت میں احتمال تھا تاکہ کل کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ حسینؑ نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ بلکہ جو بھی آپؑ کا ساتھ دینا چاہے وہ ایک آگہی کے ساتھ شریکِ سفر ہو۔

☆امامؑ کا سفر‘ سفرِ آگہی تھا

اس سفر میں بہت سے لوگ خلوص و محبت کے اظہار کے طور پر امامؑ کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے تھے جب کہ بہت سے لوگ اپنے تجربے اور مردم شناسی کی بناء پر آپؑ کو خطرات سے آگاہ کرتے تھے اور اہلِ کوفہ کی ذہنیت‘ ان کے مکر و فریب اور بے وفائی کی طرف اشارہ کر کے امامؑ کو اس سفر کے انجام سے ڈراتے تھے۔ امام علیہ السلام نہ صرف اپنے علمِ امامت بلکہ اپنے عرفان و بصیرت‘ تجربے اور معاشرہ شناسی کی بناء پر ان تمام خطرات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ لوگ جب آپؑ کو خطرات سے ڈراتے تو آپؑ ان کو جواب دیتے کہ یہ باتیں ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یعنی میرا سفر بے ساختہ‘ یا کسی غفلت اور فریب کے نتیجے میں بلکہ میرا سفر عرفان و آگہی کا سفر ہے۔

☆امامؑ نے لوگوں کو ان کے انجام سے آگاہ کر دیا تھا

امامؑ جہاں لوگوں کو اپنے اس سفر میں پیش آنے والے خطرات سے ہر ہر موقع اور ہر ہر منزل پر آگاہ کرتے رہے وہاں اپنی جان بچانے والے لوگوں کو بھی (خواہ وہ اہلِ کوفہ ہوں یا دوسرے) ان کے انجام سے آگاہ کرتے رہے کہ میرے بعد تم بچ نہیں سکو گے۔

بطنِ عقبہ کے بعد امام حسین علیہ السلام نے منزلِ شراف پر قیام فرمایا۔ شراف (بروزنِ فعال) واقصہ اور قرعاء کے درمیان ہے۔ شراف سے واقصہ کا فاصلہ دو میل ہے۔ شراف اور واقصہ دو مرد تھے جو عمر بن معتق بن زمرہ بن عقیل بن عوص بن ارم بن سام بن نوح کے فرزند تھے۔ یہ

دونوں اس جگہ قیام پذیر تھے۔معجم بلدان میں کلبی نے کہا ہے کہ ان دونوں کے نام پر یہ جگہ شراف اور واقصہ کے نام سے منسوب ہے۔شراف اور واقصہ کے درمیان تین بڑے کنویں تھے جن کا پانی بہت شیریں تھا۔ان کنوؤں کو نسلِ عمالیق میں سے شراف نے کھودا تھا۔

امام حسین علیہ السلام اس جگہ صبح کے قریب پہنچے۔امامؑ نے یہاں پر اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ جتنا ہو سکے یہاں سے پانی لے کر ذخیرہ کر لیں۔یہاں سے کوچ کرنے کے بعد ظہر کے قریب امامؑ نے کوفہ کی طرف سے آتے ہوئے ایک بڑے لشکر کو دیکھا۔لشکر کو دیکھ کر آپؑ نے اپنے بائیں جانب ذوحسم نامی پہاڑ کے دامن میں پناہ لی۔آپؑ نے دیکھ کہ حر کی قیادت میں ایک ہزار کا لشکر عبیداللہ ابن زیاد کے حکم پر اس غرض سے بھیجا گیا ہے کہ وہ نہ آپؑ کو کوفہ کی طرف بڑھنے دے اور نہ مدینہ واپس جانے دے۔یہ لشکر جب امام حسینؑ کے مقابل پہنچا تو آپؑ نے دیکھا کہ پورا لشکر پیاس کی شدت سے بے حال ہے۔امامؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ حر کے تمام لشکر کو اور ان کی سواریوں کے جانوروں کو پانی سے سیراب کیا جائے۔اس لشکر میں علی ابن طعان محاربی نامی ایک ایسا شخص بھی تھا جس کا پیاس کی شدت سے برا حال تھا یہاں تک کہ اس میں مشکیزہ کے دہانے کو پکڑنے اور خود سے پانی پینے کی بھی تاب نہ تھی۔یہ دیکھ کر امامؑ خود آگے بڑھے اور اپنے ہاتھ سے اسے پانی پلایا۔

اس کے بعد حر نے امامؑ سے یہاں آنے کی وجہ پوچھی اور پوچھا کہ آپؑ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہاں اپنی طرف سے خود نہیں آیا ہوں بلکہ تم لوگوں کی طرف سے مجھے خطوط ملے اور تمہارے نمائندوں نے آ کر مجھے کوفہ آنے کی نہ صرف دعوت دی بلکہ اصرار کیا کہ میں اپنی مسئولیت کو پورا کروں۔چنانچہ میں اسی دعوت پر یہاں آیا ہوں۔اب اگر تم لوگ اپنی دعوت پر قائم ہو تو میں نے اپنا عہد ایفا کر دیا ہے اور اگر تم لوگ میرے آنے سے ناخوش ہو اور اپنے عہد سے پھر گئے ہو تو میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔

اس گفتگو کے دوران نماز کا وقت ہو گیا تو امامؑ نے ہجاج بن مسروق جعفی کو ظہر کی اذان دینے کا حکم دیا اور حر سے فرمایا کہ میں اپنے اصحاب کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں تم اپنے لشکر کے ساتھ نماز پڑھو۔حر نے جواب دیا کہ ہم علیحدہ نہیں بلکہ آپؑ کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔

بیضا

یہ مقام واقصہ اور عذیب الہجانات کے درمیان واقع ہے۔یہ ایک وسیع میدان ہے۔جو بنی یربوع بن حنظلہ کی ملکیت ہے۔یہاں امام حسین علیہ السلام نے حر سے خطاب فرمایا۔

یہاں سے آگے ایک جگہ ہے جس کا نام "رہیمیہ" ہے۔یہاں ابوھرم نامی شخص جو کوفہ سے آ رہا تھا امامؑ سے ملا اور ان سے پوچھا کہ "کس امر نے آپؑ کو اپنے جدؐ کے حرم سے نکلنے پر مجبور کیا؟" آپؑ نے جواب دیا کہ۔

"اے ابوھرم! بنی امیہ نے میرے خاندان کو سب و شتم کیا (غالباً مراد امیر المومنین علی علیہ السلام پر منبروں سے سب و شتم کئے جانے سے ہے) میں نے صبر کیا' انہوں نے میرا مال چھینا (مراد غالباً فدک سے ہے) اس پر بھی میں نے صبر کیا' اب یہ لوگ میری جان کے درپے ہیں اور میرا خون بہانا چاہتے ہیں اس لئے میں مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔خدا کی قسم یہ لوگ مجھے قتل کر کے دم لیں گے اور جب یہ مجھے قتل کر دیں گے تو (دیکھنا کہ) ان پر ایسا شخص مسلط ہو گا جو انہیں ذلیل کر دے گا یہاں تک کہ یہ لوگ اس قومِ سبا سے زیادہ ذلیل ہوں گے جس پر ایک عورت حکومت کرتی تھی۔"

رہیمیہ

رہیمیہ' رہم کا اسمِ تصغیر ہے۔یہ ایک جگہ ہے جو کوفہ سے ایک منزل پہلے ہے۔کوفہ سے شام جاتے ہوئے یہیں سے گزرتے ہیں۔رہیمیہ کے بعد قصرِ بنی مقاتل آتا ہے۔

امام حسینؑ رہیمیہ کے بعد قصرِ بنی مقاتل پہنچے۔امامؑ جب رہیمیہ پہنچے تو ابوھرم نامی ایک شخص

یہاں آپؑ سے ملا اس نے آپؑ سے پوچھا کہ۔

"فرزند رسولؐ! کس چیز نے آپؑ کو آپؑ کے جدؐ کے حرم سے جدا ہونے پر مجبور کیا۔"

امامؑ نے جواب دیا۔

"بنی امیہ نے میرے ناموس کو سب وشتم کیا۔ میں نے صبر کیا' میرے مال کو لوٹا میں نے صبر کیا' اب یہ میرا خون بہانے پر تلے ہیں تو میں نکلا ہوں۔ خدا کی قسم! اگر انہوں نے مجھے قتل کیا تو میرے بعد خداوند عالم ان کے سروں پر ایسی تلوار مسلط کرے گا جو انہیں قتل کرتی رہے گی' خدا ان پر ایسے شخص کو مسلط کرے گا جو ان کو ذلیل وخوار کرے گا اور یہ لوگ اس قوم سبا سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہوں گے جس پر ایک عورت حکومت کرتی تھی۔"

قطقطانہ یا قطقطہ

بارش کے چھوٹے قطرات اور کنویں سے نکالے جانے والے پانی سے جو قطرات ابھرتے ہیں انہیں قطقطانہ یا قطقطہ کہتے ہیں۔

یہ اس مقام کا نام ہے جو کوفہ اور کربلا کے درمیان واقع ہے اور کوفہ سے نزدیک تر ہے۔ یہاں نعمان ابن منذر کا قید خانہ ہے۔ رہیمہ کے بیان میں قطقطانہ کا ذکر آتا ہے اور رہیمہ وہ جگہ ہے جہاں سے امام حسین علیہ السلام گزر رہے تھے۔ رہیمہ اور قطقطانہ کے درمیان بیس میل کا فاصلہ ہے
-

قادسیہ

قادسیہ وہ مقام ہے جو کوفہ سے پندرہ فرسخ کے فاصلے پر ہے۔ قادسیہ اور "عذیب الہجانات" کے درمیان چار میل کا فاصلہ ہے۔ جیسا کہ ابوعمرو نے کہا ہے "قادسیہ" لفظ "قادس" سے لیا ہے جس کے معنی ہیں بڑی کشتی۔ "قادسیہ" کا پہلے "قدیس" کہا جاتا تھا جو لفظ "قدس" سے لیا گیا۔

اس جگہ کو قادسیہ کہنے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس جگہ پر مسلمانوں اور فارس کے

لشکروں کے درمیان چار روز تک سخت جنگ ہوئی۔ ان چار دونوں میں سے ہر دن کا ایک نام رکھا گیا۔ ان میں سے ایک دن کا نام "قادس" رکھا گیا اور یہ وہ دن تھا جس دن مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس دن کا نام "یوم القادسیہ" رکھا گیا اور اس لحاظ سے اس جگہ کا نام "قادسیہ" پڑا۔ قادسیہ کی جنگ ۱۷ ہجری میں خلافت دوئم میں سعد ابن ابی وقاص کی قیادت میں لڑی گئی اور اس میں مسلمان فتحیات ہوئے۔

قیام امام حسینؑ کے سلسلہ میں قادسیہ کا نام دو حوالوں سے آتا ہے۔ ایک یہ کہ حضرت مسلم ابن عقیل کی شہادت کے بعد عبیداللہ ابن زیاد نے حصین ابن نمیر کی قیادت میں ایک لشکر اس مقام پر متعین کیا تاکہ وہ کوفہ میں داخل ہونے والوں اور کوفہ سے نکل کر جانے والوں کی نگرانی کرے۔ ادھر امام حسین علیہ السلام جب منزل ثعلبیہ پر پہنچے تو آپؑ نے کوفہ کے شیعوں کے نام عبداللہ ابن یقطر یا قیس ابن مسہر صیداوی کے ہاتھ ایک خط یا دونوں کے ہاتھ الگ الگ دو خط لکھ کر کوفہ روانہ کئے۔ امامؑ کے ان دونوں قاصدوں کو حصین ابن نمیر نے قادسیہ کے مقام پر گرفتار کیا اور انہیں عبیداللہ ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔

ذوحسم

امام حسینؑ صبح کے اول وقت میں منزل شراف سے نکلے اور دن کو دوپہر کے وقت جب ذوحسم پہنچے تو آپؑ نے ایک لشکر کی بڑی تعداد کو آتے ہوئے دیکھا۔ اس لشکر کو دیکھ کر امامؑ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی پناہ گاہ ہے جہاں دشمن ہم پر پیچھے سے حملہ نہ کر سکے اور ہم سامنے سے دشمن کا حملہ روک سکیں تو اصحاب نے جواب دیا کہ یہاں نزدیک میں ذوحسم نامی ایک پہاڑ ہے جو ہمارے لئے ایسی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے' اس پر امامؑ نے اپنی حرکت کا رخ بائیں طرف کر دیا۔ حر کی قیادت میں آنے والے لشکر نے بھی اپنا رخ اسی سمت موڑ دیا لیکن "ذوحسم" پہاڑ تک پہلے پہنچنے میں امامؑ کامیاب ہو گئے۔ حر اپنے لشکر کے ساتھ جب وہاں پہنچا تو امامؑ نے

اس سے پوچھا: تم یہاں کیوں آئے ہو؟

حر نے جواب دیا: میں آپؑ کو گرفتار کر کے کوفہ لے جانے پر مامور ہوا ہوں۔

امام حسینؑ اور حر کے درمیان اس گفتگو کی دوران نماز کا وقت ہو گیا۔ امام حسینؑ کی اقتداء میں نمازِ جماعت ہوئی۔ نماز کے بعد امامؑ نے خطبہ دیا اور اس کے بعد آپؑ نے اپنے کاروان کو سفر جاری رکھنے کا حکم دیا لیکن حر نے آ کر آپؑ کا راستہ روکا۔ آپؑ نے حر سے فرمایا:

''تمہاری ماں تمہارے غم میں بیٹھے، تم آخر چاہتے کیا ہو؟''

حر نے جواب دیا: آپؑ کے علاوہ کوئی اور اگر میری ماں کا نام لیتا تو میں جواب دیتا لیکن آپؑ کی ماں کا نام میں بغیر ادب نہیں لے سکتا۔ میں بہر حال اس بات پر مامور ہوا ہوں کہ آپؑ کو گرفتار کر کے لے جاؤں، البتہ مجھے آپؑ سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

امامؑ نے فرمایا: ''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔''

اس پر حر نے کہا: ''پھر آپؑ قادسیہ اور عذیب الہجانات کے درمیان کوئی ایسا راستہ اختیار کریں کہ نہ آپؑ حجاز جا سکیں اور نہ ہی میں آپؑ کو کوفہ لے جاؤں۔''

امامؑ نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور ذو حسم سے اپنے کاروان کا رخ بائیں جانب موڑ دیا۔

یہ راستہ قصرِ بن مقاتل سے ہوئے نینوا تک پہنچتا ہے۔

حر سے اس گفتگو کے بعد امام حسینؑ ذو حسم سے نکلے اور عذیب الہجانات پہنچے۔ اس اثناء میں حر آپؑ کے ساتھ ساتھ رہا۔

عذیب الہجانات

عذیب، عذب کی تصغیر ہے اور عذب خوشگوار پانی کو کہتے ہیں۔ یہاں ایک نہر ہے جو قادسیہ اور مغیثہ کے درمیان ہے۔ یہاں سے قادسیہ چار میل اور مغیثہ بتیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ جگہ اہلِ فارس کے محاذ میں شمار ہوتی تھی۔ کوفہ کے حاجی یہاں قیام کرتے تھے۔ یہ جگہ بنی تمیم کے

تصرف میں تھی۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں ہلال بن نافع، مجمع بن عبداللہ مزحجی، اس کا غلام عمر ابن خالد صیداوی اور طرماح وغیرہ کوفہ سے آ کر امام حسینؑ کے ساتھ شامل ہوئے۔ یہ لوگ کوفہ سے امامؑ کے لشکر میں شامل ہونے کے لئے امامؑ کی طرف آ رہے تھے کہ حر نے ان کا راستہ روکا۔ امامؑ نے حر سے فرمایا کہ ''یہ میرے انصار و جانثار ہیں اور میرے لشکر میں شامل ہیں۔ اگر تم نے ان کا راستہ روکا تو میں مزاحمت کروں گا۔'' اس پر حر نے ان لوگوں کو امامؑ کی خدمت میں جانے کا راستہ دے دیا اور یہ لوگ آپؑ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ امامؑ نے ان سے کوفہ کے حالات معلوم کئے تو انہوں نے بتایا کہ حکومت وقت نے بڑے بڑے لوگوں کو بھاری رشوتیں دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے لیکن عام لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم جب کوفہ سے نکلے تو دیکھا کہ ایک بڑا لشکر کوفہ کے باہر جمع ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ لشکر آپؑ سے جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے امامؑ سے پوچھا کہ جو لوگ آپؑ کے ساتھ ہیں کیا ان کے علاوہ اور کوئی آپؑ کے ساتھ نہیں؟ ان لوگوں نے امامؑ سے کہا کہ اگر آپؑ مناسب سمجھیں تو اس پہاڑ پر چلے جائیں، یہاں ایک قلعہ ہے جو غساں اور حمیر سے تعلق رکھتا ہے۔ بیس ہزار کی فوج بھی اگر یہاں حملہ کرے تو وہ آپؑ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ امامؑ نے جواب دیا کہ ہمارے اور ان (اہلِ کوفہ) کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا ہے جس پر مجھے بہر حال عمل کرنا ہے۔ یہ فرما کر امامؑ قصرِ بنی مقاتل کی طرف روانہ ہوئے۔

قصرِ بنی مقاتل

یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ ''قصر'' اور ''بنی مقاتل'' دو لفظوں سے مرکب ہے۔

قصر

قصر کے کئی معنی ہیں۔

(۱)قصر یعنی مقصد، غایت۔

(۲)قصر یعنی روکنا، منع کرنا۔

(۳)قصر یعنی کسی چیز کو اپنے اصل سے ملانا۔

(۴)قصر یعنی یعنی ضیق، باندھنا۔

(۵)قصر یعنی نصف کرنا، آدھا کرنا۔

اور

(۶)قصر یعنی کاٹنا۔

یہاں قصر کے معنی بلند محل اور عمارت کے ہیں۔ایسی عمارت جو محکم ہو اور چاروں طرف سے محصور ہو جس میں کوئی نہ آ سکے اسے قصر کہتے ہیں جیسے ''حور مقصورات'' یعنی ایسی حوریں جو قصر میں بند ہیں۔لفظ قصر ہمیشہ مضاف کے معنوں میں آتا ہے جو کسی سے نسبت رکھتا ہو۔

مقاتل

دوسرا لفظ ''مقاتل'' ہے۔یہ مقاتل بن حسن تغالبہ سے منسوب ہے۔کتاب ''معجم بلدان'' میں اس کو قیس ابنِ زید بن منات بن تمیم سے نسبت دی ہے۔

یہ جگہ عین التمر اور قطقطانہ کے درمیان واقع ہے۔اس کو قیس ابن علی ابن عبداللہ نے ویران اور برباد کیا اور بعد میں اسے آباد کیا۔

عبیداللہ ابنِ حرِ جعفی سے امامؑ کی ملاقات

امام حسینؑ علیہ السلام جب یہاں پہنچے تو دیکھا کہ یہاں پہلے ہی سے ایک بہت بڑا خیمہ نصب ہے جس میں عبیداللہ ابنِ حرِ جعفی مقیم ہے۔اس کے خیمے کے دروازے پر ایک طویل نیزہ نصب تھا، سامنے ایک زین کسا ہوا گھوڑا موجود تھا جس پر ایک تلوار لٹکی ہوئی تھی۔یہ سب اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ اس خیمے میں کوئی شجاع اور جنگجو شخص قیام پذیر ہے۔یہ شخص بہت

بہادر اور شجاع سمجھا جاتا تھا اور شعراء میں اس کا شمار ہوتا تھا۔یہ اپنی طاقت اور قوت کے بل بوتے پر لوگوں کی جائیداد پر ڈاکہ ڈالتا اور راستوں پر لوگوں کو لوٹا کرتا تھا۔یہ عثمانی العقیدہ تھا اور دل میں حضرت علیؑ کے خلاف کدورت رکھتا تھا، اسی وجہ سے یہ جنگِ صفین میں علیؑ کے خلاف معاویہ کے لشکر میں شامل تھا۔

جنگِ صفین کے بعد عبیداللہ ابنِ حرِ جعفی نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھا۔اس طرح ایک عرصہ گزر گیا۔اس عرصہ میں اس کی بیوی کو جو کوفہ میں رہتی تھی جب ایک مدت تک اس کے مرنے یا زندہ رہنے کی خبر نہ ملی تو اس کی واپسی سے مایوس ہو کر اسکے بھائی نے اس کو عکرمہ کے عقد میں دے دیا۔عبیداللہ جعفی کو جب یہ خبر ملی کہ اس کی بیوی نے عکرمہ سے عقد کر لیا ہے تو وہ کوفہ آیا اور حضرت علیؑ کی خدمت میں شکایت کی کہ میری بیوی عکرمہ کے عقد میں آ گئی ہے۔علیؑ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ ''کیا تم وہی آدمی نہیں ہو جس نے ہمارے خلاف ہمارے دشمن کا ساتھ دیا اور اس کی مدد کی؟'' اس نے کہا کہ ''کیا اس بناء پر میں آپؑ کی عدالت اور انصاف سے محروم ہو جاؤں گا؟'' تو علیؑ نے جواب دیا کہ ''نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔'' آپ نے فوراً اس کی بیوی کو جو اس وقت حاملہ تھی عکرمہ سے واپس لیا اور ایک امین شخص کے سپرد کیا۔بچہ کی پیدائش کے بعد آپؑ نے بچہ کو عکرمہ کے اور بچہ کی ماں کو عبیداللہ جعفی کے حوالے کر دیا۔وہ اپنی بیوی کو لے کر شام چلا گیا اور جب تک حضرت علیؑ زندہ رہے وہ شام میں رہا۔حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد واپس کوفہ آ کر یہاں سکونت اختیار کی۔

جب اس نے یہ سنا کہ امام حسینؑ کوفہ سے فرار ہو کر قصرِ بنی مقاتل پہنچا۔

ادھر امامؑ جب قصرِ بنی مقاتل اور دیکھا کہ عبیداللہ ابنِ حرِ جعفی یہاں مقیم ہے تو آپ نے حجاج ابنِ مسروق جعفی کو یہ پیغام دے کر اس کے پاس بھیجا کہ وہ آپ کا ساتھ دے اور آپؑ کی نصرت کرے۔حجاج یہ پیغام لے کر اس کے پاس گئے اور کہا کہ۔

"میں امامؑ کی طرف سے تمہارے لئے نیکی اور سعادت کا ہدیہ لے کر آیا ہوں۔امامؑ نے تمہیں اپنی حمایت ونصرت کے لئے بلایا ہے۔اگر تم ان کے رکاب میں ان کے دشمن سے جنگ کرو گے تو عظیم اجر وثواب کے مستحق قرار پاؤ گے اور اگر مر گئے تو شہداء میں تمہارا شمار ہوگا۔"

امامؑ کے اس پیغام کے جواب میں عبیداللہ جعفی نے کہا کہ۔

"واللہ! میں نے کوفہ اس لئے چھوڑا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ حسینؑ کے خلاف جنگ کے لئے نکل رہے ہیں'انہوں نے حسینؑ کو تنہا اکیلا چھوڑ دیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ حسینؑ قتل ہونے والے ہیں'میں اپنے نفس کو موت کے لئے آمادہ نہیں پاتا اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میرا اور حسینؑ کا آمنا سامنا ہو۔"

حجاج نے واپس آ کر اس کا یہ جواب امامؑ کو پہنچایا۔اس کا یہ جواب سن کر امامؑ خود بہ نفس نفیس اپنے خاندان کے چند افراد اور دیگر چند شخصیات کے ہمراہ اس کے پاس پہنچے۔آپؑ کو جگہ دی۔ وہ کہتا ہے کہ "حسن وجمال میں حسینؑ جیسا میں نے کہیں نہیں دیکھا'مجھے کبھی کسی کو دیکھ کر اتنی رقت نہیں ہوئی جتنی حسینؑ کو ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ دیکھ کر ہوئی'جب میری نظر آپ کی ریشِ مبارک پر پڑی تو میں نے پوچھا کہ آپ کی ریشِ مبارک کے بالوں کی سیاہی قدرتی ہے یا آپ نے خضاب لگایا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ بڑھاپے نے مجھ پر جلدی حملہ کیا ہے' آپ کے اس جملہ سے میں سمجھا کہ یہ خضاب کا اثر ہے۔"

امام حسین علیہ السلام نے خداوندِ ذوالجلال کی حمد وثناء کے بعد فرمایا کہ۔

"اے عبداللہ! تمہارے شہر والوں نے متحد اور متفق ہو کر مجھے کوفہ آنے کی دعوت دی لیکن اب معلوم ہوا کہ حالات ایسے نہیں ہیں۔

عبداللہ! تمہاری گردن پر بہت گناہ ہیں' کیا تم چاہو گے کہ توبہ کرو......ایسی توبہ کہ تمہارے تمام گناہ دھل جائیں؟"

اس نے پوچھا: "یا فرزندِ رسولؐ! وہ کون سی توبہ ہے؟"

آپؑ نے جواب دیا: "تم ہمارے ہمرکاب ہو کر ہمارے دشمن سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔"

اس نے جواب دیا: "میں جانتا ہوں کہ جو آپؑ کا ساتھ دے گا اور آپ کی پیروی کرے گا وہ آخرت میں سعادت مند ہوگا'لیکن میں نے کوفہ میں آپ کی مدد کرنے والا ایک فرد بھی نہیں دیکھا'میرا اپنا نفس موت کے لئے آمادہ نہیں اس لئے آپؑ مجھے معاف رکھیں اور مجھ سے اپنی مدد ونصرت کا تقاضا نہ کریں......ہاں! البتہ اس سلسلے میں'میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اپنا وہ تیز رفتار گھوڑا پیش کر دوں جس پر بیٹھ کر جب بھی میں کسی کے پیچھے گیا تو اسے جالیا اور جس سے میں نے فرار کیا وہ مجھے پا نہ سکا۔"

آپ نے اس کی اس پیشکش کے جواب میں فرمایا کہ۔

"جب تم نے میری مدد کرنے سے اپنی جان چرائی اور میری نصرت سے روگردانی کی تو مجھے تمہارے گھوڑے یا تمہاری کسی اور چیز کی ضرورت اور طمع نہیں۔میں گمراہ لوگوں سے کسی مدد یا پشت پناہی کا خواہاں نہیں۔

البتہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم ہم سے اتنی دور چلے جاؤ کہ ہماری رمق بھی نہ دیکھ سکو اور نہ ہی ہماری صدائے استغاثہ سن سکو۔خدا کی قسم! جو بھی ہمارے استغاثہ کی آواز کو سنے اور ہماری مدد کو نہ آئے'خدا اس کو منہ کے بل جہنم میں داخل کرے گا۔"

امامؑ کے کلام کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور یہ بدنصیب انسان جو لوگوں میں بہادر اور شجاع سمجھا جاتا تھا'ایک طویل مدت جنایت وانحرافات اور ضلالت وگمراہی میں گزارنے کے بعد اپنے دروازے پر آئے ہوئے سعادت ونجات کے ہدیۂ الٰہی کو ٹھکرا کر ہمیشہ کے لئے حسرت وندامت کا سرمایہ سمیٹ کر شرمندگی کے عالم میں بزدلی کے ساتھ قصر بنی مقاتل سے چلا گیا۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد حق وباطل کی جنگ کے شعلے جب ٹھنڈے پڑ گئے تو یہ شخص عبداللہ ابن زیاد کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اس کے دربار میں یہ یقین دلانے کے لئے گیا کہ "میں حسینؑ کے لشکر میں شامل نہیں تھا اور میں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔" لیکن ظالم وجابر حکمران ایسے لوگوں سے کہ جو خود کو غیر جانبدار اور الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں کسی اور طریقے سے نمٹتے ہیں۔ ان ظالم وجابر حکمرانوں کو مطمئن کرنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ کوئی شخص ان کے مخالف اور دشمن کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ وہ ان کی حکومت کا ساتھ نہ دینے پر ایسے لوگوں سے بازپرس کرتے ہیں۔ چنانچہ عبیداللہ ابنِ زیاد نے عبیداللہ ابنِ حرجعفی سے اس کوتاہی پر بازپرس کی اور پوچھا کہ۔

"تو اتنے عرصے کہاں تھا؟"

عبیداللہ جعفی نے جواب دیا: "میں بیمار تھا۔"

ابن زیاد نے کہا: "جسمانی طور پر بیمار تھا یا قلبی طور پر؟ کیا تو ہماری دشمن کے ساتھ نہیں تھا؟"

اس نے جواب دیا: "میں اتنا غیر معروف آدمی تو نہیں ہوں کہ میں حسینؑ کے لشکر میں ہوتا اور کسی کو پتہ نہ لگتا۔"

ابن زیاد اور عبیداللہ جعفی کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک مرتبہ ابنِ زیاد کی نظر اس سے ہٹی اور وہ کسی اور طرف متوجہ ہوا۔ عبیداللہ جعفی موقع غنیمت دیکھتے ہوئے وہاں سے فرار ہو گیا۔

حسین ابن علیؑ کا ساتھ نہ دے کر عبیداللہ جعفی نہ ابدی سعادت حاصل کر سکا نہ حکامِ وقت کی خوشنودی اور نہ ہی وہ اپنی بقیہ زندگی میں سکون پا سکا۔ حسرت وندامت کے عالم میں وہ بار بار ایک شعر پڑھتا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"میری زندگی کا یہ کتنا حسرت بھرا سانحہ ہے جو میرے سینے اور گلے کے درمیان مسلسل کھٹک رہا ہے کہ قصرِ بنی مقاتل پر حسین ابنِ علیؑ نے اہلِ ضلالت اور اہلِ نفاق سے لڑنے کے لئے مجھ

سے نصرت طلب کی اور کہا کہ .... "وائے ہو تجھ پر کہ تو مجھے چھوڑ کر جاتا ہے۔" کاش میں حسینؑ کی مدد کرتا تو قیامت کے دن سعادت کا مالک ہوتا۔ لیکن افسوس کہ میں نے ان کی مدد نہیں کی۔ جن لوگوں نے ان کی مدد کی انہیں سعادت نصیب ہوئی اور جنہوں نے غفلت برتی وہ نقصان اور خسارے میں رہے۔"

عبیداللہ ابنِ حرجعفی اور امام حسینؑ کے درمیان گفتگو پر تبصرہ

☆عبیداللہ جعفی نے امامؑ کا ساتھ دینے سے یہ کہہ کر معذرت طلب کی کہ۔ "میں نے دیکھا کہ کوفہ میں کوئی آپ کی مدد اور حمایت کرنے والا نہیں ہے۔"

ایسا ہی ایک مرحلہ اس وقت پیش آیا جب جناب زہرا ءسلام اللہ علیہا نے پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد قیادت کے رخ کو صحیح سمت میں لانے کے لئے معاذ ابن جبل کو ابوالحسنؑ کی حمایت کرنے کی دعوت دی تو ان کو بھی ایسا ہی جواب سننا پڑا۔ چنانچہ معاذ ابنِ جبل جیسے صحابی جلیل نے جواب دیا کہ۔

"میرے علاوہ اور کتنے افراد آپ کے ساتھ ہیں؟"

یعنی چونکہ آپؑ کے پاس افرادی قوت نہیں ہے اس لئے میں آپؑ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

عبیداللہ جعفی نے بھی امامؑ کا ساتھ دینے سے اپنے انکار کی یہ توجیہ پیش کی۔

"چونکہ آپؑ کے سات اور کوئی نہیں ہے اس لئے شکست اور موت آپ اور آپؑ کا ساتھ دینے والوں کے لئے حتمی اور یقینی ہے۔"

عبیداللہ جعفی اور اس جیسے دوسرے لوگ جنہوں نے امامؑ کا ساتھ دینے سے جان چرائی ان کی منطق یہ تھی کہ اس جنگ میں امامؑ کی فتح کا کوئی امکان نہیں، البتہ اگر فتح پانے کا کوئی امکان ہوتا تو وہ آپ کا ساتھ دیتے تاکہ کوفہ میں امام حسینؑ کی حکومت قائم ہونے کے بعد ان لوگوں کو بھی کوئی عہدہ اور مقام ملتا۔ لہٰذا اس لحاظ سے اس کا یہ کہنا صحیح تھا کہ۔

"میں جلدی مرنے کے لئے تیار نہیں۔"

کیونکہ کوئی عہدہ اور اقتدار ملنے کی جب کوئی امید ہی نہ ہو تو پھر امامؑ کا ساتھ دینا گھاٹے اور خسارے کا سودا ہے۔

تاجرانہ ذہنیت رکھنے والوں کی کل بھی یہی سوچ تھی اور آج بھی ایسے لوگوں کی یہی سوچ ہوتی ہے جن کے نزدیک ادائیگی فرض اور مسئولیت نامی کوئی چیز نہیں ۔

☆امامؑ نے عبیداللہ جعفی کو گناہوں سے توبہ کرنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ۔

"تمہاری گردن پر بہت بڑا گناہ ہے' آیا تم اس گناہ کی توبہ کرنے کے لئے تیار ہو۔"

وہ کون سا بڑا گناہ تھا جس کو دھوڈالنے کی امامؑ نے اسے دعوت دی؟ اپنے اس گناہ سے عبیداللہ جعفی بھی آگاہ تھی اسی لئے اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون سا گناہ ہے بلکہ توبہ کی نوعیت اور کیفیت کے بارے میں پوچھا کہ۔

"فرزند رسولؐ! کون سی توبہ؟"

چنانچہ امامؑ نے جواب دیا کہ توبہ کی نوعیت اور کیفیت تمہارے گناہ سے ہم آہنگ ہے تمہارا گناہ یہ ہے کہ تم نے امام حق سے روگردانی کی اس لئے اس کی تلافی بھی یہی ہے کہ اب تم امام حق کا ساتھ دو۔

☆ کل کے عبیداللہ جعفی اور آج بھی ہزاروں عبیداللہ جعفی اپنی مادی سوچ اور فکر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ دین و دنیا دونوں کی سعادتیں روپیہ پیسہ اور مالِ دنیا کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ عبیداللہ جعفی نے اسی نقطہ نظر کے تحت کہا کہ "میں آپ کی مالی معاونت کرنے کو تیار ہوں۔"

"یہ میرا گھوڑا' یہ میری تلوار' یہ میرا نیزہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں اور یہ گھوڑا وہ ہے کہ اگر کسی کا پیچھا کرتا ہو تو اس کو بچ کے جانے نہیں دے گا اور اگر کسی سے فرار کرنا ہو تو اس کو کوئی پکڑ نہیں سکتا۔"

اپنے گھوڑے کی صفات بیان کرنے کے بعد اس نے امامؑ کو یہ مشورہ دیا کہ "آپ

اُس پر سوار ہو کر یہاں سے نکل جائیں' آپ کے بچوں کا میں ضامن ہوں میں بعد میں آپؑ کے بچوں کو آپ تک پہنچا دوں گا۔"

امامؑ نے فرمایا کہ۔

"جب تم اپنی جان دینے سے بخل سے کام لے رہے ہو تو مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں' کیونکہ میں ظالموں سے مدد اور پشت پناہی کا طالب نہیں۔"

یعنی تم نے اصل مسئلہ ہی سے انحراف کیا اور امام حق سے روگردانی کی تو تمہاری ظالم ہونے میں اب کوئی شک نہیں ۔امام وقت سے جو منحرف ہو وہ ظالم ہے اور میں ظالموں سے مدد نہیں لیتا ۔کیونکہ نصِ قرآن کے تحت ظالموں سے مدد لینا حرام ہے ۔

☆ کسی صالح قیادت کے تحت سعادت سے ہمکنار ہونے کے لئے دو عوامل کا موجود ہونا اور تیسرے عامل کا مفقود ہونا ضروری ہے ۔یہ دو عوامل موجود نہ ہوں یا ان میں نقص ہو اور تیسرا عامل مفقود نہ ہو تو انسان سعادت کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا ۔

(۱)۔ صالح قیادت کی موجودگی

معاشرے میں اگر صالح قیادت موجود نہ ہو تو معاشرے کا فساد و گمراہی سے دوچار ہونا ایک لازمی امر ہے لہٰذا سعادت کے حصول کے لئے ایک ضروری شرط صالح قیادت کی موجودگی ہے ۔

(۲)۔صالح رہبری کی شناخت

سعادت تک پہنچنے کے لئے دوسرا عامل قائد اور صالح رہبر کی شناخت ہے ۔

(۳)۔حائل رکاوٹوں اور موانع کا مفقود ہونا

صالح رہبری موجود ہو' لوگ اس کی کماحقہ معرفت بھی رکھتے ہوں لیکن تیسرا عامل یعنی اہل و عیال کی محبت' مال و دولت کی طمع اور حبِ جاہ و منصب اگر راہ میں رکاوٹ بن جائیں تو نہ رہبری کی موجودگی اس کے کچھ کام آ سکتی ہے اور نہ رہبری کی معرفت اسے سعادت کے ساحل تک

پہنچا سکتی ہے۔

چنانچہ عبید اللہ جعفی کے سامنے امام وقتؑ بہ نفس نفیس خود موجود ہیں' وہ امامؑ کی معرفت بھی خوب رکھتا ہے جیسا کہ خود قسم کھا کر کہتا ہے کہ۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو آپ کا ساتھ دے گا وہ آخرت میں سعادت سے ہمکنار ہو گا۔''

لیکن امام وقتؑ کی موجودگی اور آپ کی تمام تر معرفت رکھنے کے باوجود وہ امامؑ کا ساتھ نہیں دیتا اس لئے کہ حب دنیا مانع ہے۔

یہ تین غیر مقدس تثلیث......یعنی (۱) اہل وعیال' (۲) مال و دولت اور (۳) جاہ و منصب وہ فتنے ہیں جو امام حق کا ساتھ دینے اور اس کی راہ کو اپنانے میں ہمیشہ آڑے آتے رہے ہیں اور امامؑ کی معرفت اور اس کی راہ سے آشنائی کے باوجود انسان کو سعادت سے دور اور شقاوت سے ہمکنار کرتے رہے ہیں لہٰذا ان رکاوٹوں کو اپنی سعادت کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہئے۔

چنانچہ اگر تاریخِ ائمہؑ کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ صرف عبید اللہ جعفی ہی نہیں بلکہ سینکڑوں انسان جو ہم سے کئی گنا زیادہ امامؑ کی معرفت رکھتے تھے لیکن راہ میں حائل ان رکاوٹوں کو ہٹا نہ سکنے کی وجہ سے معرفت کے باوجود نہ صرف یہ کہ سعادت حاصل نہ کر سکے بلکہ الٹا شقاوتِ ابدی کو اپنے لئے خرید لیا۔

☆عبید اللہ جعفی نے جب امامؑ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ۔

''اگر میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو یہاں سے اتنی دور چلے جاؤ کہ میری صدائے استغاثہ نہ سن سکو کیونکہ میری صدائے استغاثہ سننے کے بعد بھی جو میری مدد کو نہ پہنچے وہ یقینی جہنم کا ایندھن بنے گا۔''

امامؑ نے یہ جملہ نہ صرف عبید اللہ جعفی سے کہا بلکہ ان تمام لوگوں سے کہا جنہوں نے امامؑ

کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔امامؑ کے اس فرمان کی دو توجیہہ ہو سکتی ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ کہ روایات سے ثابت ہے کہ اگر کوئی مسلمان فریاد و استغاثہ کرے اور اس کی فریاد و استغاثہ کو سننے والا اس کی مدد نہ کرے تو احادیث کی رو سے وہ مسلمان نہیں۔اور جو مسلمان نہ ہو وہ جہنمی ہے۔

ایک عام مسلمان کی فریاد رسی نہ کرنے والا جب جہنمی ہے تو امام وقتؑ کے استغاثہ پر خاموش رہنے والے کا ٹھکانہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نے ان لوگوں سے اس لئے دور چلے جانے کے لئے کہا ہو کہ یہ کمزور ضعیف الارادہ لوگ کہیں خوف کی وجہ سے یا کسی طمع و لالچ کے تحت دشمن کے لشکر سے نہ جا ملیں۔

انصار کا انوکھا کردار

اس کے علاوہ قصرِ بنی مقاتل پر عمرو ابن ضحاک بن عبد اللہ مشرقی اور اس کے چچا زاد بھائی مالک بن نصر ارجبی نے امامؑ سے ملاقات کی اور امامؑ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔امامؑ نے ان سے ان کی آمد کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ ''خدا آپؑ کو سلامت رکھے ہم آپ کو سلام عرض کرنے اور آپؑ کے ساتھ تجدید عہد کرنے حاضر ہوئے تھے۔اس کے علاوہ چاہتے ہیں کہ آپ کو لوگوں کی نیتوں اور ان کے ارادوں سے آگاہ کریں۔یہ لوگ آپؑ سے جنگ کرنے کے لئے متحد و متفق ہو چکے ہیں۔'' امامؑ نے فرمایا کہ ''خداوندِ عالم ہی ہماری مدد اور نصرت کے لئے کافی ہے وہی ہمارا وکیل ہے۔'' اس کے بعد یہ دونوں امامؑ کو الوداعی سلام کر کے اور امامؑ کے حق میں دعا کرنے کے بعد اٹھے۔جب یہ رخصت ہونے لگے تو امامؑ نے فرمایا کہ ''تم دونوں میری مدد و نصرت کیوں نہیں کرتے ؟ تمہیں کون سا امر مانع ہے؟'' امامؑ کے طلبِ نصرت پر ان دونوں کا جواب کم وبیش ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ۔

''ہم عیالدار ہیں اور ہمارے بچے ہیں' اس کے علاوہ ہمارے اوپر لوگوں کے قرضے ہیں۔''

امامؑ نے ان دونوں کا جواب سن کر خاموشی اختیار کی۔

ابن ضحاک نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: ''میں اس شرط کے ساتھ آپؑ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں کہ میں آپ کے رکاب میں اس وقت تک آپ کے دشمنوں سے جنگ کروں گا جب مجھے اس بات کا یقین رہے گا کہ آپؑ بچ جائیں گے، لیکن جب یہ امید ختم ہو جائے گی اور میں نا امید ہو جاؤں گا تو میں آپؑ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ کیا آپ اس شرط کے ساتھ میری مدد قبول کرنے کو تیار ہیں؟''

امامؑ نے اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول فرما لیا۔

امامؑ اور ابنِ ضحاک اور ابنِ ارجی کے مابین گفتگو پر تبصرہ

☆عمر ابنِ ضحاک اور مالک بن ارجی جو امامؑ کی خدمت میں عقیدت پیش کرنے اور امامؑ کو سلام کرنے کے لئے آئے تھے انہوں نے امامؑ کا ساتھ دینے سے معذرت کی اور یہ عذر پیش کیا کہ۔

''ہمارے بال بچے کوفہ میں ہیں۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔۔۔

سوائے چند افراد کے کیا امامؑ کے لشکر میں موجود دوسرے اعوان و انصار کے بال بچے نہیں تھے؟ کیا ان کو یہ مسائل درپیش نہیں تھے صرف ان دونوں کو درپیش تھے؟

☆اس کے علاوہ ان دونوں نے امامؑ سے کہا کہ ''ہم آپ کی خدمت میں تجدید عہد کرنے آئے ہیں۔'' سوال یہ ہے کہ......

وہ کون سا تجدید عہد تھا؟

یہ جاننا ضروری ہے کیونکہ ہم بھی آج ائمہ علیہم السلام کے میلاد و شہادت کے موقعوں پر یہ جملہ دہراتے ہیں کہ......

''ہم آج یہاں امامؑ سے تجدید عہد کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔''

یہ جملہ ہم نے ان سے سیکھا ہے یا انہوں نے ہم سے سیکھا تھا؟

☆ان دونوں نے امامؑ کا ساتھ نہ دینے کے سلسلے میں ایک اہم فقہی عذر پیش کیا کہ......

''ہمارے اوپر لوگوں کے قرضے ہیں۔''

کیا لوگوں کے قرضوں کی اتنی اہمیت ہے کہ ان قرضوں کی ادائیگی سے پہلے امام وقتؑ کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا؟

کیا قرضوں کی ادائیگی کے قرینے کو وصیت اور دوسرے طریقوں سے حل نہیں کیا جا سکتا؟

اگر یہ منطق اور عذر قابلِ قبول تھا تو امامؑ نے اس عذر کی تائید و توثیق کیوں نہیں کی تا کہ رہتی دنیا تک اس کے لئے سند مل جاتی؟

دوسرے اگر یہ عذر معقول اور صحیح تھا تو آپ نے عمر ابنِ ضحاک کو کیوں منع نہیں کیا کہ تم پر میرا ساتھ دینے کا فرض اس لئے ساقط ہے کہ تمہیں اپنا قرض اتارنا ہے؟

☆عمر ابنِ ضحاک نے اتنے پس و پیش کے بعد اس عجیب شرط کے ساتھ آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا کہ...''جب آپ کے بچنے کی تمام امیدیں ختم ہو جائیں گی تو میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

''اور فی الواقع ہوا بھی یہی کہ جب آپ مصیبت کے عالم میں تنہا رہ گئے تو وہ آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ......

آپؑ نے اس کی اس شرط کو کیوں قبول کر لیا اور کیوں اسے اپنے کاروان میں شامل کر لیا؟

استقا

اس زمانے میں اور آج بھی دور دراز کے سفر اور خاص طور پر صحرا اور بیابانوں کے سفر میں پانی کی ضرورت رہتی ہے لہٰذا جہاں چشمہ یا خوشگوار پانی نظر آتا ہے وہاں سے پانی ساتھ لے لیتے ہیں، لیکن تاریخ میں کہیں یہ دیکھنے میں نہیں آتا کہ پانی اکٹھا کرنے کے لئے کیا اور کتنے وسائل و ذرائع میسر تھے۔ بہر حال امامؑ نے قصرِ بنی مقاتل چھوڑتے وقت صبح سے پہلے اپنے اصحاب کو حکم

دیا کہ یہاں سے پانی اکٹھا کرلیں۔ چنانچہ آپ یہاں سے پانی جمع کر کے روانہ ہو گئے۔

کربلا

کربلا ایک جگہ ہے جو کوفہ جاتے ہوئے راستے میں آتی ہے۔ معجم بلدان کے مطابق لفظ ''کربلا'' ''کربلہ سے لیا گیا ہے اور ''کربلہ'' کے معنی ہیں نرم زمین۔ چونکہ یہاں کی زمین نرم ہے اس لئے اس کربلا کہتے ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ''کربلا'' ''کربل'' سے لیا گیا ہے۔ ''کربل' ایک ترش سبزی کا نام ہے۔ شاید یہ سبزی یہاں زیادہ ہوتی ہوگی اس لحاظ سے اس کا نام کربلا پڑ گیا۔

علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ یہ لفظ ''کوربابل'' سے لیا گیا ہے۔

الستاس کربلی جسے ابواللغوی کہا جاتا ہے کا کہنا ہے کہ ''کربلا'' دو لفظوں 'کرب'' اور ''ایل'' سے مرکب ہے۔ ''کرب'' کے معنی ہیں 'حرم' اور ''ایل'' کے معنی ہیں 'اللہ''۔ دونوں لفظوں کو ملا کر اس کے معنی ''حرم اللہ'' یا ''معبد اللہ'' ہوتے ہیں۔ نینوا اور عقر بابل کے رہنے والوں کے لئے کربلا معبد تھا۔

بعض کے نزدیک ہر اس چیز کو جو غروب ہوا سے ''کرب'' کہتے ہیں جیسے ''کرب الشمس'' یعنی سورج کا غروب ہونا۔

کچھ لوگوں نے ''کربلا'' کو ''کراب'' کہا ہے اور کراب کے معنی ہیں جنگ اور قتل کی جگہ۔

درحقیقت یہ عربی کا لفظ نہیں ہے بلکہ سامیہ عجمی لفظ ہے۔ یہ سامی، آرامی و بابلیہ کی زبان ہے۔ یہ جگہ بابلیوں کے زیر حکومت تھی۔ ۱۴ ہجری میں حضرت عمر کے دور خلافت میں سعد بن ابی وقاص نے جب قادسیہ کو فتح کیا تو کربلا کو فوجیوں کا مرکز قرار دیا گیا پھر وہاں سے یہ مراکز کوفہ منتقل ہوا۔

ساسانیوں نے شاہ پور ذی الاکتاف کے دور میں عراق کو ضلعوں میں اور ہر ضلع کو تحصیلوں میں تقسیم

کیا۔ عراق میں ایک جگہ ہے جس کا نام بابل ہے جو نجف اور حلہ کے درمیان ہے۔ وہ لوگ حلہ کو 'کور' کہتے تھے۔ جب تقسیم شہر بندی کی گئی تو ''بابل' اور ''حلہ'' کے علاقے کا نام ''حلہ بابل ''یعنی'' کوربابل' ہوا۔ اور لفظ ''کربلا' کوربابل سے لیا گیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ ایک اشتباہ ہے۔

یہ ایک آباد شہر تھا' لیکن مسلمانوں نے اسے چھوڑ دیا تو یہ ویران اور بنجر زمین بن کر رہ گیا۔ اس زمین کے مختلف نام بیان کئے ہیں لیکن یہ تمام نام ایک جگہ کے نہیں ہیں بلکہ مختلف علاقوں اور مختلف منطقوں کے نام ہیں جسے لوگ ایک جگہ کا نام سمجھتے ہیں۔ مثلاً۔

(۱) نینوا۔ جو کربلا کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے۔

(۲) عقر۔ یہ جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔

(۳) نواویس۔ یہ شمال مغرب کی طرف ہے اور نصاریٰ کا قبرستان ہے۔

(۴) طف۔ دریا کی اوپر والی اونچی زمین کو کہتے ہیں۔

(۵) غاضری ہ۔ یہ ایک عورت کا نام ہے جو بنی عامر سے تھی اور یہاں رہتی تھی۔ اس کے نام پر اس جگہ کا نام غاضریہ مشہور رہا۔

(۶) نہر علقمہ۔

(۷) عمورا۔

(۸) ماریہ۔

کربلا کے شمال میں دجلہ اور جنوب میں فرات ہے' شمال مشرق میں ایران اور جنوب میں حجاز ہے۔

نینوا

نینوا ایک علاقے کا نام ہے جو دجلہ اور کربلا کے شمال مشرق کی طرف ہے۔ قدیم زمانے میں یہ منطقہ ''طف'' کا ایک گاؤں تھا۔ یہ بلندی پر واقع ہے۔ اس کی حدود نہر علقمہ سے ملتی ہیں۔

حضرت یونسؑ ابنِ متی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ آج کل اسے ''تورنج'' کہتے ہیں۔

امام حسینؑ جب اس جگہ پہنچے تو عبیداللہ ابنِ زیاد کا قاصد اس کا ایک خط لے کر یہاں پہنچا اور حر سے ملا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ امام حسینؑ کا کسی ایسی جگہ پر محاصرہ کرو جو بے آب و گیاہ ہو۔ حر نے جب امامؑ کا راستہ روکنا چاہا تو زہیر ابنِ قین نے امامؑ سے کہا کہ ہمارے لئے اس گروہ سے اس وقت جنگ کرنا آسان ہے' آئندہ حالات مشکل سے مشکل تر ہوتے چلے جائیں گے اور بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ امامؑ نے جواب دیا کہ۔

''میں نہیں چاہتا کہ جنگ کا آغاز میری طرف سے ہو۔''

غاضریہ

غاضریہ کربلا کی سرزمین کا نام ہے۔ یہ ایک گاؤں ہے جو کوفہ کے اطراف میں واقع ہے اور کربلا سے نزدیک ہے۔ غاضریہ طائفہ بنی اسد سے تعلق رکھتا ہے۔ بنی اسد کے عراق میں آنے کے بعد یہ گاؤں ان کے نام سے منسوب ہوا۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ۔

''غاضریہ میں ہماری قبور کی زیارت کرو۔ غاضریہ وہ بقعہ ہے جہاں حضرت موسیٰ ابنِ عمران نے خدا سے کلام کیا' حضرت نوحؑ نے خدا سے مناجات کی' یہ مقدس ترین سرزمین ہے۔ اس عظمت اس لحاظ سے ہے کہ خداوندِ عالم نے اپنے انبیاءؑ اور اولیاء کے اجسادِ پاک کو اس سرزمین میں رکھا۔''

امام حسین علیہ السلام جب کربلا پہنچے تو اہلِ نینوا اور اہلِ غاضریہ سے یہ علاقہ ساٹھ ہزار درہم میں خریدا اور زمین انہیں کو اس شرط کے ساتھ واپس کر دی کہ جب ہمارے زائرین یہاں آئیں تو ہماری قبر کی طرف ان کی رہنمائی کرنا اور تین دن تک ان کی مہمانی کرنا۔

امامؑ نے جو زمین یہاں خریدی وہ جیسا کہ تاریخ میں بیان کیا گیا ہے ایک بنجر اور غیر آباد زمین تھی۔ اسلامی فقہ میں قرآن و سنت کی رو سے ایسی زمین کسی کی ملکیت قرار نہیں پا سکتی کہ جس پر کسی

کو مالکانہ حقوق دیئے جائیں' ایسی زمینیں یا طبیعی طور پر آباد زمینیں امامؑ کی ملکیت ہوتی ہیں۔ امام حسین علیہ السلام شرعی لحاظ سے خود اس مالک تھے' جب امامؑ شرعی طور پر خود اس کے مالک تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپؑ نے خرید و فروخت کی صورت میں کیوں اس کو پہلے خریدا اور پھر ہدیہ یا عطیہ کے طور پر بنی اسد کو عطا کر دیا اور ان کو مالکانہ حقوق دے دیئے؟

اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔

☆ ایک یہ کہ شواہد و قرائن سے یہ بات کسی حد تک واضح ہو چکی تھی امامؑ یہیں پر شہید ہوں گے۔ اپنی شہادت کو حتمی سمجھتے ہوئے ممکن ہے آپ نے سوچا ہو کہ آپ کی شہادت کے بعد آپ کے پاس موجود ساٹھ ہزار درہم کی رقم مالِ غنیمت کے طور پر کیوں دشمن کے ہاتھوں میں جائے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ یہ رقم بنی اسد کے مستضعفین کے پاس جائے۔

☆ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ جانتے تھے آپؑ کی شہادت کے بعد یہ جگہ بارگاہ اور قبۂ عالم بنے گی اور یہ سرزمین رہروِ توحید پرستی اور شریعت کی سربلندی کے لئے مینارِ ہدایت ثابت ہو گی' زائرین جوق در جوق یہاں حاضر ہوں گے اور آپ کی اور آپ کے انصار و اعوان کی قبورِ مطہرہ سے ظالمین اور مستکبرین کے خلاف جہاد و مبارزہ کی روح اور غذا حاصل کریں گے۔ اس لئے یہاں کے رہنے والوں کا باہر سے آنے والے زائرین کے ساتھ سلوک و رویہ محبت بھرا اور مہمان نوازانہ ہو گا۔

نواویس

نواویس' ناؤس کی جمع ہے' قبر بنانے کے بعد علامت کے طور پر جو پتھر لگاتے ہیں اسے ناؤس کہتے ہیں۔ یہ جگہ گزشتہ زمانہ میں نصاریٰ کا قبرستان تھی۔ آج کل اسے ''اراضیہ جمالیہ'' کہتے ہیں۔ یہ کربلا کے شمال مغرب میں ہے۔ اس کا ذکر کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں آیا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ۔

"نواویس نے اپنی گرمی کی شدت کی خدا سے شکایت کی تو خدا نے فرمایا کہ چپ ہوجاؤ قاضیوں کی جگہ تم سے کہیں زیادہ گرم ہے۔"

امام حسین علیہ السلام نے اس جگہ کا ذکر مکہ میں اپنے اس خطبہ میں فرمایا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ۔

"نواویس اور کربلا کے درمیان درندے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کریں گے۔"

حضرت حر ابنِ یزید ریاحی کی قبر بھی یہیں ہے ان کی قبر یہاں ہونے کی دو توجیہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت حر جنگ کرتے ہوئے یہاں پہنچ کر شہید ہوئے۔ درمیان میں دشمن کے حائل ہونے اور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب ان کی لاشِ مطہر کو دیگر شہداء کے لاشوں کے پاس نہیں لا سکے۔ دوسری توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت حر کے قبیلہ والوں کو یہ معلوم ہوا کہ عمر سعد شہداء کے لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ان لوگوں نے حضرت حر کی لاش کو اس میدان سے دور لے جا کر یہاں دفن کیا۔

طف

یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ طف لغت میں زمین سے اوپر اٹھی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں۔ طف کوفہ کی آبادی سے ملے ہوئے دشتِ بیابان کا نام ہے۔ امام حسین یہیں پر شہید ہوئے۔ یہاں پر قدیم زمانے میں پانی کے چشمے ہوتے تھے۔ سرحدی فوجیں یہاں سے پانی لیتی تھیں۔ یہ جگہ قدیم زمانے میں طف کے نام سے معروف تھی۔

ادبیات اور شعراء کے کلام میں امام حسینؑ کہے جانے والے مرثیوں میں "روزِ طف"، "مقتولینِ طف" کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں پیغمبرِ اکرم کی پیشین گوئیوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ۔

"میرا یہ نواسہ ارضِ طف میں شہید ہوگا۔"

علقمہ یا علقمی

علقمہ ایک نہر کا نام ہے جو دریائے فرات سے نکلتی ہے۔ اس کا پانی صاف اور خوشگوار ہے۔ یہ پانی کربلا اور کربلا سے ملحق آبادی کو سیراب کرتا ہے۔ اس نہر کو علقمہ کہنے کی چند وجوہات ہیں۔

☆ یہ ایک شخص کے نام سے موسوم ہے جس نے اس نہر کو کھودا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کو موئیدالدین علقمی کے جد نے کھودا تھا جب کہ خود موئیدالدین علقمی نے اس نہر کو تباہ کیا۔ موئیدالدین علقمی عباسی حکومت کے آخری خلیفہ مستعصم کا وزیر تھا۔ (فرہنگِ عاشورا نقل از موسوعاتِ عتباتِ مقدسہ۔ ج ۸۔ ص ۳۲)

لیکن اس کو علقمی کہنے کی یہ توجیہ غلط ہے کیونکہ یہ نہر واقعہ کربلا سے بھی پہلے علقمی کے نام سے موجود تھی۔

صاحبِ کتاب "بطل العلقمی" لکھتے ہیں کہ نہیں معلوم کہ اس نہر کو کس نے کھودا تھا۔ شاید یہ بادشاہانِ کسریٰ کے دور سے بھی پہلے موجود ہو۔ یہ نہر فرات کے بند "ہندیہ" (کہ جو مسیّب میں ہے) سے نکلتی ہوئی حضرت عباسؑ کی مرقد کے قریب سے گزرتی ہے۔ وہاں سے نینوا کے جنوب مشرق کی طرف "برس" نامی قریہ میں پہنچتی ہے اور وہاں سے "خانہ نصف" نامی منزل سے گزرتی ہوئی کوفہ پہنچتی ہے۔

☆ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فرات کے شیریں اور خوشگوار پانی کی ضد میں اسے علقمہ (یعنی کڑوا پانی) کہا جاتا ہے کیونکہ عرب میں ایک قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے حسن و خوبی کی وجہ سے حد سے بڑھ جائے تو اس کو اس کی ضد سے متعارف کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔

خرمہ چونکہ بہت میٹھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ خرمہ کھاتے کھاتے منہ کھٹا ہوگیا۔

یا

دریائے نیل کہ جو دوسرے دریاؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ صاف و شفاف ہے اسے

زرقا کہتے ہیں۔

یا

کوا کہ جس کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں اسے اعور کہتے ہیں۔

یا

کنیز جو بہت حسین اور خوبصورت ہو اسے قبیحہ کہتے ہیں۔

اسی طرح

فرات کا صاف وشفاف اور خوشگوار پانی کہ جسے نومولود بچہ کو پلانے کے لئے تجویز کیا جاتا ہے اُسے اس کی ضد میں علقمہ یعنی (تلخ پانی) کہا گیا۔

☆ لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خیامِ اہل بیتؑ سے پانی اتنے نزدیک ہوتے ہوئے بھی اولادِ پیغمبر تشنہ و پیاسی رہی اور فرزندِ رسولؐ اپنے اعوان وانصار کے ساتھ بھوکے اور پیاسے شہید ہوئے اس لئے اسے علقمہ کہا گیا ہو۔

امام حسینؑ کا کربلا میں ورود

امام حسینؑ جب کوفہ کے اطراف میں واقع نینوا کے مقام پر پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ ایک شتر سوار جس کا نام مالک بن نصر تھا وہاں پہنچا۔ اس نے عبیداللہ ابن زیاد کی طرف سے ایک خط حر کو دیا یہ خط پڑھ کر حر نے امام حسینؑ کا راستہ روکا۔ امامؑ نے فرمایا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ ہم کو عذیب اور قادسیہ کے درمیان اس راستے پر اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت ہوگی جو نہ کوفہ جاتا ہو اور نہ مدینہ۔ حر نے جواب دیا کہ ابھی ابھی مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپؑ کو آگے نہ بڑھنے دوں اور آپ کو ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کروں کہ آپؑ کے ساتھ کوئی نرمی نہیں برت سکتا اور آپ کو مزید سہولت نہیں دے سکتا۔

اس اثناء میں آپ کی سواری نے بھی آگے قدم بڑھانے سے انکار کیا۔ اس پر امامؑ نے اپنے

اصحاب سے اس سرزمین کے نام کے بارے میں دریافت کیا تو زہیر نے کہا کہ اس سرزمین کا نام ”طف“ ہے۔ آپؑ نے پوچھا کہ کیا اس کا کوئی اور بھی نام ہے تو زہیر نے کہا کہ اسے کربلا بھی کہتے ہیں۔ امامؑ کی سواری کا اس مقام پر رکنا اور آگے قدم بڑھانے سے انکار کرنا ایسا ہی تھا جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ کی سواری کا حدیبیہ کے مقام پر رکنا اور آگے قدم بڑھانے سے انکار کرنا یا ہجرت کے موقع پر آنحضرتؐ کی سواری کا حضرت ابوایوب انصاری کے دروازے پر آ کر رک جانا اور آگے قدم بڑھانے سے انکار کرنا۔ بہرحال امامؑ نے جب یہ سنا کہ اس سرزمین کا نام ”کربلا“ ہے تو آپ نے فرمایا کہ ”ہم ہر کرب وبلا سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں“۔ اس کے بعد آپؑ نے فرمایا کہ ”ہم یہیں رکیں گے“ اور حکم دیا کہ ”سامان یہیں اتار دیا جائے“۔ جس دن آپ اس سرزمین پر پہنچے وہ ۲ محرم الحرام ۶۱ھ بدھ یا جمعرات کا دن تھا۔

آپؑ کے کربلا پہنچنے کے بعد جو واقعات اور حادثات پیش آئے وہ یہ ہیں۔

واقعات وحوادثِ کربلا

(۱)۔ آپؑ نے اپنے اہلِ بیتؑ کو جمع کر کے ان کے چہروں پر نظر ڈالی اور درگاہِ خدا میں مناجات کی کہ۔

”خداوندا! ہم تیرے نبیؐ کے اہلِ بیتؑ ہیں، ہمیں ہمارے گھروں سے نکالا اور اپنے جد کے حرم سے جدا کیا گیا ہے۔ بنی امیہ نے ہم پر ظلم وستم کیا ہے۔ پروردگارا! تو ہم کو ہمارا حق دلا اور ظالموں کے خلاف ہماری نصرت فرما۔“

(۲)۔ اس مناجات کے بعد آپ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ۔

”جو صورتِ حال ہمیں پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو۔ دنیا نے اپنی نیکیاں ہم پر بند کر دیں ہیں اور ہم سے اپنا منہ موڑ لیا ہے۔ اب اس زندگی میں کچھ باقی نہیں رہ گیا سوائے اس کے کہ جس طرح برتن کی تہہ میں کچھ تری باقی رہ جاتی ہے۔ اب جو کچھ ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے کسی

قبر پر کچھ سبزہ اگ آیا ہو۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور لوگ باطل سے باز نہیں آتے۔ ان حالات میں مومن کو چاہئے کہ وہ لقائے الٰہی کی تمنا کرے۔ میں تو ان ظالمین کے ساتھ زندہ باقی رہنے کو ہلاکت سمجھتا ہوں اور موت کو سعادت۔ لوگ دنیا کے غلام بن چکے ہیں۔ دین ان کی زبان پر ایک لقلقہ سے زیادہ نہیں۔ دین ان کے پاس بس اسی وقت تک ہے جب تک ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ جب بلائیں اور آزمائشیں ان کو گھیر لیں تو دین دار بہت کم رہ جاتے ہیں۔"

امامؑ نے اپنے اس خطاب میں دنیا کے چہرہ پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا کر اپنے اہلِ بیتؑ اور اصحاب کے سامنے جن حقائق کو پیش کیا ہے وہ یہ ہیں۔

☆ ہر مصیبت میں اور ہر حال میں بندے کو خدائے ذوالجلال کی قوت ہی سے پناہ مانگنا چاہئے کیونکہ اس کی ذات کے علاوہ کوئی پناہ اور ملجا نہیں۔

☆ لوگوں کی دین داری، دیانت داری اور مذہب سے اظہارِ محبت جو عام حالات میں نظر آتا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ نہیں کر لینا چاہئے۔ کسی شخص کا حقیقی چہرہ اس وقت سامنے آتا ہے جب آزمائش کی چھلنی میں اسے چھانا جائے اور آزمائش اور ابتلاء کی گھڑیاں اسے گھیر لیں۔

☆ انسان کی زندگی کی قدر و قیمت زندگی کے وسائل، آرائش اور آسائش کے سائے میں نہیں بلکہ اس کی قدر و قیمت حق کی سربلندی میں ہے۔ اگر حق اور شریعت کی حکمرانی نہ ہو تو تمام آسائشوں اور لذتوں سے منہ موڑ کر مومن کو آخرت کی اس ابدی سعادت کی طرف رخ کرنا چاہئے جس کا وعدہ خدا نے مومنین سے کیا ہے۔

امامؑ کا خطبہ ختم ہوتے ہی زہیر ابنِ قین اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا کہ "فرزندِ رسولؐ! ہم نے آپؑ کا فرمان سنا۔ اگر یہ دنیا ہمیشہ باقی رہنے والی بھی ہو یا خداوند عالم ہمارے لئے اسے ہمیشہ رہنے والی جگہ بھی بنا دے تب بھی ہم اس دنیا میں رہنے کے مقابلے میں آپؑ کے ہمراہ قیام

کرنے کو ترجیح دیں گے۔"

اس کے بعد نافع ابنِ ہلال اٹھے اور کہا کہ "فرزندِ رسولؐ! آپؑ بہتر جانتے ہیں کہ آپ کے جد پیغمبر ختمی مرتبتؐ کو یہ نصیب نہ ہوا کہ وہ اپنی محبت کا جام سب لوگوں کو پلا دیتے، ان کے دلوں کو اپنی محبت سے بھر دیتے اور سب کو اس راہ پر گامزن کر سکتے جس پر وہ ان کو لانا چاہتے تھے۔ ان کے حلقہ میں وہ منافق بھی تھے جو نصرت کا وعدہ کرتے تھے اور اپنے اندر غدر اور بے وفائی کو چھپائے جاتے تھے۔ انہی حالات میں خدا نے آپ کے جد کو اپنی طرف بلا لیا۔ اسی طرح آپؑ کے پدرِ بزرگوار کو بھی ایسے ہی بے وفا ساتھیوں سے سابقہ پڑا جو مختلف بہانوں کا سہارا لے کر ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے جب کہ ان کے بعض باوفا جانثاروں نے ان پر اپنی حقیر جانوں کو فدا کیا۔ آج آپؑ کو بھی ایسی ہی صورتِ حال درپیش ہے۔ فرزندِ رسولؐ! جس نے عہد و پیمان اور بیعت کو توڑا وہ خسارے میں رہا اور اپنا نقصان آپ کیا۔ لیکن ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ شرق یا غرب جہاں بھی آپ جائیں گے ہم آپؑ کے ساتھ ہیں۔"

(۳)۔ کربلا پہنچ کر آپؑ نے اپنے اہلِ بیتؑ اور اپنے اصحاب کے خیموں کو نصب کرنے کے لئے کہا۔ آپؑ نے حضرت ابوالفضل العباسؑ کو حکم دیا کہ اہلِ بیتِ اطہار کے خیمے ایک نشیب میں نصب کئے جائیں تاکہ آپ کی حیات میں دشمن کی نظریں ان پر نہ پڑیں یا جنگ کے دوران شہادت کے دلخراش مناظر پر آپ کے اہلِ حرم کی نظریں نہ پڑیں۔

اس کے بعد خیامِ اہلِ بیتؑ کے گرد نیم دائرے کی شکل میں بنی ہاشم کے جوانوں کے خیمے نصب کئے اور مرکزی خیمہ تلہ نبیہ پر نصب کیا۔

بنی ہاشم کے خیموں کے بعد اپنے ان اصحاب کے خیموں کو نصب کیا گیا جو میدانِ جنگ کے تجربہ کار تھے تاکہ وہ اہلِ بیتؑ کی حفاظت کر سکیں۔

غرض آپؑ نے اپنے اہلِ بیتؑ اپنے اعوان و انصار اور خود اپنا خیمہ اس آیت کی تفسیر کے

تحت نصب فرمائے........

"واوحینا الٰی موسٰی واخیہ ان تبوالقو مکما بمصر بیوتا واجعلوا بیوتکم قبلۃ......

(۴)۔کربلا پہنچتے ہی امامؑ نے ایک خط اپنے بھائی محمد حنفیہ اور دیگر اہلِ خاندان کے نام تحریر فرمایا جس کا مضمون یہ تھا۔

"دنیا اب ہمارے لئے ختم ہو چکی ہے اور آخرت تیزی کے ساتھ ہماری طرف رخ کئے ہوئے ہے۔"

عریان بن ہیثم سے روایت

عریان بن ہیثم قبیلہ بنی اسد کا ایک فرد تھا وہ کہتا ہے کہ۔

"ہمارا گھر کربلا کے نزدیک تھا' مقتل کی طرف ہماری آمدورفت رہتی تھی۔وہاں بنی اسد کا ایک شخص مسلسل مقیم تھا۔ایک دن میرے باپ نے اس سے پوچھا کہ تم ایک عرصہ سے یہاں مقیم ہو'یہاں کیا کرتے ہو؟تو اس نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے کہ حسینؑ یہاں شہید ہوں گے'میں ان کا انتظار کر رہا ہوں تا کہ ان کے ساتھ میں بھی شہید ہو جاؤں۔"

چنانچہ یہ اسدی امامؑ کے کربلا پہنچتے ہی ان کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

عریان بن ہیثم کہتا ہے کہ۔

"امام حسینؑ کی شہادت کی خبر سننے کے بعد ہم مقتل میں یہ دیکھنے کے لئے گئے کہ وہ اسدی شہید ہوا یا نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ شہید ہو چکا تھا۔"

انس بن حریث کاہلی صحابیِ پیغمبر کی شہادت

انس ابن حریث کاہلی پیغمبر اکرمؐ کے جلیل القدر صحابیوں میں تھے۔انہوں نے پیغمبر سے یہ حدیث سنی تھی کہ۔

"میرا فرزند حسینؑ کربلا میں شہید ہوگا' تم میں سے جو بھی اسے دیکھے اس کی نصرت کرے۔"

پیغمبرؐ کا یہ جلیل القدر صحابی کربلا میں شہید ہوگا' تم میں سے جو بھی اسے دیکھے اس کی نصرت کرے۔"

پیغمبرؐ کا یہ جلیل القدر صحابی کربلا میں امامؑ کے ساتھ شامل ہوا اور شہادت کی سعادت سے ہمکنار رہوا۔

ہرثمہ بن سلمہ کا فرار

ہرثمہ بن سلمہ عمر سعد کے لشکر میں شامل تھا'لشکر کے ساتھ جب یہ کربلا پہنچا تو بیس سال پہلے جنگِ صفین کا ایک واقعہ اسے یاد آیا کہ صفین جاتے ہوئے امیر المومنین علی علیہ السلام جب کربلا پہنچے تو آپؑ نے یہاں ایک درخت کے نیچے نماز پڑھی۔نماز پڑھنے کے بعد ایک مٹھی مٹی آپ نے اٹھائی' اسے سونگھا اور فرمایا کہ۔

"اے مٹی!افسوس کہ ایک قوم کے تمام افراد کا خون اس سرزمین پر بہایا جائے گا' وہ قتل کردیئے جائیں گے اور وہ سب کے سب بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے۔"

یہ واقعہ یاد آتے ہی ہرثمہ امام حسینؑ کے قریب آیا اور یہ واقعہ آپؑ کو سنایا۔امامؑ نے اس سے فرمایا کہ "اچھا!اب تم بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دو گے یا تم میرے خلاف ہو۔"ہرثمہ نے جواب دیا کہ۔

"میں بچے چھوڑ کر آیا ہوں' میں نہ آپ کے ساتھ ہوں اور نہ آپؑ کے خلاف۔"

یہ سن کر امامؑ نے اس کو نصیحت کی کہ۔

"تم جلد سے جلد یہاں سے نکل کر اتنی دور چلے جاؤ کہ میری صدائے استغاثہ تم تک نہ پہنچے۔ورنہ جو بھی ہمارے استغاثہ کی آواز سنے گا اور ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔خداوند عالم اسے واصل جہنم کرے گا۔"

ہرثمہ یہ سن کر وہاں سے فرار ہو گیا۔بعد میں اس نے امامؑ کی شہادت کی خبر سنی۔

حبیب ابنِ مظاہر کی ناکامی

امام حسینؑ کے باوفا شیدائی حبیب ابنِ مظاہر دیکھ رہے تھے کہ ۶ محرم سے عمر ابنِ سعد کے لشکر میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ دشمن کے لشکر میں بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر یہ مردِ فقیہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ:

"اے فرزندِ رسولؐ! یہاں نزدیک میں ہی قبیلۂ بنی اسد رہتا ہے اگر آپؑ اجازت دیں تو میں ان کے پاس جا کر آپؑ کے لئے ان سے نصرت طلب کروں شاید وہ آپؑ کی نصرت کے لئے آمادہ ہو جائیں۔"

"میں بھی اسدی ہوں اور میں تمہارے لئے ایک ایسی سعادت کا تحفہ لے کر آیا ہوں جو کسی قبیلہ کا فرد اپنے قبیلے کے لئے لا سکتا ہے۔ میں تمہیں فرزندِ رسول حسینؑ ابنِ علیؑ کی نصرت کرنے کی دعوت دینے آیا ہوں۔ حسینؑ اس وقت ایک مختصر لیکن ایسے مومنین کے گروہ کے درمیان ہیں کہ جس کا ہر فرد ہزار افراد سے بہتر ہے، یہ وہ مومنین ہیں جو ہرگز ہرگز امامؑ کو تنہا اور دشمن کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے۔ عمر سعد نے حسینؑ کا محاصرہ کیا ہوا ہے۔ تم لوگ میرے قبیلے کے آدمی ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم میری دعوت قبول کرتے ہوئے امامؑ کی نصرت کے لئے نکل کھڑے ہو گے۔ اگر تم ان کی نصرت کے لئے نکلے تو دنیا و آخرت کی نیکی اور سعادت سے ہمکنار ہو گے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ امامؑ کی نصرت میں جو قتل ہو گا وہ نواسۂ رسولؐ کے ساتھ خلدِ بریں میں پیغمبرؐ کا ہمسایہ ہو گا۔"

جیسے ہی حبیب ابن مظاہر کا خطبہ ختم ہوا عبداللہ ابن بشر نامی شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا کہ:

"سب سے پہلا شخص میں ہوں جو اس دعوت کو قبول کرتا ہوں۔ میری قوم جانتی ہے کہ میں ایک دلیر اور شجاع شخص ہوں اور ایک سوئے ہوئے شیر کی مانند ہوں۔ یاد رکھو! جب بھی کوئی قوم جہاد سے پیچھے ہٹتی ہے تو دشمن اسے آ کر گھیر لیتا ہے۔"

اس کے بعد قبیلۂ بنی اسد کے لوگوں نے یکے بعد دیگرے حبیب کی دعوت کو قبول کیا اور اس

طرح نوے (۹۰) افراد امامؑ کی نصرت کے لئے خیامِ امام حسینؑ کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن اسی وقت اسی قبیلہ کے کسی شخص نے عمر سعد کو اس بات کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ اس نے ارزق نامی شخص کی قیادت میں چار سو سواروں کو قبیلۂ بنی اسد کی طرف روانہ کیا۔ نہرِ فرات کے کنارے پر دونوں کا تصادم ہوا۔ حبیب ابن مظاہر نے ارزق کو للکارا اور کہا کہ "ہمارے راستے سے ہٹ جا اور یہاں سے چلا جا اور اپنی جگہ کسی اور کو مقابلے کے لئے بھیج۔"

لیکن اسی عرصے میں قبیلۂ بنی اسد کے لوگ عمر سعد کے لشکر سے خوفزدہ ہو کر اپنے قبیلے کی طرف واپس چلے گئے اور حبیب ابنِ مظاہر اپنی ناکامی پر افسوس کرتے ہوئے مایوسی کے ساتھ امامؑ کی خدمت میں واپس پلٹ آئے۔

کربلا میں عمر ابن سعد کا وارد ہونا

عمر ابن سعد ۳ یا ۴ محرم الحرام ۶۱ھ کو اپنی کمان میں چار ہزار افراد کا لشکر لے کر کربلا میں وارد ہوا۔ عمر ابنِ سعد اس چار ہزار کے لشکر کے علاوہ بعد میں پہنچنے والے تمام لشکروں کا بھی کمانڈر تھا۔ اس کے حسب نسب کے بارے میں جاننے کے لئے پہلے اس کے باپ سعد بن وقاص کی زندگی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اور یہ جاننے کے لئے کہ عمر سعد کو کن خصوصیات کی وجہ سے کربلا کے خونی سانحہ کو وجود میں لانے کے لئے عبیداللہ ابن زیاد نے منتخب کیا عمر سعد کی نفسیات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

پیغمبر اکرمؐ اور امیر المومنین حضرت علیؑ نے جب کربلا کے دلدوز سانحہ کی اپنی حیاتِ مبارکہ میں پیشین گوئی فرمائی اور بتایا کہ اس خونی المیہ کو وجود میں لانے والا شخص عمر ابن سعد ہو گا تو اس کے باپ سعد ابن وقاص نے اسی وقت عمر سعد کو اپنی وراثت سے عاق کر دیا تھا۔ اس شخص کی ذہنیت شروع ہی سے ہمیشہ یہ رہی کہ یہ مقام و منصب کے حصول کے لئے پست سے پست تر کام کرنے اور حکمرانوں کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل و حقیر انسان کی حیثیت سے پیش کرنے میں بھی

عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی باطنی خباثت کا اظہار کرنے اور ہر جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے اپنی آمادگی دکھانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ حکمرانوں کی رضا اور خوشنودی کے لئے اگر اس کو کسی نیک کام سے بھی دستبردار ہونا پڑتا تو یہ اس سے بھی فوری ہاتھ اٹھالیتا تھا تاکہ جرائم پیشہ حکمرانوں کو یہ یقین ہوجائے کہ یہ شخص ہر نیک خصلت سے عاری ہے اور ہر قبیح فعل کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اس کا باپ سعد بن وقاص وہ شخص تھا جو حضرتؑ پر سب وشتم کرنے کی منحوس اور قبیح فعل پر معاویہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس کی مجلس چھوڑ کر نکل آیا اور کسی قسم کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن اس کا یہ ناخلف بیٹا عمر سعد وہ شخص ہے جس نے کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کی شکایت یزید سے کی کہ اس نے حضرت مسلم بن عقیل کی کوفہ میں سرگرمیوں کے خلاف کوتاہی، سستی اور نااہلی کا ثبوت دیا ہے۔

حضرت مسلم بن عقیل کو گرفتار کرکے جب دارالامارہ لایا گیا اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے عمر سعد کو قریشی ہونے کے ناتے اور اس سے صلہ رحمی کا پاس رکھنے کی امید میں اس کو وصیت کرنا چاہی تو اس نے ان کی سننے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ جب تک والی کوفہ عبیداللہ ابن زیاد مجھے اجازت نہ دے میں وصیت سننے کے لئے تیار نہیں۔ جب عبیداللہ ابن زیاد نے اس کو حضرت مسلم کی وصیت سننے کی اجازت دی تو اس نے وصیت سننے کے بعد ان کی وصیت کو ابن زیاد کے سامنے فاش کردیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص تملق، چاپلوسی اور خوشامدی ہونے میں کس قدر آگے بڑھا ہوا تھا۔

عمر سعد کو منتخب کرنے کے اسباب

☆ عمر سعد کی طبیعت میں جاہ ومنصب اور اقتدار کی ہوس اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اقتدار کے حصول کے لئے تمام اقدار اور ہر ارزش کی پائمالی کو ہیچ سمجھتا تھا۔ عبیداللہ ابن زیاد اس کی جاہ پسندی اور اس کے ہوس اقتدار کی فطرت کو خوب سمجھتا تھا۔ ابن زیاد یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عمر سعد اور شمر ذی الجوشن جیسے لعین افراد ہی اس کے لے کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں جو اقتدار کے حصول کے لئے ہر جرم کا ارتکاب کرسکتے ہیں۔

☆ عمر سعد اس سعد بن وقاص کا بیٹا تھا جو اہلِ سنت کے بقول عشرۂ مبشرہ میں ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ خلافتِ سوم کے انتخاب کے موقع پر حضرت عمر کے تجویز کردہ خلافت کے چھ امیدواروں میں سے ایک امیدوار تھا۔ وہ فاتح عراق تھا اور فاتح عراق ہونے کے لحاظ سے اہلِ عراق کے نزدیک اس کا ایک نام اور مقام تھا۔ عمر سعد اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود اپنے باپ کے نام اور شہرت کی وجہ سے لوگوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھا اور اس کے باپ کی خوبیوں کی وجہ سے اسے قدرے اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لہٰذا عبیداللہ ابن زیاد قتل حسینؑ جیسے بھیانک جرم کی سنگینی کو کم کرنے کے لئے اپنے ساتھ ایک ایسے شریک کار کو چاہتا تھا جو خود نہ سہی کم از کم اپنے باپ کے نام اور شہرت کی وجہ سے جانی پہچانی شخصیت ہو۔

☆ قتل حسینؑ جیسے سنگین جرم کی ذمہ داری عبیداللہ ابن زیاد تنہا اپنے کندھوں پر نہیں اٹھانا چاہتا تھا اور اس جرم کے ارتکاب کے لئے ایک شریکِ جرم کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ڈرتا تھا کہ کبھی ایسی نوبت آجائے کہ اس سے اس خونِ ناحق کا انتقام لینے والا پیدا ہوجائے تو تنہا صرف وہ ہی مجرم قرار نہ پائے اس لئے وہ اس جرم کے لئے ایک شریکِ کار چاہتا تھا۔

چنانچہ اس کام کے لئے جب اس نے کوفہ کی آبادی پر نظر دوڑائی تو اس کی نظرِ انتخاب عمر سعد پر پڑی۔ لہٰذا اس نے عمر سعد کو دارالامارہ میں طلب کیا اور اس جرم کے ارتکاب کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے کہا۔ عمر سعد اگرچہ جاہ ومنصب کے لالچ میں بڑے سے بڑا جرم کرنے کے لئے آمادہ رہتا تھا لیکن فرزندِ رسولؐ اور دلبندِ فاطمہؑ کو قتل کرنے کا جرم اتنا سنگین تھا کہ عمر سعد جیسا شقی بھی ایک مرتبہ ہل کر رہ گیا اور پس وپیش کے بعد کہا کہ "بہتر ہوتا کہ میرے بجائے یہ ذمہ داری آپ کسی اور کو سونپ دیں۔" عبیداللہ ابن زیاد اس منحوس تجویز کو اس کے سامنے رکھنے کے بعد

بڑے غور سے اس کی حرکات وسکنات اور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ابن زیاد اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا تھا' اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ عمر سعد کی پس وپیش اسی وقت تک ہے جب تک اس سے اس کے منصب کو چھیننے کی دھمکی نہ دی جائے ۔منصب کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ اپنی اس پس وپیش میں مستقل مزاجی نہ دکھا سکے گا۔چنانچہ اس نے عمر سعد سے کہا کہ......

''میں نے تم سے اس سلسلے میں مشورہ طلب نہیں کیا تھا کہ تم مجھے کسی اور کو ذمہ داری سپرد کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔مجھے ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں تمہارا قطعی فیصلہ چاہئے کہ آیا تم اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟''

اس پر عمر سعد نے ابن زیاد سے سوچنے کے لئے کچھ وقت اور مہلت طلب کی اور گھر واپس آکر پہلے تو اپنے اہلِ خانہ اور عزیز واقارب سے مشورہ کیا۔چنانچہ کچھ نے اسے اس سیاہ جرم سے اپنا دامن بچانے کا مشورہ دیا جب کہ بعض نے آئے ہوئے اقتدار کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کا مشورہ دیا۔ان لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد تنہائی میں غور وفکر میں ڈوب گیا۔ایک طرف اس کا نفس کہتا تھا کہ.......

''یہ موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔یہ کرسی اقتدار تیری تمام عمر کی آرزوؤں کا ثمر ہے ۔ابن زیاد کی پیش کش کو مت ٹھکرا اور اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

دوسری طرف اس کا ضمیر اس سے کہتا تھا کہ.......

''اپنے ہاتھوں کو حسینؑ کے خون سے مت رنگ ورنہ تیری آخرت برباد ہوجائے گی' شقاوت ابدی مقدر بن جائے گا اور جہنم ہمیشہ کے لئے تیرٹھکانہ ہوگا۔''

اس کشمکش اور کافی غور وخوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال عبیداللہ ابنِ زیاد کی پیش کش کو قبول کرلیا جائے اور بعد میں کوئی ایسی درمیانی راہ نکالی جائے کہ منصب بھی ہاتھ سے نہ جائے اور خونِ حسینؑ سے ہاتھ بھی نہ رنگیں ۔اس فیصلہ پر پہنچنے کے بعد وہ عبیداللہ ابن زیاد کے پاس گیا اور

رسمی طور پر عہدہ سنبھال کر کربلا روانہ ہوا اور تیسری یا چوتھی محرم ۶۱ھ کو کربلا پہنچا۔

عبیداللہ ابن زیاد کا امامؑ کے نام خط

کربلا پہنچنے کے بعد امام حسینؑ کو عبیداللہ ابن زیاد کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ۔

''مجھے خبر ملی ہے کہ آپؑ کربلا پہنچے ہیں ۔امیر یزید نے مجھے خط لکھا ہے کہ میں اس وقت تک نہ نرم فرش پر سوؤں گا اور نہ جی بھر کر شراب پیوؤں گا جب تک حسینؑ کو خدائے لطیف وخبیر سے نہ ملادوں (یعنی جب تک انہیں قتل نہ کردوں)یا جب تک حسینؑ میری اور میرے والی کی اطاعت تسلیم نہ کرلیں۔''

امامؑ نے یہ خط پڑھ کر حقارت سے اسے زمین پر پھینک دیا اور فرمایا کہ۔''وہ قوم کبھی نجات نہیں پائے گی جو خالق کی رضا پر مخلوق کی رضا کو ترجیح دیتی ہے۔''(حیاتِ امام حسینؑ باقر قرشی ۔ج ۳۔ص ۲۰۱نقل از تاریخ ابن عساکر۔ج ۱۳۔ص ۷۷' مقتل الحسین تالیف از محمد تقی بحرالعلوم ۔ص ۲۶۵' مقتل خوارزمی' مقتلِ عوالم' لواعج الاشجان از سید محسن الامینؒ)

صلح کی کوشش

تاریخ' سیرت اور مقاتل کی کتابوں میں لکھا ہے کہ عمر سعد کے کربلا پہنچنے کے بعد ۷محرم تک کبھی عمر سعد کی خواہش پر اور کبھی امام حسینؑ کی دعوت پر صلح کے لئے مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا ۔امام حسینؑ کی طرف سے صلح کی کوشش کی منطق یہ تھی کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہاں پہنچنے تک عمر سعد کے لشکر کی کربلا آمد اور آپؑ کے محاصرے میں گھر جانے کے بعد کسی کامیابی کے حصول کے تمام امکانات اور احتمالات ختم ہوگئے تھے اس لئے آپؑ نے اسلام اور مسلمین کا مفاد اسی میں دیکھا کہ فی الحال تمام تر کوشش یہ کی جائے کہ کسی جنگی تصادم سے بچتے ہوئے خود کو اس محاصرے سے نکالا جائے اور پھر بعد میں نئے سرے سے کوئی لائحہ عمر تیار کیا جائے ۔اس مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپؑ نے عمر سعد کو مذاکرات کی میز پر آنے کی دعوت دی۔

جہاں تک عمر سعد کا تعلق ہے کہ وہ تو جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے' چاہتا ہی یہ تھا کہ کوئی ایسی درمیانی راہ نکل آئے کہ منصب بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکلے اور خونِ حسینؑ میں بھی اسے اپنے ہاتھ رنگنے نہ پڑیں۔لہٰذا کربلا پہنچتے ہی اس نے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کی غرض سے اپنے لشکر کی کچھ ممتاز شخصیات کو امام حسینؑ سے بازپُرس کے لئے مامور کیا۔کچھ لوگوں نے عمر سعد کے اس حکم کی تعمیل کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ہمیں شرم دامن گیر ہے اور ہم حسینؑ سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ کیونکہ ہم ہی ان کو یہاں بلانے والے ہیں۔لیکن اس کے لشکر میں سے ایسے شقی افراد بھی باہر نکل کر سامنے آئے جنہوں نے اس ذمہ داری کو انجام دیا۔

بہر حال مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا اور عمر سعد کی طرف سے وہ خود' اس کا بیٹا اور اس کا غلام تین افراد مذاکرات کے لئے نکلے۔دہر امام حسینؑ کی طرف سے خود امامؑ' قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ مذاکرات میں شریک ہوئے۔مذاکرات کی ان چند نشستوں سے پہلی نشست کا ایجنڈ امام حسینؑ کی طرف سے تھا اور وہ یہ کہ آپ نے عمر سعد کو دعوت دی کہ۔

''عمر سعد! ان کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

امامؑ کی اس دعوت کے جواب میں عمر سعد نے کہا:

''کوفہ میں میرا گھر ہے' وہ برباد ہو جائے گا۔''

امامؑ نے فرمایا:

''اس کے بدلے میں تمہیں گھر دوں گا۔''

اس نے کہا:

میری جائیداد ضبط ہو جائے گی۔''

امامؑ نے فرمایا:

''اس کا بدلہ بھی میں تمہیں دے دوں گا۔''

پھر اس نے کہا:

''میرے بال بچے کوفہ میں ہیں ان کی جان کے لئے خطرہ ہے۔''

اس پر امامؑ نے کچھ دیر خاموشی اختیار فرمائی اور پھر ناراضگی کے عالم میں کہا کہ.........

عمر سعد! تمہیں رے کی گندم کھانا نصیب نہیں ہوگا۔''

اس پر عمر سعد نے کہا کہ........

میں جو پر اکتفا کروں گا۔''

اس کے ساتھ ہی مذاکرات کی یہ نشست برخواست ہوگئی۔

اس کے بعد مذاکرات کی چند نشستیں اور ہوئیں جن کی رپورٹ عمر سعد نے عبیداللہ ابن زیاد کو روانہ کی۔اپنی اس رپورٹ میں اس نے اپنی طرف سے کچھ تحریف اور اضافہ بھی کیا تا کہ قتلِ حسینؑ کے بھیانک جرم سے بچنے کی کوئی درمیانی راہ نکل آئے۔اس کی یہ رپورٹ تین نکات پر مشتمل تھی
۔

اس نے لکھا کہ امام حسینؑ سے یہ طے پایا ہے کہ.........

☆ وہ کوفہ میں داخل نہیں ہوں گے' جنگ نہیں کریں گے اور واپس لوٹ جائیں گے۔

☆ حسینؑ اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ وہ یہاں سے کسی دوسرے علاقے میں چلے جائیں گے' وہاں سکونت اختیار کریں گے' بنی امیہ کی حکومت کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کریں گے اور رعایا کے ایک عام فرد کی حیثیت سے خاموش زندگی گزاریں گے۔

☆ حسینؑ اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ سیدھے یزید کے پاس جائیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

عمر سعد کی رپورٹ کی دوسری اور تیسری شق اس کی خود اپنی اختراع تھی اور امام حسینؑ جیسی شخصیت کبھی ان دونوں شرائط کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسری شق تو امامؑ کے لئے اس لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ شق نہ صرف اصل تصورِ امامت کے خلاف ہے بلکہ بہت سی روایات اور قرآنی آیات کے بھی منافی ہے جن میں ظالمین کے ظلم پر سکوت اختیار کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔

اسی طرح تیسری شق عمر سعد نے اپنی طرف سے اضافہ کر کے لکھی تھی اور اس کا ثبوت امام حسینؑ کے وہ کلمات اور آپؑ کے وہ خطبات ہیں جن میں آپؑ نے یہ فرمایا کہ.......

"ظالم کے ہاتھ پر بیعت کی ذلت اٹھانا ان ہستیوں کے لئے کسی صورت گوارا نہیں ہو سکتا جنہوں نے پاک و پاکیزہ رحموں اور طاہر و مطہر صلبوں میں پرورش پائی ہو۔"

اس کے علاوہ شمرِ لعین نے عمر سعد کی امام حسینؑ سے صلح کی تمام تجویزوں کو جب ابن زیاد سے مسترد کروا دیا تو عمر سعد نے شمر سے کہا کہ.......

"حسینؑ کی رگوں میں علیؑ کا خون ہے وہ ہرگز یزید کی بیعت نہیں کریں گے۔"

عمر سعد کا یہ جملہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ امامؑ ہرگز اس شق پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ وہ یزید کی بیعت کر لیں گے۔

البتہ عمر سعد کی رپورٹ کی یہ شق کہ "حسینؑ کوفے میں داخل نہیں ہوں گے' جنگ نہیں کریں گے اور واپس لوٹ جائیں گے۔" اپنی جگہ صحیح ہے اور اس کی تائید و توثیق زہیر ابن قین' بریر ہمدانی' حبیب ابن مظاہر اور خود امامؑ کے ان خطبات سے ہوتی ہے جو انہوں نے صبح عاشورا سے عصرِ عاشورا تک دیئے اور لشکرِ عمر سعد کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

"اگر ہماری آمد سے تم لوگ خوش نہیں تو ہم یہاں سے واپس جانے کو تیار ہیں۔"

امام حسینؑ کا تصادم سے گریز اور واپس لوٹ جانے پر آمادگی کا اظہار امیر المومنین حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کی سیرتِ طیبہ کے عین مطابق ہے کہ انصار و اعوان کی ضروری تعداد اگر میسر نہ ہو تو جنگ اور تصادم سے گریز کرنا چاہئے۔

ہو سکتا ہے کہ عمر سعد نے اپنی رپوٹ میں یہ تحریف اور اضافہ خونِ حسینؑ کے جرم سے اپنا دامن بچانے اور مسئلہ کے حل کے لئے ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض سے کیا ہو تا کہ اپنے اقتدار سے محروم ہونے سے بھی وہ بچ جائے۔

صلح کو ناکام بنانے میں شمر کا کردار

قریب تھا کہ عبیداللہ ابن زیاد اس رپورٹ کی روشنی میں عمر سعد کی پیش کردہ تجویز سے اتفاق کر لیتا اور عمر سعد اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا لیکن شمرِ لعین آڑے آیا اور اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر عبیداللہ ابن زیاد کے سامنے ان مذاکرات کے نتائج پر کھلی تنقید کی اور کہا کہ "ہاتھ میں آئے ہوئے شکار کو چھوڑ دینا حماقت ہے۔"

شمر کون تھا؟

عمر سعد کی آرزوں پر پانی پھیرنے والے شمر کا کربلا کے خونی المیہ میں کردار بیان کرنے سے پہلے ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ یہ شمر کون تھا؟

اس کا اصل نام شرجیل اور کنیت ابو سابغہ ہے۔ یہ بنی کلاب سے تعلق رکھتا تھا اور قبیلہ ہوازن کے رؤسا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ "دائرۃ المعارف فرید"، "مستدرک سفینہ"، "فرہنگِ معین" وغیرہ میں لکھا ہے کہ یہ شخص مبروص تھا' نہایت بدصورت اور بدسیرت شخص تھا۔ کوفہ میں اس کو بہادر اور جنگجو سمجھا جاتا تھا۔ اس کا باپ ذی الجوشن بھی بہادر اور جنگجو شخص تھا۔ اس کی جنگجوئی اور بہادری ہی کی بنا پر فارس کے بادشاہ نے اس کو ایک سپر اعزاز میں دی تھی جس کی وجہ سے اسے ذی الجوشن (یعنی صاحبِ سپر) کہا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ذی الجوشن کی بیوی (یعنی شمر کی ماں) اپنے گھر سے بنی کندہ کی طرف نکلی' راستے میں اس کو پیاس لگی تو ایک چرواہے سے اس نے پانی مانگا۔ چرواہا اس شرط پر اسے پانی پلانے پر آمادہ ہوا کہ وہ اس کی جنسی خواہش کو پورا کرے۔ ذی الجوشن کی بیوی نے پیاس پر غلبہ نہ پا کر خود کو اس

کے حوالے کردیا۔ اس چرواہے کے فعلِ حرام کے نتیجے میں اس کے نطفے سے شمرِ لعین کا حمل اس کے رحم میں قرار پایا۔ عاشورا کے دن امام حسین علیہ السلام اور زہیر ابن قین نے اسے مخاطب کرکے فرمایا کہ۔

"اے اس جانور کے بیٹے جو اپنے پیچھے کی جانب پیشاب کرتا ہے (یعنی چرواہے کی اولاد)! تو اس قابل نہیں کہ تجھ سے بات کی جائے تو جہنم میں جلنے کا زیادہ سزاوار ہے۔"

شمر جنگِ صفین میں حضرت علیؑ کے لشکر میں شامل تھا۔ اس جنگ میں اس نے بہادری بھی دکھائی اور کارنامے بھی انجام دیئے۔ جنگِ صفین کے بعد وہ حضرت علیؑ سے منحرف ہوگیا۔ حجر ابن عدی جیسے صحابی جلیل کے خلاف ان کے مفسد ہونے کی جن لوگوں نے گواہی دی ان میں شمر ابن ذی الجوشن بھی شامل تھا' اس طرح حجر ابن عدی کا پاک اور طیب خون بہانے میں اس کا بھی ہاتھ تھا ۔کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل نے جب عبیداللہ ابن زیاد کا دارالامارہ میں محاصرہ کیا تو دارالامارہ کے اندر حضرت مسلم اور ان کی حسینی تحریک کے خلاف مہم چلانے والوں میں یہ پیش پیش تھا۔

کربلا میں عمر ابن سعد اور امام حسینؑ کے درمیان مذاکرات کے بعد جب عمر سعد نے اپنی رپورٹ اور صلح کی تجویز ابن زیاد کو بھیجی تو وہ اس کی تجویز پر عمل کرنے کے لئے تقریباً آمادہ ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں جنگ کے شعلے سرد پڑنے کے قریب تھے کہ شمر لعین نے اس کی تجویز پر تنقید کرتے ہوئے اپنی ابلیسی پھونکوں سے جنگ کے ان شعلوں کو پھر سے بھڑکا دیا اور ابن زیاد کو امام حسینؑ کے خلاف ایک ایسی فیصلہ کن جنگ کرنے کا مشورہ دیا جس کے نتیجہ میں یا تو امامؑ یزید کے سامنے سرِ تسلیم خم کرکے اس کی بیعت پر مجبور ہوجائیں یا آپؑ کا سرِ مقدس تنِ اطہر سے جدا ہو جائے۔ ابن زیاد نے اس معین کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے چار ہزار کا لشکر اس کی کمان میں دے کر عمر سعد کے نام ایک خط دے کر کربلا روانہ کیا جس میں لکھا کہ "یا تو حسینؑ کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرو ورنہ لشکر اور اس کی کمان شمر کے حوالے کردو۔"

شمر ۹ محرم ۶۱ ھ کو کربلا پہنچا اور ابن زیاد کا خط عمر سعد کو دیا۔ عمر سعد نے خط پڑھ کر شمر سے مخاطب ہوکر کہا کہ.......

"خبیث انسان! یہ تو ہی ہے جس نے ابن زیاد کو میری تجویز پر عمل کرنے سے روکا ہے۔ لیکن یاد رکھو! حسینؑ کی رگوں میں علیؑ کا خون ہے وہ کبھی سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے۔"

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا عمر سعد کا یہ جملہ واضح کرتا ہے کہ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ شق اپنی طرف سے اضافہ کرکے ابن زیاد کو روانہ کی تھی کہ "حسینؑ یزید کے پاس خود جاکر بیعت کرنے کو تیار ہیں۔" ورنہ امام حسینؑ کبھی بھی اس شرط کو قبول کرنے پر رضامند نہیں ہوئے۔

غرض شمر کے کربلا پہنچنے کے بعد اور اس کے ابلیسی کارنامے کی وجہ سے صلح کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، صلح و مذاکرات کی کاوشیں دم توڑ گئیں اور نوبت ایک فیصلہ کن جنگ تک آ پہنچی۔ عمر سعد آخر کار کرسیِ اقتدار کے بت کے سامنے اپنی ازلی فطرت کی وجہ سے سجدہ ریز ہوگیا اور اعلان کیا کہ.......

"عبیداللہ ابن زیاد کے سامنے تم سب گواہ رہنا کہ فرزندِ رسولؐ کو قتل کرنے اور اہلِ بیت پیغمبرؐ کا گھر تباہ و ویران کرنے والا پہلا شخص میں...... عمر ابن سعد بن وقاص ہوں۔"

پانی

خداوندِ عالم نے کائنات کی ہر چیز کی تخلیق پانی سے فرمائی۔ لیکن وہ کون سا پانی تھا یہ ایک الگ اور تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ لیکن ہر ذی حیات کی تخلیق اور اس کی بقاء و دوام کا دارومدار پانی پر ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ۔

"وجعلنا من الماء کل شیء حی"

"ہم نے ہر چیز کو پانی سے حیات دی۔" (سورہ انبیاء۔ آیت ۳۰)

نعماتِ الٰہی میں پانی ایک عظیم نعمت ہے' ہر چیز کی بقاء و دوام میں پانی مرکزی کردار رکھتا ہے۔

ہم اس عظیم نعمت کی فراوانی کی وجہ سے اس کا احساس نہیں رکھتے ۔اس نعمتِ خداوندی کی قدر و قیمت ،افادیت اور اہمیت ان صحرانشینوں اور خانہ بدوشوں سے پوچھنا چاہئے جو اس نعمت کی تلاش میں آئے دن اپنا مسکن بدلتے رہتے ہیں اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہِ روم نے معاویہ کے دورِ خلافت میں اس کو اپنے خط کے ساتھ ایک شیشی بھیجی اور اس سے فرائش کی کہ دنیا کی ہر چیز اس شیشی میں بند کر کے اسے روانہ کرے۔معاویہ اس عجیب و غریب فرمائش پر حیران و پریشان ہوگیا۔آخر کار اس معمہ کے حل کے لئے یکا یک اس کے ذہن میں حلالِ مشکلات علی ابن ابی طالبؑ کے شاگرد حضرت عبداللہ ابن عباس کا نام آیا۔چنانچہ اس نے اس معمہ کو ابن عباس کے سامنے رکھا۔انہوں نے معاویہ کو جواب دیا کہ شیشی میں پانی بھر کر بھیج دو۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ 'پانی میں کیا مزہ ہے؟'' آپ نے فرمایا کہ 'پانی میں لذتِ حیات ہے۔'' چنانچہ روایات میں ہے کہ بہترین عمل کسی کو پانی فراہم کرنا اور پانی پلانا ہے۔اور چونکہ کسی کو پانی پیش کرنا احسان ہے اس لئے روایت میں ہے کہ اگر کوئی پانی پیش کرے تو اسے قبول کرنا چاہئے چاہے ایک ہی گھونٹ اپنے کیوں کہ احسان کو رد کرنا گدھے کی خصوصیات میں سے ہے۔'' قرآنِ کریم میں حاجیوں کو پانی پلانے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

جنگِ صفین میں معاویہ کے لشکر نے جب فرات پر قبضہ کرلیا تو معاویہ نے حضرت علیؑ کے لشکر پر پانی بند کردیا۔امیرالمومنین امام علیؑ نے اپنے لشکر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اگر تم باعزت اور بافضیلت زندگی چاہتے ہو اور پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہو تو پہلے اپنی تلواروں کو دشمن کے خون سے سیراب کرلو۔'' اس طرح آپ نے پانی کے حصول کے لئے جنگ کو ایک بافضیلت جنگ قرار دیا ہے جس سے پانی کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔لیکن جب جناب امیرؑ نے صفین کی جنگ میں فرات پر قبضہ کرلیا اور آپ کے لشکر نے معاویہ کے لشکر پر پانی

بند کرنے کا مشورہ دیا تو آپ نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ......

''خداوند عالم کی یہ نعمت تمام مخلوقات مومن و منافق، مسلم و کافر سب کے لئے مباح ہے اور اس پر بلاتفریق و امتیاز سب کا حق ہے۔''

چنانچہ خداوندِ عالم کی اس عظیم نعمت پر ہر ذی حیات کے مساوی حقوق ہیں۔اگر کوئی شخص کسی کو اس حق سے محروم کرے یا اس سے یہ حق چھینے تو وہ نہ صرف شریعتِ اسلام سے بلکہ دائرۂ انسانیت سے بھی خارج ہے۔چاہے وہ عالم ہو، عارف ہو، زاہد ہو یا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا مالک حتی خلیفہ مسلمین کا لقب رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو۔

پانی اور کربلا

چنانچہ بنی امیہ، عبیداللہ ابن زیاد، عمر سعد اور اس کے لشکر کی شقاوتِ قلبی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کافر نہیں، مشرک نہیں، منافق نہیں، عام انسان نہیں بلکہ اس ''حسینؑ'' پر پانی بند کیا جو جگر گوشہ بتولؑ اور فرزند رسولؐ ہے۔وہ حسینؑ کہ جس کی عظمت اور جس کی مادرِ گرامی کی عظمت کے اصحابِ رسولؐ ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی قائل تھے جو ان کو اور ان کے اصحابِ باوفا کو قتل کرنے کے لئے کربلا میں اکٹھا ہوئے تھے۔

فرزندِ پیغمبرؐ اور ان کے اہل بیتؑ اور اعوان و انصار پر پانی بند کرنا تاریخِ انسانیت میں بنی امیہ کا ایسا گھناؤنا جرم ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے اور اس سے جتنی نفرت اور بیزاری کی جائے کم ہے۔چنانچہ ائمہ اطہارؑ نے ''حسینؑ'' کی حقانیت اور مظلومیت کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے شیعوں کو تاکید فرمائی کہ جب بھی پانی پیو تو ''حسینؑ'' کی پیاس کو یاد رکھنا تاکہ جہاں عالم مظلومیت میں قیام و انقلاب حسینؑ کی یاد تازہ ہوجائے وہاں ساتھ ساتھ بنی امیہ کے اس مکروہ عمل سے نفرت و بیزاری کا بھی کھل کر اظہار ہوتا کہ آئندہ آنے والی نسلیں پانی جیسی نعمت سے بنی نوعِ انسان کو محروم کرنے کے گھناؤنے جرم سے اپنے دامن کو بچا ئیں۔

امام حسینؑ اور آپؑ کے اہل بیتؑ اور انصار واعوان پر یزیدی لشکر کے پانی بند کرنے کے جرم کو تمام تاریخ اور مقاتل نے ذکر کیا ہے اور معتبر اسناد سے نقل کیا ہے۔ کسی کو بھی اس سے انکار نہیں اگرچہ واقعہ کی کمیت وکیفیت اور پانی بند کرنے کی تاریخ کے آغاز میں اختلاف ہے۔ تاریخ ومقاتل کے اس اختلاف کو زندہ بھی رہنا چاہئے تا کہ اس پر بحث وتحقیق کا دروازہ کھلا رہے۔ تاریخ ومقاتل کے ان اختلافات کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر حل کرنا چاہئے۔

کربلا میں پانی کے مسئلہ کو افراط وتفریط اور غلو کی نذر کرنے کی بجائے اس مسئلہ پر تاریخ ومقاتل کے اختلافات کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر حل کرنا چاہئے اس لئے ضروری ہے کہ واقعات کی تحلیل وتفسیر کو اَن پڑھ عوام کے تسلط سے نکال کر دانشور، مفکرین، مفسرین اور علماء کے حوالے کیا جائے تا کہ دیگر اجتماعی، سیاسی، سائنسی، اخلاقی، عقیدتی اور فقہی مسائل کی طرح تحلیل وتحقیق کے بعد حقیقت تک پہنچا جا سکے واقعہ کربلا اور امام حسینؑ کا قیام مقدس اپنی گیرائی اور گہرائی کے لحاظ سے ایک ہمہ گیر مسئلہ ہے اور دین کی بقا کا ضامن ہے۔ اس کے مسائل کو ان پڑھ عوام یا ان نام نہاد دانشوروں کے حوالہ کرنا خطرے سے خالی نہیں جو عوامی مرجعیت کے مقلد اور معتقد ہیں، جن میں فاسق، ہمارے مخلص مومنین اور عاشقانِ امام حسینؑ اپنی سادگی اور کم علمی کی وجہ سے ان مفاد پرستوں کے جال میں آجاتے ہیں اور ان کے باطنی عزائم تک پہنچنے سے عاجز اور قاصر ہیں۔ علمی، فقہی، تاریخی اور عقیدتی مسائل کو ان دنیا پرست اور زر پرست خودساختہ دانشوروں کے رحم وکرم پر چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ یہ اپنے مخصوص عزائم رکھتے ہیں۔

یومِ غدیر کہ جس دن پیغمبر اکرمؐ نے عالم انسانیت کی فلاح ونجات اور اس کے بقاء ودوام کے لئے ایک لائحہ عمل دیا تھا، آئندہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لئے ان کے ہاتھوں میں ایک روشن مشعل یہ کہہ کر دی تھی کہ "دیکھو! جس طرح میری قیادت تمہاری فلاح وبہبود کی ضامن ہے اسی طرح میرے بعد اس "علیؑ" کی قیادت تمہیں کامرانی وکامیابی کے ساحلوں سے ہمکنار کرے

گی۔

"من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ"

لیکن پیغمبرؐ کی اس روشن مشعل کو اہل سقیفہ نے تو پس پشت ڈالا ہی لیکن آج ہمارے یہ کم علم لوگ بھی علیؑ کی شان میں ترنم سے قصائد پڑھنے میں مگن ہیں اور غدیر میں پیغمبرؐ کی چھوڑی ہوئی مشعل کو پھر سے روشن کرنے کی بجائے اصل روحِ غدیر کو شعر وشاعری اور فنِ سخنوری کے لئے تختہ مشق بنائے ہوئے ہیں۔ آج روحِ غدیر کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے یا قصائد اور ان کے ترنم کی افیون میں قوم کو سلا دینے کی؟ یہی وجہ ہے کہ کسی نے یومِ غدیر پر معصومؑ کو مبارکباد پیش کی تو معصومؑ نے فرمایا کہ۔

"کیا عاشورا کی بعد بھی ہمارے لئے کوئی عید رہ گئی ہے۔"

آج "وارثِ غدیر (عج)" ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ نہیں معلوم زہراءؑ کا یہ دلبند کن بیابانوں میں ہمارے حال پر نوحہ کناں ہے؟

یہ مفاد پرست وہی لوگ تو ہیں کہ جنہوں نے فدک کے غصب کئے جانے ہی کو زہراء مرضیہ سلام اللہ علیہا کی مظلومیت کا محور بنا کر معصومؑ کے اصل ہدف یعنی غصبِ خلافت کے خلاان کے احتجاج کو پس پشت ڈال دیا۔ ورنہ مطالبہ 'فدک' تو اہل سقیفہ کی اس سازش کو بے نقاب کرنے کا ایک بہانہ اور وسیلہ تھا جو انہوں نے پیغمبرؐ کی وصیت کی صریحی خلاف ورزی کرتے ہوئے خلافت کا رخ اس کے صحیح مرکز سے موڑ کر نااہل قیادت کی طرف کر کے امتِ مسلمہ کو ایسے مصائب سے دوچار کر دیا جس کا خمیازہ آج تک امت بھگت رہی ہے۔ اہل سقیفہ کا ابوالحسنؑ سے منہ موڑ کر غلط اور نااہل ہاتھوں میں قیادت دینا کل ایک سازش تھی اور زہراء مرضیہؑ کی اصل مصیبت کو درک نہ کرنا اور غصبِ فدک ہی کو ان کی مصیبت کا اصل مرکز ومحور بنانا بھی آج ایک سازش ہے جس کا شکار ہمارے سادہ لوح عوام بن رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح یزید اور بنی امیہ

کے تمام جرائم کو پس پشت ڈال کر پانی ہی کے مسئلہ کو مرکز محور بنانا اور اس میں افراط وتفریط سے کام لینا ان کے جرائم پر پردہ ڈالنا ایک اور سازش ہے۔

امام حسینؑ کی اصل مصیبت بھوک و پیاس نہیں بلکہ اسلام کی قیادت کا فاسد ہاتھوں میں جانا اور خلافت کو موروثی بنانا ہے۔ پانی کی قلت یا تین دن تک اہل بیتؑ اور انصار حسینؑ کی مسلسل تشنگی سے حسینؑ اگر آپؑ کو اور آپؑ کے انصار واعوان کو وافر مقدار میں پانی فراہم کر دیتے تب بھی ان کے جرم وجنایت پر کوئی پردہ نہیں پڑ سکتا۔ اگر وہ پوری نہر فرات کو بھی آپ کے حوالے کر دیتے تب بھی امامؑ اپنے قیام وانقلاب اور مبارزے سے دستبردار نہیں ہوتے۔

کربلا میں پانی کی موجودگی یا عدم موجودگی یا کمیابی کے سلسلے میں ہم یہاں ایک تاریخی جائزہ پیش کرنا چاہیں گے۔

اس سلسلے میں دو حقیقتیں اپنی جگہ مسلم ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں۔ تاریخ اور مقاتل بھی قدیم دور سے لے کر آج تک ان دونوں حقیقتوں کی تائید کرتے ہیں۔

پہلی حقیقت

پہلی حقیقت یہ کہ امام حسینؑ اور ان کے انصار واعوان پر یزیدی لشکر نے پانی بند کیا۔ چنانچہ۔

☆ پہلے ہی ان سے عبید اللہ ابن زیاد نے اپنے لشکر کے ہراول دستے کے قائد حر ابن یزید ریاحی کو حکم دیا اور خط لکھا کہ۔

”حسینؑ ابن علیؑ کا ایک ایسی جگہ محاصرہ کرو جو بے آب وگیاہ ہو، جہاں نہ سبزہ ہو اور نہ پانی۔“

☆ دوسرا حکم نامہ اس نے عمر سعد کے نام اس وقت روانہ کیا جب اسے سنا کہ امام حسینؑ کے اصحاب مشکوں کے ذریعہ نہر فرات سے باآسانی پانی لے جاتے ہیں۔ یہ حکم نامہ عمر سعد کو ۷ محرم ۶۰ھ کو ملا اور اس میں لکھا تھا کہ۔

”جب میرا یہ خط تمہیں ملے تو حسینؑ سے کہنا کہ وہ ہماری حکومت کو تسلیم کریں ورنہ ان پر فرات

کا پانی بند کر دو۔ بالتحقیق یہ پانی میں یہود و نصاریٰ کے لئے حلال قرار دیتا ہوں اور حسینؑ پر حرام۔“

یہ حکم نامہ ملتے ہی عمر ابن سعد نے چار ہزار کا لشکر عمرو ابن حجاج یا حجاج بن ابجر کی قیادت میں فرات پر متعین کیا اور امام حسینؑ پر پانی بند کیا۔

دوسری حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ صبح عاشورا سے امام حسینؑ کی شہادت تک آپ کے تمام ساتھی، چھوٹے بڑے، جوان بوڑھے، مرد عورتیں سب کے سب تشنگی کے عالم سے گزرے۔ اس روز کی تشنگی کا اندازہ ان خصوصیات سے لگایا جا سکتا ہے جو غور طلب ہیں۔

☆ پانی کا کلی فقدان بذاتِ خود تشنگی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

☆ موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ اس تشنگی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

☆ اس پیاس کے عالم سے اگر چھوٹے چھوٹے بچے خصوصاً طفلِ شیر خوار بھی گزر رہے ہوں تو یہ مصیبت قیامت برپا کر دیتی ہے کیونکہ بوڑھے اور عمر رسیدہ کتنے ہی پیاسے ہوں وہ پھر اپنی پیاس پر صبر کر سکتے ہیں خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچوں کی پیاس دیکھ کر وہ اپنی پیاس بھول جاتے ہیں اور اپنی پیاس کا اظہار نہیں کرتے۔

☆ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ کہ کربلا کے میدان میں بچوں سے زیادہ بڑوں پر تشنگی کا غلبہ تھا کیونکہ بچے پھر خیمہ کے سایوں میں تھے جب کہ بڑوں کو دھوپ کی تپش کا بھی سامنا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے جسم تیر، تلوار اور نیزوں سے زخمی تھے اور زخموں سے خون نکلنے کی وجہ سے ان کی پیاس میں مزید شدت ہو گئی تھی۔ اس عالم میں پیاس کی شدت کا اندازہ وہ لگا سکتے ہیں جنہوں نے قریب سے حسینؑ کے ۲۷۔۲۶ سال جوان فرزند شبیہہ پیغمبرؐ علی اکبرؑ کی پیاس کو دیکھا ہو اور اس عالم میں دیکھا ہو کہ حسینؑ کا یہ جوان رشید زخموں سے چور ہو کر باپ کی خدمت میں پلٹتا ہے اور باپ سے ایک قطرہ آب کا سوال کرتا ہے۔

☆ اس روز کی تشنگی کا اندازہ اگر لگانا ہو تو زین العابدین سید الساجدین امام علی ابن الحسینؑ کے

مسلسل چالیس سالہ احتجاج پر نظر ڈالیں کہ کس طرح ہر ہر موقع پر آپ نے اپنے پدر بزرگوار کی پیاس کو اجاگر کیا اور فرمایا کہ۔

"قتل ابی عطشانا"

بہر حال عبید اللہ ابن زیاد کا امامؑ اور ان کے اصحاب پر پانی بند کرنا اور امامؑ اور ان کے انصار کا پیاس کے عالم میں شہید ہونا دونوں اپنی جگہ مسلمہ حقیقتیں ہیں۔لیکن ان دونوں حقیقتوں کے درمیان کچھ اور بھی حقائق ہیں جو تاریخ میں ہیں اور مقاتل میں نقل ہوئے ہیں اور ان حقائق کو نہ تو یکسر نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ انہیں تاریخ اور مقاتل سے نکالا جا سکتا ہے۔واقعاتِ کربلا تاریخ کی روشنی میں تجزیہ وتحلیل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ امام حسینؑ کا یہ مقدس قیام بقائے دین کی ضمانت ہے اور اسے افراط وتفریط محفوظ رکھنا چاہئے۔

چنانچہ مندرجہ ذیل حقائق بھی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔

☆ ساتویں محرم کو نہر فرات پر دشمن کا لشکر متعین ہونے کے بعد جب اصحاب حسینؑ کے لئے فرات سے پانی حاصل کرنا مشکل ہوگیا اور امام حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ پر تشنگی کی شدت بڑھ گئی تو انہوں نے خیامِ اہل بیتؑ سے قبلہ کی طرف انیس قدم کے فاصلے پر ایک کنواں کھودا اور اس سے میٹھا پانی برآمد ہوا جس سے امام حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ اپنی پانی کی ضروریات پوری کرتے تھے۔البتہ یہ پانی کب تک چلا اور کنواں کب خشک ہوگیا اس کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔(حیاتِ امام حسینؑ باقر قرشی۔ج ۳۔ص ۱۴۰ نقل از مقتل خوارزمی فتوح البلدان، بغیۃ النبلاء، مقتل الحسین بحر العلوم۔ص ۲۷۳ نقل از مقتلِ کوارزمی، مقتل عوالم بحار الانوار۔ج ۴۴۔ص ۳۳۸)

☆ ۷ محرم سے ۱۰ محرم تک تین دن کی درمیانی راتوں میں ایک مرتبہ یا چند مرتبہ حضرت ابو الفضل العباس کی معیت میں تیس جانثاران حسینؑ مشک لے کر نہر علقمہ پر گئے، ان میں سے ایک گروہ نہر پر متعین لشکر سے نبرد آزما ہوا اور دوسرے گروہ نے مشکوں میں پانی بھرا اور یہ سب کے سب پانی

لے کر صحیح وسالم خیموں تک واپس آئے۔اسی وجہ سے حضرت عباسؑ کو سقہ کا لقب ملا کہ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اہل بیتؑ کے لئے پانی لایا کرتے تھے ورنہ عام حالات میں پانی لانا حضرت عباسؑ کے لئے اس لقب کا سبب نہیں بنتا، عاشورا کے دن آپؑ پانی نہ لا سکے یہ بات مسلّم ہے لہٰذا حضرت عباسؑ کو سقہ کا لقب دینا بتاتا ہے کہ آپؑ غیر معمولی حالات میں پانی لائے۔

☆شبِ عاشورا امام حسینؑ اور آپؑ کے چند اصحاب نے غسلِ شہادت کیا۔(حیاتِ امام حسینؑ باقر قرشی۔ج ۳۔ص ۱۷۸ نقل از انساب الاشراف)

☆امام حسین علیہ السلام نے عقیلہ قریش حضرت زینب کبریٰ کو جب آنے والے دنوں کے حالات اور مصیبت سے آگاہ کیا اور اپنی شہادت اور اہل بیتؑ کی اسیری پر صبر کرنے کی تلقین فرمائی تو زینب سلام اللہ علیہا غش ہو کر گر گئیں تو امامؑ نے ان کے چہرے پر پانی چھڑکا۔

☆بعض مقاتل کے مطابق شبِ عاشور حضرت عباسؑ اور بعض کے مطابق حضرت علی اکبرؑ پانی لائے (مقتل بحر العلوم۔ص ۲۸۳، امالی شیخ صدوق)

بحر حال ان تین دنوں میں کنویں کھودنا اور نہر فرات سے پانی لانا تاریخ ومقاتل میں نقل ہوا ہے۔ان حقائق سے انکار کر کے پانی کی یکسر قلت یا تین دن تک امام حسین علیہ السلام اور ان کے اہل بیتؑ کی مسلسل پیاس کا میسر ہونا ثابت ہونے سے بنی امیہ کے جرم وجنایت میں کوئی کمی آجاتی ہے۔امام حسین علیہ السلام اور ان کے انصار بھوک وپیاس کے عالم میں نہیں، سیرابی کے عالم میں بھی اگر شہید ہوئے ہوتے تب بھی ان کی شہادت کی عظمت میں ذرہ بھر کمی نہیں آتی۔

پانی بند کرنے کی وجہ

عمر ابن سعد کے لشکر نے یوں تو امام حسینؑ کا چاروں طرف سے محاصرہ کیا ہوا تھا تا کہ نہ تو باہر سے آپ کو کوئی مدد پہنچ سکے اور نہ ہی آپؑ کا کوئی قاصد خیامِ حسینی سے کوئی پیغام لے کر باہر جا سکے۔پھر بھی دشمن کو یہ خطرہ تھا کہ نہر فرات کی طرف سے کوئی شخص امام حسینؑ سے آکر نہ مل جائے۔چنانچہ

آپ کے کچھ جانثار اسی راستے سے فرات عبور کر کے آپ کے لشکر میں شامل ہوئے۔اس کے علاوہ بھی آپؑ پر اور آپؑ کے اہل بیتؑ اور انصار و اعوان پر پانی بند کرنے کے پیچھے یزیدی لشکر کے کچھ اہم مقاصد تھے۔

☆وہ چاہتے تھے کہ پانی بند کر کے وہ امام حسینؑ اور ان کے لشکر کو اتنا خستہ اور تنگ کردیں کہ ان کی مقابلہ اور مزاحمت کی طاقت ہی ختم ہو جائے اور اگر وہ جنگ لڑیں بھی تو خستگی اور افسردگی کے عالم میں جنگ لڑیں تا کہ ابن زیاد کے لشکر کا نقصان کم ہو۔

☆پانی بند کرنے کا دوسرا مقصد جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ تھا کہ امام حسینؑ تک باہر سے کسی کی مدد پہنچنے اور امامؑ کی طرف سے کسی قاصد اور پیام کے باہر جانے کے راستوں کو روک دیا جائے۔

☆تیسری وجہ یہ تھی کہ ابن زیاد سمجھتا تھا کہ امام حسینؑ کا محاصرہ کرنے اور ان پر پانی بند کرنے کے بعد جنگ کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ بنی امیہ کی حکومت کو تسلیم کرلیں گے۔

☆ابن زیاد سمجھتا تھا کہ پانی بند کرنے کے بعد مردوں سے پہلے چھوٹے بچے چھوٹے بچے پیاس کی سکت نہ لا کر فریاد بلند کریں گے اور بچوں کی فریاد امام حسینؑ کے عزم و ارادے کو پست کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

☆ابن زیاد اس حد تک شقاوت کا مظاہرہ کر کے بنی امیہ اور یزید کی قربت حاصل کرنا چاہتا تھا اور انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے بنی امیہ اور یزید کی خاطر حضرت عثمان کے پیاسا قتل ہونے کا انتقام اولادِ علیؑ سے لے لیا۔

واقعات شب عاشورا

۹ محرم ۶۱ ہجری کو عصر کے بعد امام حسین علیہ السلام کے وفد اور عمر سعد کے درمیان امام حسینؑ کو ایک شب کی مہلت دینے پر اتفاق رائے ہونے کے بعد امامؑ نے نماز مغربین کے بعد انصار اور بنی ہاشم کے تمام مردوں اور جوانوں کو ایک خیمے جمع کیا اور درپیش مسائل مصائب اور مشکلات

پر خداوند متعال کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''اے ربِ جلیل تمام حمد تیری ذات کے لئے کہ تو نے ہمیں نبوت و رسالت سے نوازا' ہمیں قرآن کی تعلیم دی' دین میں ہمیں فقیہ بنایا' چشم و گوش کی بصیرت عطا فرمائی' حقائق کو درک کرنے کے لئے قلبِ سلیم عطا کیا' ان نعمتوں کے لئے تو ہمیں شکر گزاروں میں قرار دے۔

اس کے بعد آپؑ نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:''میں نہیں جانتا کہ میرے نیک سیرت اور باوفا اصحاب جیسے اصحاب کسی اور کو ملے ہوں اور میرے نیک خصلت' ہمدرد' مشفق و مہربان اہل بیتؑ جیسے اہل بیت کسی اور کو ملے ہوں' خداوند عالم تم سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ممکن ہے کہ تمہارے علم میں ہو اور اگر تمہارے علم میں نہیں ہے تو جان لو کہ ہمیں آج ان لوگوں کا سامنا ہے' یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں' میرے علاوہ یہ کسی اور کے در پے نہیں۔میں تم سب کو چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں اور اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں' اس رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ' میرا ہر صحابی میرے اہل بیتؑ میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر اس شب کی تاریکی میں یہاں سے چلا جائے اور مجھے اس قوم سے مقابلہ کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دے۔''

آپؑ نے خاص طور پر فرزندانِ مسلم بن عقیلؑ سے فرمایا کہ:

''تم اپنی قربانی دے چکے ہو' تمہارے لئے کافی ہے اب تم لوگ یہاں سے کسی طرح نکل جاؤ۔''

امام حسین علیہ السلام کے خطبے کے اسرار و رموز

امام حسین علیہ السلام کہ جن کی نشو و نما رسول اکرمؐ کے لعاب دہن اور زہراء مرضیہ سلام اللہ علیہا کے شیر سے ہوئی' جنہوں نے صاحبِ سلونی کے دامن میں تربیت پائی' حسینؑ کہ جو خود آیاتِ قرآن کی مجسم تفسیر و تاویل ہوں ان کے خطبات اور کلمات کی تہہ تک پہنچنا اور ان کے اسرار

درموز کو سمجھنا ہم جیسے انسانوں کی قدرت سے باہر ہے کہ جن کا علم محدود اور مختصر ہو۔ لیکن اپنی کم علمی اور کم مائیگی کو بہانہ بنا کر امامؑ کے کلمات میں غور وفکر کرنے ہی سے دامن بچانا اور اس سے صرف نظر کر لینا جمود ورکود کی علامت ہے۔ قرآن کریم ہمیں بار بار تفکر اور تعقل کا حکم دیتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اور اہل بیت علیہم السلام کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہمیں ان تاسی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ معصومینؑ کی زندگی کے پہلوؤں کی تاسی کرنے کے لئے ان کی سیرت' کردار اور گفتار پر غور وفکر کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور استعداد کے تحت حتی المقدر امامؑ کے کردار اور گفتار کو سمجھنے کی سعی اور جد وجہد کرے۔

ہم جب امامؑ کے اس خطبے پر غور کرتے ہیں تو بہت سے نکات واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔

☆ امامؑ کے اس خطبے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کو ہر صورت میں چاہے کامیابی وکامرانی ہو یا شکست وناکامی' مسرت وخوشی ہو یا غم ومصیبت ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ پیش آمدہ ناگوار اور ناپسندیدہ حالات میں ان گزشتہ نعمتوں اور احسانات کو یاد کرنا چاہئی جن سے خداوند عالم نے اسے نوازا۔ خدا سے یہ شکوہ کرنا کہ اس ل ے غم ومصیبت کے موقع پر ہمیں تنہا چھوڑا ہے کفر کے مترادف ہے۔ یہ پیش آمدہ مصیبت وآلام بھی خدا کی طرف سے آزمائش وامتحان ہے اور رحمت ہے جس طرح گزشتہ آسائشوں کا میسر ہونا ایک نعمت تھا اور باعث رحمت تھا۔

☆ اس خطبے میں امامؑ نے پیش آمدہ مصائب وحوادث پر خداوند رؤف ومہربان کے ان بے کراں الطاف وعنایات کو فراموش نہیں بلکہ ان نعمتوں کا ذکر کیا جن سے خداوند عالم نے آپؑ کے پاکیزہ گھر کو نوازا۔ آپؑ نے فرمایا کہ دنیا کی تمام نعمتیں ان نعمتوں کے مقابلے میں ہیچ اور بے قیمت ہیں جن سے خداوند عالم نے اہل بیتؑ کو نوازا۔ آپؑ نے اس خطبے میں خدا کی جن نعمتوں کو یاد فرمایا ہے وہ نعمت رسالت ونبوت ہے' وہ نعمت' نعمت امامت ہے' علم قرآن اور فہم قرآن کی نعمت ہے' حقائق کے علم اور دین کی آگاہی کی نعمت ہے۔

☆ امامؑ کے اس خطبے سے واضح ہوتا ہے کہ آپؑ اپنے اصحاب وانصار اور اپنے اہل بیتؑ کو کسی بھی مرحلہ پر تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ طول تاریخ میں دنیا کے سیاستدانوں کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ وہ اپنے عوام کو اندھیرا اور غفلت میں رکھتے ہیں' تحریر وتقریر کے سحر سے لوگوں کو مسحور کرتے ہیں' حقائق پر لفاظی کا پردہ ڈالتے ہیں یہاں تک کہ بعض دینی سربراہان بھی اس سے مبرا نہیں اور وہ بھی مصلحتوں کے تحت عوام کو اندھیر میں رکھنا جائز سمجھتے ہیں لیکن امام حسینؑ جیسی شخصیت کہ جن کی زندگی ہی الٰہی اور قرآنی سیاست کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اس سوچ اور طرز فکر کو صالح قیادت اور رہبری کے منافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے انصار واہل بیتؑ کو کبھی اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ جو کچھ اس وقت پیش آمدہ مسائل تھے یا جو حالات آئندہ پیش آنے والے تھے ان سے ان کو آگاہ رکھا تا کہ ہر شخص امام کی اطاعت وقت کی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ اس سے ہٹ کر اپنے جذبہ ایمانی' روشن ضمیری' علم وآگاہی اور اپنے شعور کی بیداری کے ساتھ اپنی راہ آپ متعین کرے۔

☆ امامؑ کے اس خطبے سے جہاں مندرجہ بالا نکات سامنے آتے ہیں وہاں چند سوالات اور اشکالات بھی ذہن میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ امام حسینؑ کے خطبے کا درج ذیل حصہ بڑا عجیب اور متحیر کرنے والا ہے اور ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے۔ آپؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ:

''ہماری زندگی میں بس کل کا دن باقی ہے' دشمن کا لشکر ہمارا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی' یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں' ان کو مجھے قتل کرنے کا موقع مل جائے تو یہ تم سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ اس لئے میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھے اس میدان میں تنہا چھوڑ کر اس رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ۔ میں سب کی قدردانی کرتا ہوں' تم نے اس طویل سفر کی زحمتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں' میرے

لئے تمہارے دلوں میں جو شفقت اور محبت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ مجھے اس پر فخر ہے۔ لیکن اب جب مجھے شہید ہونا ہی ہے تو میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھاتا ہوں کیونکہ اب اس بیعت کا مقصد ہی ختم ہو چکا ہے اس لئے تم سب یہاں سے رات کی تاریکی میں نکل جاؤ اور جاتے جاتے مجھ پر ایک احسان یہ بھی کرتے جاؤ کہ میرے اہل بیتؑ میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر یہاں سے لے جاؤ۔"

امامؑ کا اپنے اصحاب کو واپس چلے جانے کی اجازت دینا ہم جیسے سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے بہت سے شرعی اصول وضوابط سے متصادم نظر آتا ہے، مثلاً:

☆متعدد احادیث میں وارد ہوا ہے کہ جس شخص کی گردن پر امام وقتؑ کی بیعت نہ ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے اور جاہلیت کی موت شرک کی موت ہے۔ اس لحاظ سے امامؑ کا یہ فرمانا کہ "میں تمہاری گردن سے اپنی بیعت اٹھاتا ہوں۔" کے معنی یہ ہوئے کہ معاذاللہ میں تمہیں جاہلیت اور شرک کی موت کے حوالے کرتا ہوں۔ یہ امامؑ کی شان کے بھی خلاف ہے اور آپؑ کے اصحاب کی قدر دانی کے منافی بھی۔ پھر امامؑ کیوں ان کی گردن سے اپنی بیعت اٹھا کر انہیں سعادت سے محروم کر رہے ہیں؟

☆میدان جنگ و جہاد کہ جہاں حق و باطل اور کفر و اسلام کے درمیان مقابلہ ہو اس جہاد سے حق و اسلام کے کسی داعی کا فرار کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔ پھر امامؑ کیوں کر اپنے پاکباز اور پاک طینت اہل بیتؑ اور انصار کو اس گناہِ کبیرہ کی دعوت دے رہے ہیں؟

☆ کسی مسلمان کی جان بچانا اہم ترین واجبات میں سے ہے یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر نماز جیسی اہم عبادت کو بھی توڑ کر کسی مسلمان اور کلمہ گو کی جان بچانا واجب ہے چہ جائیکہ امامِ وقتؑ کی جان بچانا امام حسین علیہ السلام اس وقت لشکرِ اعداء کے محاصرے میں تھے اور یہ یقینی تھا کہ کل دشمن آپؑ کو شہید کر دیں گے جیسا کہ واضح طور پر آپؑ نے فرمایا کہ "یہ سب میرے خون کے

پیاسے ہیں اور ہر صورت میں مجھے قتل کر کے رہیں گے۔" ایسے حالات میں امامؑ کیوں اپنے صالح ترین اصحاب کو ان کے واجب فریضہ سے محروم کر رہے ہیں؟

☆ظالمین اور جابرین سے ایک لمحہ کے لئے بھی تعاون کرنا یا ان کی مدد کرنا صریح آیاتِ قرآنی اور روایات کی رو سے حرام فعل ہے۔ امام علیہ السلام کو لشکرِ عمر سعد کے نرغے میں تنہا چھوڑنا اموی طاغوتی لشکر کے حوصلے بلند کرنے اور ان سے تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ امامؑ اپنے اصحاب کو ان کو تنہا چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دے کر کیوں ظالموں اور جابروں کے حوصلے بلند ہونے کا سبب بن رہے ہیں؟

☆امامؑ نے اپنے قیام و انقلاب کے لئے اپنے وفا اور مخلص ترین اصحاب کو دعوت دی۔ اب اس مشکل ترین مرحلہ پر ایسے حالات میں ان انصار و اعوان اور اہل بیتؑ کا امامؑ کو تنہا چھوڑ کر جانا آپؑ کے موقف کو مشکوک بناتا ہے اور دشمن کو پروپیگنڈہ کرنے کا موقع اور عبیداللہ ابن زیاد اور لشکرِ اموی کو آپ کو قتل کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ دشمن کر سکتا ہے کہ اگر امامؑ کا موقف صحیح ہوتا تو ان کے اصحاب ان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاتے۔ امامؑ کیوں کر ایسا موقع دشمنوں کو فراہم کرنے کا سبب بن سکتے ہیں؟

☆ امام حسین علیہ السلام اپنے قیام و انقلاب کے آغاز سے ہی ایسے مخلص افراد کو اپنے گرد اکھٹا کر رہے تھے جو مستقل مزاج ہوں اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکیں اور ایسے افراد کو اپنی دعوت میں شریک کرنے سے احتراز فرماتے تھے جو استقامت نہ دکھا سکیں۔ چنانچہ آپؑ ہر ہر موقع پر اپنے مستقبل اور آئندہ پیش آنے والے حالات سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ فرماتے رہتے تا کہ آپ کی رکاب میں صرف جانثار، جانفروش اور مخلص ترین افراد آپؑ کے ہمراہ تھے وہ مخلص ترین لوگ تھے جس کا خود آپؑ نے اعتراف فرمایا۔ اس یقین کے باوجود کہ یہ لوگ مخلص ترین لوگ ہیں آپؑ اس موقع پر ان کو آپؑ کو تنہا چھوڑ کر چلے جانے کی کیوں اجازت دے رہے ہیں؟

یہ ہیں وہ اشکالات اور سوالات جو ہم جیسے دینی طالب علم کے ذہن میں امامؑ کے اس خطبے کے مطالعے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور ہوسکتا ہے حقیقت کے متلاشی دوسرے لوگوں کے ذہن میں بھی پیدا ہوتے ہوں۔ اس لئے ان اشکالات پر تحقیق کرنا اور ان پر ایک سیر حاصل بحث کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ذہن میں ان سوالات اور اشکالات کے جو جوابات ہیں وہ ہم قارئین کی خدمت میں اس امید کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ بھی اس سلسلے میں جستجو اور فکر کریں گے۔

پہلا جواب

فقہ اسلامی میں بیعت ایک وسیع باب ہے جس میں بیعت کی انواع و اقسام کا ذکر ہے۔ ان میں سے بیعت کی ایک قسم وہ ہے جو لوگ کسی نبی یا امامؑ سے اس کو اپنا قائد و رہبر تسلیم کرنے کے لئے کرتے ہیں جس کے ذریعے وہ اس کے احکامات اور ہدایات کی تعمیل اور فرمانبرداری کرنے کا عہد و اعلان کرتے ہیں۔ اس بیعت سے روگردانی کرنے اور منہ موڑنے کے معنی ہدایت کی طرف سے منہ موڑ کر ضلالت اور گمراہی کی طرف رخ کرنا ہے۔ ایسا شخص مرنے پر جاہلیت اور شرک کی موت مرتا ہے۔

بیعت کی دوسری قسم وہ بیعت ہے جو کوئی معتقد اپنے قائد و رہبر سے ہنگامی حالات میں کرتا ہے۔ مثلاً جنگ و جہاد کے موقع پر ایک معتقد اپنے قائد و رہبر سے یہ بیعت اور عہد کرتا ہے کہ وہ جنگ و جہاد کے موقع پر اپنے قائد و رہبر کے دشمن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ہمہ وقت تن دمن سے آمادہ ہے۔ یہ بیعت وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے اور دوران جنگ تک محدود ہوتی ہے۔ جنگ کے خاتمے یا جنگ کے معطل ہونے کے بعد اگلے مرحلے کے لئے پھر سے نئی بیعت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

امام حسینؑ نے کربلا میں جس بیعت کو اپنے انصار و اعوان کی گردنوں سے اٹھایا تھا وہ بازیابی خلافت کے لئے جنگ و جہاد کی بیعت تھی۔ اب چونکہ جنگ کا وہ مقصد جیسا کہ خود امامؑ نے تصریح

فرمائی ختم ہو چکا تھا اور اب زندہ بچنے کی کوئی امید ہی باقی نہیں رہی تھی اس لئے آپؑ نے اپنی یہ بیعت ان کی گردنوں سے اٹھالی۔

دوسرا جواب

زندگی الٰہی امانت ہے اور اس کو الٰہی مقصد ہی کے لئے قربان کیا جاسکتا ہے۔ جب مقصد اور ہدف کا حصول ممکن نہ ہو تو اللہ کی اس امانت کا بچانا واجب ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ جس مقصد اور ہدف کے لئے آپؑ اٹھے تھے اس کا حصول اب ممکن نہیں رہا تو آپؑ نے اپنے اصحاب باوفا کی جان کا تحفظ ضروری سمجھا۔ چنانچہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے خلاف غصب کرنے والوں کے خلاف جنگ و جہاد سے ہاتھ اٹھانے کی حکمت اور علت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"میں نے جب اپنے گردونواح میں دیکھا تو مجھے اپنے مخصوص اہل بیتؑ اور چند افراد کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا تو میں نے ان کو موت کے منہ میں دھکیلنے سے بخل کیا۔"

امام حسن علیہ السلام کی معاویہ سے صلح کے موقع پر کچھ لوگوں نے سوال کے طور پر اور کچھ نے آپؑ کو مورد تنقید بنا کر صلح کے اسباب کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا کہ:

"تمہاری جان اور تمہارا خون بچانے کے لئے مجھے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔"

چنانچہ اپنے اہل بیتؑ اور اپنے باوفا انصار واعوان کی جان اور خون کا تحفظ اپنے پدر بزرگوار اور اپنے برادر عزیز کی سیرت سے علیحدہ کوئی سیرت نہیں تھی۔ لہٰذا جب آپؑ نے دیکھا کہ مقصد و ہدف کا حصول ممکن نہیں رہا تو آپؑ نے ان کی جان کے تحفظ کی فکر کی۔

تیسرا جواب

امام حسینؑ دشمن کے ایک کثیر لشکر کے محاصرے میں تھے جس کے مقابل امامؑ کا اپنے لشکر کی تعداد کسی شمار و قطار میں نہیں آتی تھی۔ اپنے لشکر کی تعداد میں اضافہ کی بھی کوئی امید باقی نیں تھی۔

سامانِ جنگ کے وسائل وذرائع کی بھی کوئی آس باقی نہ تھی۔صرف ایک طریقہ تھا کہ امامؑ اپنے لشکر کی معنوی قوت کو بڑھائیں۔کوئی بھی فوج جب جنگ کے لئے میدان میں آتی ہےتو اس کے بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔کبھی اس کی جنگ رضا ورغبت کے تحت ہوسکتی ہےاور کبھی جبر وتشدد کی وجہ سے وہ لڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔رضا ورغبت کے تحت جب کوئی شخص میدان جنگ میں اترتا ہےتو اس کے پیشِ نظر کبھی مالِ غنیمت کی طمع ولالچ ہوسکتی ہےاور کبھی عزت'شہرت اور جاہ ومنصب کا حصول'یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جنگ کسی کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہو چاہے کسی طاغوت کی رضا وخوشنودی مقصود ہو یا رضائے الٰہی مطلوب ہو۔لیکن کسی بھی جنگ کے لئے جو چیز بہرحال ضروری ہے وہ طاقت وقوت کا میسر ہونا ہے۔چاہےافرادی طاقت وقوت ہو یا وسائل و ذرائع کی قوت۔اس کے علاوہ اگر کوئی قوت ہوسکتی ہےتو وہ مقصدیت کی قوت ہے۔امام علیہ السلام کے پاس بس یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنی اس قلیل اور مختصر فوج میں مقصدیت کی قوت کی روح کو پھونک دیں۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب امامؑ کا ہر سپاہی شعور وآگاہی کے ساتھ اپنا پاکیزہ مقصد و ہدف درک کرلے۔اس ادراک کے بعد پھر سپاہی کسی کمان کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ اس کی اصل قوت اس کا متبرک ہدف ہوتی ہے'وہ جنگ میں فتح کے نتائج اور فوائد سے آگاہی رکھتا ہےاور شکست کے نتائج کا بھی شعور وادراک رکھتا ہے۔امام حسینؑ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اعوان وانصار میں کوئی شخص اطاعتِ امام کے جذبے کے تحت یا امامؑ سے اپنی بے پناہ ولا اور محبت کے تحت دشمن سے نبرد آزما ہو بلکہ اس کے برعکس جو بھی دشمن کے مقابلے میں جانا چاہے وہ فہم وشعور و آگاہی سے مالا مال ہو اور اپنے ہدف کا اسی طرح ادراک رکھتا ہو جس طرح خود امامؑ اپنے ہدف سے آگاہی اور عشق رکھتے تھے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ ہر شخص "حسینؑ" بن کر میدان جہاد میں جائے۔امامؑ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے۔چنانچہ مقاتل میں ہے کہ امامؑ کے انصار جس جذبے سے کربلا میں لڑے اس کی کوئی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

چوتھا جواب

امامؑ کا اپنے انصار واعوان کو چلے جانے کی اجازت دینے کا ایک مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حق وحقانیت کو اجاگر اور ثابت کرنے والے لوگ باقی رہیں'اگر کربلا میں سب کے سب شہید ہوجاتے تو حق کی آواز کو بلند کرنے والا اور امامؑ کے ہدف ومقصد کو زندہ رکھنے والا کوئی باقی نہ رہتا۔امام حسینؑ کی یہ سوچ ان کے بھائی امام حسنؑ کی سیرت سے عین مطابقت رکھتی ہے۔چنانچہ امام حسنؑ سے خلوت میں جب ان کے مخلص اصحاب نے یہ پوچھا کہ آپ نے معاویہ سے کیوں صلح کی تو آپؑ نے فرمایا کہ "میں نے اس لئے صلح کی تا کہ حق کی دعوت دینے والے زندہ رہیں۔"

پانچواں جواب

امام حسینؑ اپنے انقلاب کو دشمن کے غلط پروپیگنڈے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔چنانچہ حالات جب اس نوبت پر پہنچے کہ بچنے کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں تو امامؑ نے اپنے دینی وظیفے اور غیرتِ دینی کو باقی رکھنے کے لئے شہادت کو ترجیح دی۔اب اگر آپؑ اپنے ساتھ اپنے انصار کی شہادت کو بھی لازمی قرار دیتے تو ہوسکتا تھا کہ دشمن پروپیگنڈہ کرتا اور کہتا کہ "حسینؑ خود موت کے لئے تیار ہوجاتے لیکن دوسروں کو موت کے منہ میں دھکیلنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ان کے ساتھی تو جنگ سے بچنا چاہتے تھے لیکن اپنے امامؑ کی محبت ومروت اور دباؤ کی وجہ انہوں نے جنگ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔"چنانچہ امام حسینؑ نے اس زہریلے پروپیگنڈے کی جڑ کاٹنے کے لئے اپنے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔

واقعاتِ عاشورا

۲ محرم الحرام ۶۱ھ سے لے کر صبح عاشورا تک جو لشکر امام حسین علیہ السلام کے رکاب میں شامل ہوا اور اس کے مقابلے میں عمر سعد کے لشکر کی تعداد جو کربلا میں جمع ہوا اس کی تفصیل یوں ہے۔

کربلا میں حسین علیہ السلام کے اصحاب کی تعداد

حضرت امام حسین علیہ السلام کے اصحاب کی تعداد کا دشمن کے لشکر کی تعداد کے مقابلے میں قلت وکثرت کا کوئی تناسب نہیں ہے۔اس کی صحیح تعداد کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔

ہم یہاں پر تاریخ وسیرت نگاروں کے حوالے سے ان اعداد وشمار کو نقل کرتے ہیں۔

☆ صاحب بدایہ ونہایہ نے اپنی کتاب کی جلد ہشتم صفحہ نمبر ۱۹۷ پر امامؑ کے لشکر کی تعداد پینتالیس سوار اور ایک سو پیادہ بیان کی ہے۔

☆مسعودی نے پانچ سوسوار ایک سو پیادہ کل مجموعی تعداد چھ سو (۶۰۰) بتائی ہے۔

☆ابن شہر آشوب نے مناقب سے کل تعداد بیاسی بتائی ہے اور کہا ہے کہ اس میں سے بتیس سوار تھے۔

☆تہذیب التہذیب جلد اول صفحہ ۱۵۶ کے مطابق اولادِ علیؑ میں سے پانچ یا سات بنی ہاشم سے آٹھ اور مجموعی طور پر کُل لشکر کی تعداد ایک سو بتائی ہے۔

☆ابن کثیر نے بتیس سوار چالیس پیادہ بتائی ہے۔ابن مرجانہ کے پاس جو سر ہائے مقدس بھیجے گئے ان کی تعداد اناسی ہے۔

یہاں ہم ان باوفا افراد کی حسینی لشکر میں شمولیت کی مختصر روداد بیان کرنا چاہیں گے۔

اصحابِ حسینؑ کی لشکرِ حسینی میں شمولیت کی روداد

حضرت مسلم بن عقیلؑ ہانی بن عروہ اور دیگر بعض جانثاروں کی شہادت کے بعد عبیداللہ ابن زیاد کی کوفہ پر گرفت مستحکم ہوگئی۔اس کے بعد اس کا اگلا قدم یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح امام حسین علیہ السلام کے تمام معروف اصحاب اور عقیدت مندوں کو گرفتار کیا جائے اور شہر کی پوری طرح ناکہ بندی کردی جائے تاکہ امام علیہ السلام کی نصرت کے لئے نہ کوئی کوفہ سے باہر جاسکے اور نہ ہی آپؑ کا کوئی قاصد کوفہ میں داخل ہوسکے۔ساتھ ہی امامؑ کا داخلہ سختی کے ساتھ مسدود کردیا جائے۔اس کے علاوہ کوفہ میں ایک عمومی سپاہ بنانے کا اعلان کیا گیا اور دعوت دی گئی کہ تمام افراد حسینؑ سے جنگ کے لئے نکل آئیں۔کوفہ میں شہر کی سخت ناکہ بندی کے باوجود امام حسین علیہ السلام کے انصار ویاران کی جانفشانی' ایثار اور امامؑ کی رکاب

میں شہادت کے شوق وجذبے کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کس کس طرح اپنے آپ کو کربلا تک پہنچایا۔ہم یہاں امام حسینؑ علیہ السلام کے لشکر میں ان کے باوفا انصار واعوان کی شمولیت کی کیفیت بیان کریں گے کہ ان پاک ذوات نے کس طرح خود کو امام حسینؑ کے لشکر میں پہنچایا۔

جو افراد امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ تھے ان کے علاوہ بعد میں جن افراد نے خود کو امامؑ کے لشکر میں شامل ہونے کے لئے خود کو امامؑ کی خدمت میں پہنچایا ان کی تفصیل یوں ہے۔

(۱)۔وہ گروہ جس نے امام حسینؑ کے عشق ومحبت میں عبیداللہ ابن زیاد کی تمام تر رکاوٹوں اور مشکلات کو کسی نہ کسی طرح عبور کیا اور کوفہ سے نکل کھڑے ہوا اور خود کو امامؑ کی خدمت میں پہنچایا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

حبیب ابن مظاہر' قاسط ابن زہیر تغلبی' کرموس تغلبی' کنانہ بن عتیق تغلبی' مسلم بن کثیر عارج' حنظلہ بن اسور الشیامی' جبلہ بن علی شیبانی' سالم بن عمرو مولی بنی المدینہ کلبی' سوار بن منعم بن حابس ہمدانی' عمر بن عبداللہ جندعی' عبدالرحمٰن ارجی' یزید ابن حصین مشرقی' انیس بن معقل اصحی' عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔یہ سب کے سب ایک ایک دو دو یا زیادہ سے زیادہ تین تین کی تعداد میں نکلے اور اپنے آپ کو کربلا تک پہنچایا۔

(۲)۔وہ افراد جن کی امام حسینؑ کے لشکر میں شمولیت کی تفصیل اور وضاحت تاریخ میں نہیں ملتی کہ وہ کب اور کیسے امام حسینؑ تک پہنچے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

ابو ثمامہ صیداوی' عمرو ابن جندب حضرمی' جندب بن حجیر خولانی اور ابوشعشا کندی۔

(۳)۔وہ حضرات جو تمام دشواریوں کے باوجود نہ صرف خود بلکہ اپنے ساتھ اپنے اہل وعیال کو بھی لے کر نکلے اور امام حسینؑ کے رکاب میں پہنچے یہ ہیں۔

مسلم ابن عوسجہ اسدی' عبداللہ ابن عمیر کلبی اپنے بیٹے کے ساتھ' جندہ بن حارث انصاری' وہب کلبی اور اس کی والدہ۔

(۴)۔کچھ وہ پاک ذوات بھی ہیں جن کو امام حسین علیہ السلام کے کربلا پہنچنے کی خبر جب ملی تو وہ پریشان

ہوگئے کہ کس طرح خود کو امامؑ کی رکاب تک پہنچائیں ۔انہوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ عمر سعد کے لشکر ساتھ مل کر کوفہ سے نکلے اور کربلا پہنچ کر عمر سعد کی فوج سے نکل کر امام حسینؑ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے'ان کے نام یہ ہیں ۔

ضرغامہ بن مالک'قاسم بن حبیب ازدی'نعمان بن عمرو راسبی'حلاس راسبی'مالک عبد بن سریع جابری'سیف بن حارث بن سریع جابری'مسعود بن حجاج'عبدالرحمٰن بن مسعود و عمار بن ابی سلامہ والانی ۔

(۵)۔اس کے علاوہ کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اموی لشکر میں تھے اور امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے نکلے تھے لیکن جب ان پر امام حسینؑ کی حقانیت منکشف ہوگئی تو عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امامؑ کے ساتھ شامل ہوگئے مثلاً ۔

☆حر ابن یزید ریاحی جو ایک لشکر لے کر امام حسینؑ کو گرفتار کر کے کوفہ لے جانے کے لئے یا ان کو محاصرے میں رکھنے کے لئے نکلے تھے اور وہی آپؑ کو کربلا لانے کا سبب بنے ۔شب عاشور تمام رات ان کا ضمیر حق و باطل کے درمیان ایک طویل کشمکش کے بعد حق کی طرف مائل ہوا اور صبح عاشور وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اپنے سابقہ گناہوں پر پشیمان ہو کر امامؑ کی رکاب میں شامل ہوگئے اور ہمیشہ کے لئے خود کو سعادتِ ابدی سے ہمکنار کرلیا۔

☆شب عاشور بتیس افراد امام حسینؑ کی حقانیت درک کرنے کے بعد عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امامؑ کے لشکر میں شامل ہوئے ۔

اموی لشکر کی تعداد

تاریخ واقعات کو کبھی بھی مبالغہ اور افراط و تفریط کا شکار نہیں ہونے دینا چاہئے ۔مبالغہ آرائی نہ صرف تاریخ حقائق کو مسخ کردیتی ہے بلکہ المیہ کربلا جیسے اہم واقعہ کو ایک طلسمی کہانی بنا کر واقعہ کی اہمیت اور امام حسینؑ کے مقصد اور ہدف کو پس پردہ لے جانے کا سبب بنتی ہے اور حق و حقیقت کا متلاشی کسی طلسماتی کہانی

کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے ۔مثلاً ''اسرار الشہادۃ'' اور ''روضۃ الشہداء'' وغیرہ میں کہا گیا ہے کہ کربلا میں امام حسینؑ کے خلاف دشمن کے لشکر کی تعداد ۱۵ لاکھ تھی جو نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے ۔تاریخ اور مقاتل سے اس تعداد کی کوئی سند نہیں ملتی ۔

ائمہ اطہار علیہم السلام سے مروی روایات کے مطابق امامؑ کے خلاف جمع ہونے والے لشکر کی تعداد زیادہ سے زیادہ تیس ہزار بیان کی گئی ہے ۔

تاریخ اور کتبِ مقاتل میں کربلا میں امامؑ کے خلاف جمع ہونے والے لشکر کی تعداد ۲۵ ہزار لکھی گئی ہے جس کی تفصیل یوں ہے ۔

(۱)۔حر ابن یزید ریاحی کی قیادت میں منزلِ زبالہ سے امامؑ کی نگرانی کرتا ہوا جو لشکر کربلا پہنچا اس کی تعداد ایک ہزار ۔

(۲)۔کعب بن طلحہ کی قیادت میں کربلا آنے والے لشکر کی تعداد تین ہزار ۔

(۳)۔عمر ابن سعد کی قیادت میں کربلا پہنچنے والے لشکر کی تعداد چار ہزار ۔

(۴)۔شمر ابی ذی الجوشن سلولی کی قیادت میں کربلا پہنچنے والے لشکر کی تعداد جس میں کوفہ کے علاوہ شامی فوجی بھی تھے چار ہزار ۔

(۵)۔یزید بن رکاب کلبی کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد دو ہزار ۔

(۶)۔حصین ابن نمیر سکونی کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد چار ہزار ۔

(۷)۔مضار بن رھینہ المازنی کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد تین ہزار ۔

(۸)۔نصر بن خرشہ کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد دو ہزار ۔

(۹)۔شبث ابن ربعی کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد ایک ہزار ۔

(۱۰)۔حجاج ابن ابجر کی قیادت میں آنے والے لشکر کی تعداد ایک ہزار ۔

کل تعداد: پچیس ہزار ۔

صبحِ عاشورا

امام حسین علیہ السلام نے نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد اپنے اصحاب سے خطاب کیا۔خدا کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ:

''خداوندِ عالم نے مجھے اور تم لوگوں کو اجازت دی ہے کہ ہم (اس کی راہ میں) قتل ہو جائیں ۔ ہمیں اب صبر واستقامت کے ساتھ دشمن سے نبرد آزمائی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے ۔''

یہ فرما کر اپنے اصحاب کی نہایت قلیل اور مختصر فوج کو اسی انداز سے منظم کیا جس طرح ایک بڑے لشکر کو منظم کیا جاتا ہے ۔لشکر کے دائیں جانب کی قیادت زہیر ابن قین کو دی' بائیں جانب کی کمان حبیب ابن مظاہر کے سپرد کی اور پورے لشکر کا قائد قمرِ بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباس کو مقرر کیا۔خود کو اور اپنے اہل بیتؑ کو وسطِ لشکر میں رکھا۔ایک مرتبہ امامؑ نے اپنے لشکر پر نظر ڈالی کہ جس کی تعداد سو تک بھی نہیں پہنچتی تھی جب کہ دوسری طرف مقابل میں دشمن کے لشکر کا جمِ غفیر تھا۔اپنے انصار کی قلت اور دشمن کی کثرت پر امامؑ کے قلب پر رقت طاری ہوئی ۔اس بے کسی کے عالم میں امامؑ نے درگاہِ خداوندی میں اپنے ہاتھ بلند کئے اور دعا کی کہ:

''خداوندا! ہر مشکل اور ہر مصیبت میں ہمیشہ میں نے تیری ہی ذات پر بھروسہ کیا' میری تمام امیدیں تیری ہی ذات سے وابستہ ہیں ۔تمام چارہ جوئی ختم ہونے' دوستوں کے ساتھ چھوڑ جانے اور دشمن کے شماتت کرنے پر ہم نے ہمیشہ اپنی مصیبت کو تیرے ہی حضور میں پیش کیا' میں نے اپنی شکایت تیری ہی بارگاہ میں پیش کی' تیری ذات کے علاوہ میں کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکا۔یہ تو ہی ہے جس نے ہمیشہ میری مشکل کشائی کی اور میری پریشانیوں کو دور کیا۔ ہر نیکی اور ہر نعمت تیری ذات سے ہے' ہر کسی کی امیدیں تجھ ہی سے وابستہ ہیں ۔''

امام حسینؑ اور ان کے باوفا اصحاب کے خطبات کے نکات

روزِ عاشورا کے اہم واقعات میں سے ایک اہم واقعہ امام حسینؑ کے باوفا انصار زہیر ابن قینؑ' حبیب

ابن مظاہرؑ' مسلم ابن عوسجہ اور بریر ہمدانی جیسی مذہبی وسماجی شخصیات اور خود امامؑ کے انسان اور انسانیت کو بیدار کرنے والے وہ خطبات ہیں جو انہوں نے عمر سعد کے لشکر کو مخاطب کرتے ہوئے کربلا کے میدان میں دیئے ۔ان خطبات میں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب نے جن نکات کی طرف اس گمراہ لشکر کی توجہ دلانا چاہی تھی وہ یہ ہیں ۔

☆انہوں نے بتایا کہ جس ہستی اور جس ذات کو قتل کرنے پر تم لوگ متحد ہوئے ہو اور جس کا خون بہانے پر تم تلے ہوئے ہو وہ حسین ابن علیؑ کی ذات ہے' وہ حسینؑ جو تمہارے پیغمبرؐ کا فرزند فاطمہ زہراؑ کا دلبند اور اس علیؑ کا بیٹا ہے جو تمہارے امیر المومنین تھے ۔امام حسینؑ اور ان کے باوفا اصحاب نے اپنے خطبات میں نہایت واضح اور روشن طریقے سے کما حقہ طور پر لشکرِ عمر سعد سے اپنا تعارف کرایا تا کہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکتے کہ ''ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم کس کے خلاف جنگ کرنے نکلے ہیں ۔''

☆دوسرا نکتہ جو ان خطبات میں واضح اور روشن کیا گیا وہ یہ ہے کہ حسینؑ کی آمد خود اپنی طرف سے نہیں بلکہ وہ اہل کوفہ کے پیہم اصرار اور ان کی دعوت پر یہاں آئے ہیں ۔

☆ان خطبات میں اہل کوفہ کو ایک مرتبہ پھر دعوت دی گئی کہ وہ سوچیں اور غور کریں اور اس غور وفکر کے بعد بھی وہ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ امامؑ کو یہاں بلا کر ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ امامؑ کی آمد سے اگر خوش نہیں ہیں اور ان کا ساتھ دینے سے معذور رہیں تو وہ ''حسینؑ'' کو یہاں سے واپس جانے دیں ۔

☆ان خطبات کا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ لشکرِ عمر سعد کے پاس ''حسینؑ'' کو قتل کرنے کا نہ کوئی شرعی جواز ہے اور نہ عقلی ۔امامؑ نے فرمایا کہ.......''نہ میں نے شریعت میں کوئی تبدیلی اور تحریف کی ہے' نہ تمہارے کسی فرد کو میں نے قتل کیا ہے اور نہ ہی میں نے کسی کا حق چھینا ہے کہ تم مجھ سے اس کا انتقام لو۔''

لیکن ان تمام خطبات اور گوہر بار وحکمت آمیز کلمات کا کہ جو آپؐ نے قرآنی آیات اور پیغمبرؐ کی روایات سے استدلال کرتے ہوئے بیان فرمائے اس قومِ اشقیاء پر کوئی اثر نہ ہوا جیسا کہ خود امام حسینؑ نے فرمایا کہ.......''ان پر شیطان غالب آ چکا ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے۔''

واقعاتِ روزِ عاشورا

عاشور کی صبح عمر ابن سعد اپنے لشکر کے ساتھ خیامِ امام حسینؑ کی طرف بڑھا، اپنے غلام درید کو پکار کر کہا کہ پرچم لے کر آگے بڑھے۔ اس کے بعد اس نے ایک تیر اکمان میں رکھا اور لشکرِ امامؑ کی طرف پھینک کر کہا کہ:

"گواہ رہنا کہ میں وہ شخص ہوں جس نے حسینؑ کو قتل کرنے کے لئے پہلا تیر ان کی طرف پھینکا۔"

عمر سعد کے تیر پھینکتے ہی اس کے تمام لشکر نے امامؑ کے لشکر کی طرف تیروں سے زخمی نہ ہوا ہو عمر سعد اور اس کے لشکر کی طرف سے مجرمانہ جنگ کا آغاز ہونے کے بعد امامؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ:

"دشمن نے تیروں کی بارش کر کے اپنے جرم و جنایت کا آغاز کر دیا ہے، اٹھو اور اپنے دفاع اور موت کے استقبال کے لئے تیار ہو جاؤ، خدا تمہاری نصرت فرمائے۔"

امامؑ کے اصحاب بھی اپنے دفاع کے لئے آگے بڑھے اور ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والے گرد و غبار کے بادل سے سورج چھپ کر رہ گیا۔ جب گرد و غبار چھٹا اور امامؑ نے دیکھا تو آپؑ کے پچاس کے قریب جانثار خاک و خون میں غلطاں ہو چکے تھے۔ اس حملہ امامؑ کے لشکر میں سے شہید ہونے والوں کے اسماء گرامی جو کتبِ مقاتل میں نقل ہوئے ہیں وہ یوں ہیں۔

(۱)۔ ادہم بن امیہ عبدی بصری: یہ بصرہ سے آ کر کربلا میں امامؑ کے لشکر میں شامل ہوئے۔

(۲)۔ امیہ بن سعد طائی: یہ امیر المومنین حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے اور ایامِ ہدنہ میں کوفہ سے آئے تھے۔

(۳)۔ جابر بن الحجاج مولیٰ عامر بن نہشل تیمی: یہ کربلا میں امامؑ سے آ کر ملے اور آپؑ کے لشکر میں شامل ہوئے۔

(۴)۔ جبلہ بن علی شیبانی۔

(۵)۔ جوین بن مالک بن قیس بن ثعلبہ تیمی ضبعی: یہ عمر سعد کے لشکر میں تھے کربلا میں عمر سعد کے لشکر سے

نکل کر امامؑ کے لشکر سے آ ملے۔

(۶)۔ جندب بن حجیر کندی خولانی: یہ امیر المومنین حضرتؑ کے اصحاب میں سے تھے۔

(۷)۔ جنادہ بن کعب بن حرث انصاری خزرجی: یہ مکہ سے امامؑ کے ساتھ تھے اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لائے تھے۔

(۸)۔ حباب بن حارث سلمانی ازدی: یہ کوفہ کے ممتاز شیعوں میں سے تھے، حضرت مسلمؑ کے ساتھ رہے ان کی شہادت کے بعد امام حسینؑ سے آ کر مل گئے۔

(۹)۔ حرث یا حارث بن امرئ قیس کندی: یہ عمر ابن سعد کے ساتھ تھے، بعد میں امام حسینؑ سے آ کر مل گئے۔

(۱۰)۔ حرث بن نبہان مولیٰ حمزہ بن عبد المطلب: یہ مدینہ سے امام حسینؑ کے ساتھ نکلے تھے۔

(۱۱)۔ حلاس بن عمرو ازدی راسبی: یہ امیر المومنین حضرت علیؑ کے محافظین میں سے تھے، کوفہ سے عمر سعد کے ساتھ آئے تھے بعد میں امام حسینؑ کے لشکر سے آ ملے۔

(۱۲)۔ حنظلہ بن عمرو شیبانی۔

(۱۳)۔ زاہر مولیٰ عمرو بن حمق کندی خزاعی۔

(۱۴)۔ زہیر بن بشیر خثعمی۔

(۱۵)۔ زہیر بن سلیم ازدی۔

(۱۶)۔ سالم بن عمرو مولیٰ بنی مدینہ کلبی: یہ ایامِ ہدنہ میں امامؑ سے آ ملے۔

(۱۷)۔ سعد بن حرث: یہ حضرتؑ کے غلاموں میں تھے، مدینہ سے امامؑ کے ساتھ تھے۔

(۱۸)۔ سوار بن منعم بن حابس بن ابی عمیر بن ہمدانی: یہ ایامِ ہدنہ میں کوفہ سے آئے تھے اور امامؑ سے آ ملے
۔

(۱۹)۔ سیف بن مالک عبدی نمیری۔

(۲۰)۔ضرغامہ بن مالک: یہ حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد عمر سعد کے ساتھ کوفہ سے نکلے اور کربلا میں امامؑ سے آملے۔

(۲۱)۔عامر بن مسلم عبدی بصری۔

(۲۲)۔سالم مولیٰ عامر: یہ بصرہ سے آئے تھے۔

(۲۳)۔عبداللہ بن بشر بن ربیعہ بن عمرو: یہ عمر سعد کے لشکر سے نکل کر امامؑ سے آملے۔

(۲۴)۔عبداللہ بن عمیر بن عباس بن قیس بن علیم بن کلبی: یہ اپنی بیوی ام وہب کے ہمراہ نکلے تھے اور امامؑ سے ملحق ہوئے۔

(۲۵)۔عبداللہ بن یزید بن شبیط یا ثبیط: یہ دونوں یزید عبدی بصری کے بیٹے تھے۔

(۲۶)۔عبیداللہ بن یزید بن شبیط یا ثبیط: یہ تینوں باپ بیٹے بصرہ سے امامؑ کی نصرت کے لئے آئے تھے۔

(۲۷)۔عمار بن حسان بن شریح بن سعد بن حارثہ: مکہ سے امامؑ کے ساتھ ساتھ تھے۔

(۲۸)۔عمار بن ابی سلامہ۔

(۲۹)۔عمرو بن جندب حضرمی کوفی: حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد کوفہ سے نکلے اور راستے میں امامؑ سے مل گئے۔

(۳۰)۔عمر ابن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ ضبعی تمیمی: یہ عمر سعد کے ساتھ نکلے تھے اور ۱۰ محرم سے پہلے امامؑ سے آملے۔

(۳۱)۔عمرو بن عبداللہ ہمدانی جندعی: یہ ایام ہدنہ میں امامؑ سے ملحق ہوئے۔

(۳۲)۔عمران بن کعب بن حارث اشجعی۔

(۳۳)۔عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن بن ارحب: کربلا میں امامؑ سے ملے۔

(۳۴)۔قارب بن عبداللہ الدولی! یہ امام حسینؑ کے غلاموں میں تھے۔

ان کی والدہ امامؑ کی کنیز تھیں۔امامؑ نے ان کو عبداللہ الدولی عقد میں دیا جس سے قارب پیدا ہوئے۔یہ

مدینہ سے امامؑ کے ساتھ نکلے تھے۔

(۳۵)۔قاسط بن زہیر بن حرث تغلبی: یہ امیرالمومنین حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے۔کوفہ سے نکلے اور امامؑ سے جاملے۔

(۳۶)۔مقسط بن زہیر بن حرث تغلبی:

(۳۷)۔کردوس بن زہیر بن حرث تغلبی:

(۳۸)۔کنانہ بن عتیق تغلبی: یہ کوفہ نکلے اور امامؑ سے جاملے۔

(۳۹)۔قاسم بن حبیب بن ابی بشر الازدی: یہ کوفہ کے شجاعوں میں سے تھے عمر سعد کے ساتھ نکلے اور بعد میں ایام ہدنہ میں امامؑ سے آملے۔

(۴۰)۔مجمع بن عبداللہ عائذی الموجحی: یہ امیرالمومنین حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے اپنے بیٹے عائذ اور عمرو بن خالد صیداوی اور نافع بن ہلال کے ساتھ امامؑ سے راستے میں ملے تھے۔

(۴۱)۔عائذ بن مجمع بن عبداللہ عائذ الموجحی۔

(۴۲)۔مسعود بن حجاج تمیمی: یہ معروف شیعوں میں سے تھے عمر سعد کے لشکر میں تھے اور بعد میں امامؑ سے جاملے۔

(۴۳)۔عبدالرحمٰن بن مسعود بن حجاج تمیمی:

(۴۴)۔مسلم بن کثیر عارج ازدی کوفی: یہ حضرت علیؑ کے شیعوں میں سے تھے۔

(۴۵)۔شبیب مولیٰ الحرث بن سریع ہمدانی جابری۔

(۴۶)۔شبیب بن عبداللہ نہشلی بصری: یہ مدینہ سے امام حسینؑ کے ساتھ آئے تھے۔

(۴۷)۔نعیم عجلان انصاری۔

(۴۸)۔نعمان بن عمرو راسبی۔

بزدلوں کا شہسواروں سے مقابلہ

بزدلی اور شہسواری دو اصطلاحیں ہیں جو عام طور پر جنگ میں استعمال ہوتی ہیں۔ جنگی اصطلاحات کی رو سے یہ نہیں کہا جاتا کہ جو مر گئے وہ بزدل تھے اور جو زندہ رہے وہ شہسوار ہیں' بلکہ جو موت سے ڈرتے ہیں' دنیاوی زندگی کو دل و جان سے چاہتے ہیں اور موقع محل پاتے ہی راہِ فرار اختیار کرتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں اس کے برعکس جو سکون کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں' موت کو حیات پر ترجیح دیتے ہیں' فرار کا موقع ملنے کے باوجود راہِ فرار نہیں اختیار کرتے جنہیں اپنی زندگی سے زیادہ اپنے اہداف و مقاصد عزیز ہوتے ہیں' اپنے ہدف و مقصد کے حصول کے لئے جان دیتے ہیں انہیں شہسوار، مرد میدان اور شجاع کہا جاتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے لشکر کے ادنیٰ سے ادنیٰ مجاہد نے بھی شجاعت' شہامت اور شہسواری کے میدان میں آئندہ آنے والوں کے لئے ایک ناقابل شکست نظیر چھوڑی ہے۔ یہ بات ہم امام حسینؑ کے عقیدت مند ہونے کی وجہ سے نہیں کہتے بلکہ اس جنگ سے متعلق لکھے گئے حقائق تاریخ کی کتب میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان جانبازوں کی شجاعت اور دلیرانہ مقابلوں اور مبارزوں کا اعتراف خود دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ عمرو ابن سعد کے لشکری امام حسینؑ کے لشکر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یاران حسینؑ حسینؑ ایک ایسے گروہ و جماعت سے تھے کہ جن کے ہاتھوں میں تلواروں کے قبضے ہوتے تھے وہ شیر کی مانند ہمارے لشکر میں کود کر دائیں بائیں حملہ کرتے تھے' وہ خود ہمارے لشکر پر اس طرح کود کر آتے تھے جیسے وہ کسی طرح کی امان کے خواہاں نہیں بلکہ موت کے علاوہ کسی اور چیز کے طلبگار نہیں۔

کعب بن جابر ازدی امام حسینؑ کے لشکر کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"ہم نے جتنی شجاعت' قوتِ ارادی' استقامت اور بے جگری حسینؑ کے لشکر میں دیکھی کہیں اور نہیں دیکھی۔"

عمرو ابن حجاج جو عمرو ابن سعد کے لشکر کے سرداروں میں سے تھا' وہ اپنے لشکر کے افراد کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"تم جانتے ہو کہ تم کس کے مقابل ہو؟ یاد رکھو! تم ایسے شجاع اور بصیرت و آگاہی رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں ہو جو موت کو اپنا ہدف بنا چکے ہیں۔ تم ایک ایک کر کے ان سے مقابلے کے لئے نہ جاؤ ورنہ قتل ہو جاؤ گے۔"

عباس محمود عقاد کہتا ہے کہ حسینؑ کے ساتھ ایک ایسا منتخب شدہ گروہ تھا جو شجاعت اور جرات مندی میں منفرد تھا اور جنگ کے آداب و رسومات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ اپنی جنگ کے صلہ میں کسی قسم کے دنیاوی اہداف و مقاصد نہیں رکھتا تھا۔ حسینی لشکر کا ہر فرد میدان جنگ میں جا کر اپنا حسب و نسب اور اپنا ہدف و مقصد بیان کر کے دشمن سے مبارزہ کرتا اور جب وہ میدان میں کودتا تو دشمن کا لشکر خوف کے مارے پیچھے ہٹتا تھا۔ ان کی شجاعت' بہادری اور اپنے قیام و تحریک پر یقینِ محکم کی دلیل یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی فرد میدان جنگ سے فرار کر کے خیمہ میں نہیں آیا اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اس کے برعکس عمر سعد کے لشکر کی طرف سے مقابلے میں آنے والے رجز نہیں پڑھتے تھے۔ اہل عرب کے نزدیک رجز ایک جنگی اصول ہے اور جنگ کے موقع پر رجز نہ پڑھنا جنگ سے فرار کی علامت سمجھا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ مقابلے پر آنے والا سپاہی اضطراب اور پریشانی کا شکار ہے۔

لشکرِ حسینؑ کے مقابل آ کر دشمن کا رجز نہ پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے قبیلہ و خاندان کے سامنے اپنے ننگ و عار کا خطرہ محسوس کرتا تھا۔

غرض پہلے حملے کے بعد جب ایک مقابلے میں ایک کا مقابلہ شروع ہوا اور حسینی لشکر کے افراد یکے بعد دیگرے میدان میں جانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے تو وہ ایک دوسرے کو سلام اور وقت کا دفاع کرنے کی وصیت کرتے تھے۔ انصار و اصحاب کے بعد نوبت بنی ہاشم تک پہنچی اور یکے بعد دیگرے جوانانِ بنی ہاشم کے مبارزہ' مقابلہ اور شہادت کا سلسلہ اس وقت اپنے اختتام کو پہنچا جب لشکرِ حسینی کا علمبردار اور اہل بیتِ حسینؑ کا آخری سہارا قمر بنی ہاشم نے نہرِ علقمہ کے کنارے اپنے آقا و مولیٰ حسینؑ پر اپنی جان نچھاور کر دی۔

روحِ خدا کی واپسی

قرآنِ کریم انسانی نفس کی وابستگیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کی تمام لذتوں سے کٹ کر حتیٰ اپنی عزیز اور قریب ترین شخصیتوں کی محبتوں کو بھی خیر باد کہہ کر اپنی تمام تر وابستگیوں کو خداوند متعال کی ذات میں ضم کر دیتے ہیں ۔عشقِ الٰہی کی ایسی ہی ایک اعلیٰ ترین مثال کربلا کے میدان میں ۶۱ ہجری کی شبِ عاشور کے وہ آخری لمحات ہیں کہ جب اپنے رب سے شوق ملاقات میں سرتاپا ڈوبا ہوا ایک انسان اپنے شیدائیوں، جاںنثاروں حتیٰ اپنے عزیز ترین اہل بیتؑ کو بھی یہ تلقین کر رہا ہے کہ.......

''تم اپنی ذمہ داریاں پوری کر چکے ۔تم سب نے اپنے وفاداریوں اور محبت کی وہ ارفع ترین مثال قائم کر دی ہے جس پر تاریخ کو بھی ہمیشہ ناز رہے گا ۔مجھے اپنے رب سے ملاقات کے لئے تنہا چھوڑ دو، میں اپنی بیعت کو تمہاری گردنوں سے اٹھاتا ہوں ۔''

حسینؑ کیوں آج اپنے جاںنثاروں، شیدائیوں اور اپنے اہلبیتؑ کو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ وہ حسینؑ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں؟

اس لئے......

حسینؑ کے کانوں میں ایک صدا گونج رہی ہے.........

''یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ''

لیکن.......

حسینؑ کے یہ جاںنثار حسینؑ کو چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں ۔انہوں نے بھی تو اپنے پاکیزہ نفوس کو خدا کی راہ میں حسینؑ ہی کی ذات سے وابستہ کیا ہوا ہے ۔اپنے ماویٰ و ملجا، اپنے آقا و مولیٰ کو کربلا کے میدان میں تنہا چھوڑ کر بھلا کیسے جا سکتے ہیں؟

اور آخرکار......

روزِ عاشورا ان پاک نفسوں نے خود کو حسینؑ پر قربان کر دیا ۔یہ اپنی جانیں حسینؑ پر نثار کر چکے ۔تادمِ آخر حسینؑ سے وابستگی کی شرط بہ کمالِ احسن اپنے اختتام کو پہنچ چکی ۔

لیکن.......

حسینؑ اور اہل بیت حسینؑ کی باہم وابستگی ابھی باقی ہے، یہ وابستگی کوئی عام اور معمولی وابستگی نہیں ہے، یہ ایک بھائی کی اپنی بہن اور ایک بہن کی اپنے بھائی سے وابستگی ہے، یہ کوئی عام بھائی اور بہن نہیں ہیں،

ایک طرف حسینؑ جیسا بھائی ہے جو اپنے جد پیغمبرؐ کی ہو بہو تصویر ہے،

دوسری طرف زینبؑ جیسی بہن ہے جو اپنی ماں زہراء مرضیہؑ کی مکمل شبیہ ہے،

ابھی بھائی کو بہن سے جدا ہونا ہے،

ابھی حسینؑ کو اپنی بہن زینبؑ کو اس فراق و جدائی کے لئے آمادہ کرنا ہے، بھائی نے بہن کو لقاء اللہ اور سفرِ الی اللہ کی خاطر اس جدائی کے لئے آمادہ کر لیا،

بھائی اور بہن دونوں لقاء اللہ اور خدا سے اپنی انتہائی وابستگی کی مثال قائم کرنے پر متفق و متحد اور آمادہ ہیں ۔

اب.......

حسینؑ زینبؑ کو چھوڑ کر میدان میں جائیں گے،

اور ادھر کچھ دیر بعد.......

زینبؑ بغیر حسینؑ کے بازارِ کوفہ و شام میں جائیں گی،

بھائی اور بہن دونوں لقاءِ الٰہی کی خاطر اپنے اپنے مشن پر آمادہ ہیں، زینبؑ اسیری کے لئے آمادہ، حسینؑ شہادت کے لئے،

حسینؑ خیمہ سے نکل رہے ہیں، ساکنانِ ملاءِ اعلیٰ حیرت و تعجب سے انگشت بدنداں ہیں،

تین دن کا پیاسا حسینؑ میدان میں پہنچا، ادھر خونِ حسینؑ کا پیاسا دشمن کا لشکر حرکت میں آیا ۔حسینؑ ''نفسِ مطمئنہ'' کی کامل تصویر بن کر میدان میں وارد ہوا، ادھر بزدل دشمن خوف سے لرزاں ہے، آگے

بڑھنے اور تلوار اور نیزہ استعمال کرنے کی دشمن ہمت نہیں' دشمن نے دور ہی سے اس تین دن کے پیاسے حسینؑ پر تیروں اور پتھروں کی بارش کر دی اور آخر کار زخموں سے چور ہو کر لقاء الٰہی کا یہ عاشق گھوڑے سے گر کر کربلا کے ریگ زار پر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوا اور اپنے خالق کی آواز "ارجعی الی ربک راضیة مرضیة" پر لبیک کہتا ہوا اس کے حضور جا پہنچا۔

اور یوں.........

طاقت وقدرت کے غلبہ کیا صول اور قانون توازن ومعادلہ کے تحت تیس ہزار کا لشکر بہتر کے لشکر پر غلبہ حاصل کرنے میں آخر کار کامیاب ہو گیا۔

تیس ہزار کے لشکر کا بہتر پر غلبہ

صبح عاشور سے عصر عاشور تک ۱۴ یا ۱۵ گھنٹے کی مدت میں کربلا میں عمر سعد کے تیس ہزار فوج کے لشکر نے امام حسینؑ کے ۷۲ یا کچھ زائد افراد کے لشکر پر آخر کار فتح حاصل کر لیا اور اس ۷۲ افراد کی فوج کو (اگر اسے فوج کہا جائے تو) خاک وخون میں نہلا کر فتح وکامرانی کے شادیانے بجائے۔

ایک طرف عمر سعد کی فوج کے غلغلوں اور نعروں سے کربلا کا میدان گونج رہا تھا' دوسری طرف خانوادہ عترت وطہارت' اولادِ پیغمبرؐ اور اولادِ علیؑ وفاطمہؑ کے واحسینا اور وامحمدا کی دلدوز صداؤں سے آسمان کا سینہ شق تھا۔ملائے اعلیٰ میں ایک کہرام بپا تھا' ان دلدوز صداؤں پیغمبرؐ وبتولؑ' علیؑ وحسنؑ کو خلد بریں چھوڑ کر بے تابانہ کربلا کے میدان میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مردانِ الٰہی اپنا فریضہ اور وظیفہ بہ کمال احسن انجام دے کر "فزت برب الکعبة" کی صدائیں بلند کرتے ہوئے بہشت بریں کی طرف سدھار چکے تھے۔ادھر لشکرِ ابلیس اپنی فتح وکامرانی پر نازاں شیطانی قہقہے بلند کر رہا تھا۔اس لئے کہ اس عسکری فتح حاصل ہوئی تھی۔یہ ایک طبیعی قانون ہے کہ ہمیشہ جنگ میں میں غلبہ عسکری طاقت وقوت کے تناسب سے ہوتا ہے۔لہٰذا تیس ہزار کے لشکر کا ۷۲ افراد پر غلبہ اس طبیعی قانون کے تحت یقینی تھا۔لیکن ہمیں اموی لشکر کی فتح اور حسینی لشکر کی شکست کے پس منظر میں یہ دیکھنا ہے یہ

دونوں لشکر اور دونوں فریق آخر کیا چاہتے تھے؟

یزید کیا چاہتا تھا؟

اور حسینؑ کیا؟

یزید نے اپنی اس فتح سے کیا حاصل کیا؟

اور حسینؑ نے اس شکست کے نتیجے میں کیا کھویا؟

کیا یزید کا ہدف حسینؑ کو قتل کرنا تھا؟ یقیناً اس کا ہدف ومقصد حسینؑ کو قتل کرنا نہیں بلکہ اپنی حکومت کو ایک ایسا استحکام اور دوام بخشنا تھا کہ جہاں وہ اطمینان وسکون سے بلا روک ٹوک اپنی حکومت چلا سکے۔ حسینؑ کو قتل تو وہ صرف اس لئے کرنا چاہتا تھا کہ حسینؑ اس کے اس مقصد کی راہ میں حائل تھے۔وہ اس رکاوٹ کو اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔یقیناً وہ اس رکاوٹ کو ہٹانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اپنا ہدف اور مقصد حاصل کرنے میں اسے نہ صرف ناکامی ہوئی بلکہ اس کے برعکس اس کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔

ادھر ہم جب یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ حسینؑ نے اپنی شکست کے نتیجے میں کیا کھویا تو ہم دیکھتے ہیں کہ ابوعبداللہ الحسینؑ نے عسکری لحاظ سے ضرور شکست کھائی لیکن وہ اپنے اہداف میں بلاشبہ کامیاب رہے۔

حسینی اہداف ومقاصد کیا تھے؟

جب ہم ان مقدس اہداف ومقاصد پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اب اتنے دھندلا چکے ہیں کہ اب ہم ان کا تعین نہیں کر پاتے۔اس لئے کہ وہ اہداف ہمارے محترم عزاداروں کی رسوم عزاداری کی نذر ہو چکے' انہوں نے امامؑ کے اصل اہداف کو پس پشت ڈال کر اپنے ان خود ساختہ اہداف کو امامؑ کے اہداف قرار دے ڈالا جو کسی طرح ان کے اہداف سے میل نہیں کھاتے۔ تا ہم ہمارے علماء اور مفکرین اصل اہداف ومقاصد کو اجاگر کرنے اور سامنے لانے کی کاوشوں میں مصروف ہیں اور اپنا فریضہ انجام دینے میں کوشاں ہیں لیکن ابھی تک کسی اتفاقی نقطہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔غیر مربوط

اور ذیلی اہداف سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں مندرجہ ذیل اہداف پر روشنی ڈالیں گے جو علماء ومفکرین کے زیر بحث ہیں۔

(۱) شہادت۔

(۲) مسئولیت اور ماموریت کی انجام دہی۔

(۳) حکومت کا قیام اور باز یابی خلافت۔

امام حسین علیہ السلام کے اہداف کیان عنوانات پر ہم اپنی گزارشات اس امید کے ساتھ قارئین خصوصاً اہل فکر کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ وہ اپنی آراء اور تنقید وتبصرے سے ہماری اصلاح فرمائیں گے۔

(۱)۔شہادت

کیا آپؑ کا ہدف ومقصد شہادت تھا جس کی پیشین گوئی آپؑ نے بارہا یہ کہہ کر کی کہ.......

"یہ لوگ ہمیں شہید کریں گے۔" یا

"ہم شہادت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔"

کبھی فرمایا کہ.........

"ہم شہادت کو گلے لگانے کے متمنی ہیں۔"

آپؑ کے ان کلمات کو ایک خبر اور پیشین گوئی تو کہا جا سکتا ہے جو آپؑ نے اپنے اسلاف کے توسط سے بیان فرمائی یا اسے حالات کے منطقی تحلیل و تجزیے کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان کلمات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپؑ کا مطلوب ومقصود ہی شہادت ہے کسی طرح درست نہیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ آپؑ کا ہدف ومقصد ہی شہادت تھا تو شہادت کے حصول میں کون سا امر مانع تھا؟ یا کون سا گروہ آپؑ کی اس راہ میں رکاوٹ تھا؟

کیا یزید، عبید اللہ ابن زیاد اور لشکرِ عمر سعد آپؑ کو شہید ہونے سے روک رہے تھے؟

ایسا نہیں ہے بلکہ آپ کے شہید ہونے پر تو یہ لوگ الٹا خوش ہوتے کیونکہ اس صورت میں آپؑ کو شہید کرنے کی زحمت اور مشکلات سے یہ بچ جاتے اور آپؑ کو شہید کرنے کی بدنامی اور اس کے سنگین نتائج کا سامنا بھی انہیں نہ کرنا پڑتا۔ لہٰذا یہ لوگ تو شہادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں کہے جا سکتے۔

پھر کیا جوانان بنی ہاشم شہادت کی راہ میں رکاوٹ تھے جو یہ کہتے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو شہید ہونے نہیں دیں گے؟

اگر ایسا ہے تو پھر امامؑ کو ایسے افراد کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے تھی۔

لہٰذا آپؑ کا مطلوب ومقصود شہادت نہیں تھا۔ شہادت بذاتِ خود کبھی ہدف قرار نہیں پا سکتی کیونکہ وہ تو ہدف کے حصول کا ذریعہ اور سبیل ہے۔ چنانچہ قرآن میں "قتل فی سبیل اللہ" اور "قتل فی سبیل المستضعفین" کا بیان آیا ہے۔ اس لئے شہادت بذاتِ خود وسیلہ اور ذریعہ ہے ہدف نہیں۔

(۲)۔مسئولیت اور ماموریت کی انجام دہی

بعض مفکرین اور علماء کے نزدیک امام حسین علیہ السلام کا ہدف اپنے وظیفہ اور اپنی مسئولیت کی انجام دہی تھا۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق قیامِ حکومت اور باز یابی خلافت کا عمل کتنی ہی اہمیت کا حامل کیوں نہ ہو۔ اس ہدف کے حصول کے لئے کچھ مقدمات، وسائل و ذرائع کا موجود ہونا ضروری ہے ورنہ بغیر وسائل و ذرائع کے اس ہدف تک پہنچنا ایسا ہی ہے جیسے سیڑھی یا لفٹ کے بغیر چھت پر پہنچنا۔ چونکہ ایسے وسائل اور ذرائع امامؑ کی میسر نہیں تھے لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ قیامِ حکومت اور باز یابی خلافت کو آپؑ کا ہدف قرار دینا بعید نظر آتا ہے۔

چنانچہ دورِ حاضر عظیم رہبر حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای دام ظلہ نے بھی اپنے تاریخی خطاب میں اسی نظریے کو ترجیح دی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں کتاب فلسفہ عزاداری اور قیام امام حسینؑ) لیکن ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے مؤدبانہ ہم ایک سوال کرنا چاہیں گے اور وہ یہ کہ...... اگر امامؑ کا ہدف مسئولیت اور ماموریت کی انجام دہی تھا تو وہ وظیفہ اور مسئولیت کیا تھا؟

کیونکہ ہر وظیفہ اور مسئولیت کا تعلق اور ربط کسی چیز سے ہوتا ہے۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ امامؑ نے کون سا وظیفہ انجام دیا؟ آپؑ نے کس مسئولیت اور ماموریت کو انجام دیا؟

مثلاً...... کسی مالی معاونت میں اپنی مسئولیت ادا کی؟ حقوق والدین کے سلسلے میں اپنا وظیفہ انجام دیا؟ یا تبلیغ احکام کے سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کیا؟

اگر نہیں تو پھر۔

وہ تمام اقدامات جو امامؑ نے کئے اور جو فریضہ انجام دیا کیا وہ سب حکومتِ اسلام کے قیام اور خلافتِ اسلامیہ کی بازیابی کے لئے نہیں تھا؟

وہ مقامات
جہاں سے امام حسینؑ نہیں گزرے

جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں ہر تحریک اور قیام کی کامیابی اور ناکامی میں مکان و زمان کا دخل ہوتا ہے۔ ہر آگاہ و آشنا رہبر اپنی تحریک کے آغاز سے پہلے مناسب زمان و مکان کی تلاش و جستجو کرتا ہے۔ قیامِ مقدس امام حسینؑ کے لئے بھی یہ دو عوامل ناگزیر تھے۔ چونکہ اس موضوع پر کوئی کتاب یا مقالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہم نے اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق قیامِ مقدسِ امام حسینؑ میں جغرافیہ کی اہمیت کے موضوع پر اس کتاب کی ترتیب و تنظیم کی کوشش کی ہے۔ اب تک ہم نے ان مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں سے امام حسینؑ نے اپنے قیام و انقلاب کا آغاز کیا یا اپنی تحریک کے دوران وہاں سے گزرے اور جہاں یہ قیام اپنے اختتام کو پہنچا۔ کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جن کا ذکر اس قیام سے مربوط کتب تاریخ' سیرت اور مقاتل میں آیا ہے لیکن امامؑ کا وہاں سے گزر نہیں ہوا۔ اس باب میں ہم ان مقامات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

شام

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام کے سلسلے میں شام کا ذکر کافی تکرار کے ساتھ آتا ہے۔ آپؑ

کے قیام کا نقطۂ آغاز ہی وہ حکم نامہ بنا جو یزید کی طرف سے بنی امیہ کے دارالخلافہ "شام" سے صادر ہوا تھا اور جس میں آپؑ سے اس کی بیعت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے قیام و انقلاب کے بارے میں آپؑ کی تمام نقل و حرکت پر نظر رکھنے اور آپؑ کو گرفتار یا قتل کرنے کے تمام احکام شام ہی سے صادر ہوتے تھے۔ کربلا میں آپؑ کی اور آپؑ کے انصار و اعوان کی شہادت کے بعد شہداء کے سر ہائے مقدس اور اہل بیت رسولؐ کو اسیر کر کے "شام" ہی میں یزید کے دربار میں لایا گیا۔ عقیلہ قریش زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا اور سید سجاد امام زین العابدین علیہ السلام نے اسیری کے عالم میں یزید کے دربار میں جو تاریخی خطبات دیئے وہ اسی "شام" میں دیئے۔ یہ وہی شام ہے۔ جہاں اسیران اہل بیتؑ پر مظالم کی انتہا کی گئی۔ اس لحاظ سے قیام امام حسینؑ کی جغرافیائی حیثیت میں شام کا ذکر مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ امام حسینؑ کے قیام و انقلاب کے اہداف کا مرکزی نقطہ ہی شام کی اس غاصب' غیر مشروع اور ناجائز حکومت کے تسلط سے دین و ملت کو آزاد کرانا تھا۔

کہتے ہیں کہ کنعان بن حام کی قوم سے ایک قوم نکلی۔ اس قوم میں جب اختلاف اور افتراق ہوا تو ان میں سے ایک گروہ نے شمال یعنی بائیں طرف رخ کیا۔ چونکہ بائیں طرف کو فالِ بد اور بدشگونی سمجھا جاتا ہے اس لئے بدشگونی کی علامت کے طور پر اسے "شام" کہا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سام بن نوح پہلا شخص تھا جو یہاں وارد ہوا اور اس کے نام پر "شام" کے بجائے (سین کی جگہ شین لگا کر) اس کا نام "شام" پڑا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سلیمان ابن داؤد کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کے بارہ اسباط میں سے ڈھائی اسباط نے بیت المقدس میں قیام کیا اور ساڑھے نو اسباط نے ایک شہر میں قیام کیا جسے "شامین" کہا جاتا تھا' اس لحاظ سے ارضِ فلسطین کو "شام" کہا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شام قبلہ کی بائیں جانب ہے اس لئے اسے شام کہتے ہیں لیکن اس نظریے کو رد کیا گیا ہے۔

اس وقت فلسطین' اردن اور لبنان کے تمام علاقوں کو ملا کر شام یا شامات کہا جاتا تھا۔ یہ اس وقت روم کی امپیریلسٹ (Imperialist) حکومت کے جنوب کا حصہ تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ "یہ بہترین جگہوں میں سے ایک جگہ ہے' یہاں خیرات زیادہ ہے۔" اس کے علاوہ یہ انبیاء کا مرکز ہے۔

سوریہ

پہلے شام کو "سوریہ" کہتے تھے۔ آج کل بھی اس کو "شام" کم اور "سوریہ" زیادہ کہا جاتا ہے۔ سوریہ دراصل "شام" میں "خناصرہ" اور سلیمیہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ "سوریہ" کے گرد چاروں طرف ایک دیوار تھی جو چھ میٹر سے زیادہ اونچی تھی اس لئے "سوریہ" میں اس دیوار کو ری کے ذریعہ عبور کر کے آنا پڑتا تھا۔

دمشق

"دمشق" ایک جگہ کا نام ہے۔ دنیا کی سات اقلیموں میں سے اس کا شمار تیسری اقلیم میں ہوتا ہے۔ "دمشق" کو "دمشق" اس لئے کہتے ہیں کہ اس کو "دماشق" بن قانی بن ارفخشد بن سام بن نوح نے آباد کیا اس لئے اس کے نام پر اس کا نام "دمشق" پڑا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کو نیوراسف نے آباد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس شہر کے وجود میں آنے کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کو جیرون بن سعد بن عاد بن ارم بن سام بن نوح نے آباد کیا۔ بعض نے اسے دماشق بن نمرود بن کنعان سے نسبت دی ہے۔ کہتے ہیں کہ سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۵۰ "واٰویناھما الیٰ ربوۃ ذات قرار و معین" میں "ربوہ" سورۂ تین میں "زیتون" اور "طور سینین" اور سورۂ فجر میں "ارم ذات العماد" یہ سب تفسیریں دمشق کے بارے میں ہیں۔ اس کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے' یہاں نہریں جاری ہیں ہر قسم کے میوہ جات یہاں ملتے ہیں۔ یہاں انبیاء نے نزول فرمایا' پناہ لی اور نماز پڑھی۔ حضرت آدم صفی اللہ یہیں اترے' حضرت نوح علیہ السلام کا گھر یہیں پر تھا اور کشتی نوح یہیں سے روانہ ہوئی۔

اسلامی افواج نے ایک سال تک "دمشق" کو محاصرے میں رکھا' اس کے "باب جابیہ" پر ابوعبیدہ

جراح "باب شرقی" پر خالد بن ولید "باب توما" پر عمرو بن عاص اور "باب صغیر" پر یزید ابن ابی سفیان تھا۔ ایک سال کے محاصرے کے بعد یہاں پر محصور لوگ صلح پر مجبور ہوئے اور انہوں نے ابوعبیدہ جراح کو لکھا کہ ہم صلح کے لئے آمادہ ہیں' اس طرح رجب ۱۴ ہجری میں یہ صلح ہوئی۔

شام کی اسلامی تاریخ

پیغمبر اکرمؐ نے حارث ابن عمیر ازدی کو اپنا نمائندہ بنا کر ہرقل بادشاہ روم کی طرف بھیجا۔ آپؐ کے اس نمائندے کو عمر غسانی نے قتل کر دیا۔ اپنے اس نمائندے کا قتل پیغمبرؐ پر بہت شاق گزرا۔ آپؐ نے تین ہزار افراد پر مشتمل ایک اسلامی لشکر زید ابن حارثہ کی قیادت میں قصاص لینے کے لئے روانہ کیا اور ہدایت کی کہ اگر زید ابن حارث قتل ہو جائیں تو جعفر ابن ابی طالب لشکر کی قیادت سنبھالیں اور اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو عبداللہ ابن رواحہ اسلامی افواج کی قیادت کریں۔

مسلمانوں کے لشکر کو خبر ملی کہ ہرقل بلقا سے ایک لاکھ رومی فوج کے ساتھ نکلا ہے اور شام سے بھی اتنی ہی تعداد میں اسے مزید لشکر مل گیا ہے۔ مسلمانوں کی اس قلیل فوج نے "موتہ" نامی ایک جگہ پناہ لی جو بلقا سے نزدیک تھی۔ یہاں جنگ چھڑی اور پیغمبر اکرمؐ کے متعین کردہ اسلامی افواج کے تینوں سربراہ اپنی فوج کے بہت سے افراد کے ساتھ شہید ہو گئے۔ باقی ماندہ لشکر خالد بن ولید کی قیادت میں واپس مدینہ پہنچا۔

۹ ہجری میں پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ میں تمام مسلمانوں کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے متحد ہونے کی دعوت دی اور ایک عظیم اسلامی لشکر لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے جو شام ہی کا ایک حصہ تھا۔ یہ لشکر "جیش عسرہ" کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ یہ ایک سخت جنگ تھی' فصل کاٹنے کا زمانہ تھا' گرمی کا موسم تھا' فاصلہ بہت طویل تھا اور مقابلہ ایک بڑی طاقت سے تھا۔ پیغمبرؐ جب تبوک پہنچے تو یحنہ بن رویہ صاحب ایلا آپؐ کے پاس آیا اور مصالحت کرنے اور جزیہ دینے پر آمادہ ہوا۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں ایک لشکر ترتیب دیا اور اسے اسامہ بن زید کی قیادت میں روانہ

کرنا چاہا لیکن لشکر کی روانگی سے قبل ہی پیغمبرؐ رحلت فرما گئے۔

اس کے بعد ۱۲ ہجری میں حضرت ابوبکر نے روم سے جنگ کرنے کے لئے چار لشکر تیار کئے ۔ان لشکروں میں سے ایک کی قیادت عمرو ابن عاص کو دی اور اس کو فلسطین روانہ کیا' دوسرے لشکر کی قیادت یزید ابن ابی سفیان کو دی اسے دمشق بھیجا اور تیسرا لشکر شرجیل ابن حسنہ کی قیادت میں اردن روانہ کیا۔اس کے علاوہ ان لشکروں کا سربراہ پہلے خالد بن سعید بن عاص کو بنایا لیکن ان کی روانگی سے پہلے حضرت عمر کے کہنے پر خالد بن سعید کو معزول کر کے خالد بن ولید کو ان لشکروں کا سربراہ بنایا۔ان کو معزول کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ حضرت علیؑ کے حامیوں میں سے تھے۔یہ تمام لشکر تیس ہزار فوجیوں پر مشتمل تھے۔یہ خبر جب ہرقل کو ملی کہ مسلمانوں کا لشکر چار سپہ سالاروں پر مشتمل ہے اور مختلف سمتوں سے حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس نے ہر لشکر کے مقابلے میں اس سے دوگنی فوج کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور حمص کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔مسلمان فوجوں نے اس کی اطلاع عمرو ابن عاص کر دی۔اس نے مشورہ دیا کہ بہتر یہ ہے کہ ہم سب یرموک میں جمع ہو جائیں۔یرموک ایک وادی ہے جو اردن کے قریب ہے۔ادھر ہرقل کو جب مسلمان فوجوں کے یرموک میں جمع ہونے کی خبر ملی تو اس نے اپنی فوجوں کو بھی یرموک میں جمع ہونے کا حکم دیا۔اس جنگ کے دوران حضرت ابوبکر وفات پا گئے اور حضرت عمر خلیفہ بنے جنہوں نے خالد بن ولید کو ہٹا کر ابوعبیدہ جراح کو رئیس لشکر بنایا جن کے ہاتھوں شام فتح ہوا۔

ابوعبیدہ جراح کی وفات کے بعد حضرت عمر نے یزید ابن ابی سفیان کو پورے علاقے کا گورنر بنایا۔یزید ابن ابی سفیان نے حضرت عمر کے دور ہی میں وفات پائی۔اس کی جگہ اس کے بھائی معاویہ ابن ابی سفیان کو شام کا گورنر بنایا گیا۔معاویہ نے حضرت عمر کے آخری دور اور حضرت عثمان کے پورے دورِ خلافت میں مرکزی خلیفہ کے نمائندے اور امیرِ شام کے نام سے شام پر حکومت کی۔

حضرت علیؑ کے خلیفہ بننے کے بعد معاویہ نے آپؑ کی خلافت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور آپؑ کی شرعی اور جمہوری خلافت کے خلاف بغاوت کی۔ایک طرف تو وہ بالواسطہ طور پر جنگِ جمل کی تحریک

کا محرک ہے جب کہ دوسری طرف بلاواسطہ بذاتِ خود ایک بڑا لشکر لے کر صفین میں علیؑ کے خلاف جنگ کے لئے نکلے۔صفین کی طویل جنگ میں حضرت علیؑ کی واضح فتح عمرو ابن عاص کے مکرو فریب کے نتیجے میں شکست میں تبدیل ہو گئی۔بعد میں تحکیم کے نام سے معاویہ نے اپنی غاصب حکومت کو قانونی بنانے کی مذموم کوشش کی۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ ابن ابی سفیان مکرو فریب کے سات ایک ہاتھ میں صلح کا پرچم اور دوسرے میں تلوار لے کر امام حسنؑ کے خلاف نبرد آزما ہوا اور آخر کار اپنی اس مکرو چاپلوسی کے نتیجے میں اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہوا۔اس طرح تیس سال کے عرصے کی یہ نیم خودمختار حکومت امارت سے خلافت میں تبدیل ہو گئی اور معاویہ ابن ابی سفیان جو اب تک امیر شام کے نام سے شام پر مسلط تھے اب مملکتِ اسلامیہ کا خلیفہ بن بیٹھا۔اس کے بعد اسلام نابِ محمدی کے خلاف آخری تیر جو معاویہ کے ترکش سے نکلا وہ اپنے فاسق و فاجر بیٹے کے سر پر خلافت کا تاج رکھنا تھا۔چنانچہ خلافت کو ہمیشہ کے لئے اموی خاندان میں منتقل کرنے کی غرض سے اس نے یزید جیسے نا اہل اور اسلام نا شناس شخص کو اپنا جانشین اور ولی عہد قرار دے دیا۔جس نے تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی نواسہ رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ کر اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دیا اور بالآخر اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر کے ہی دم لیا۔

شام کے رہنے والے زیادہ تر لوگ نصرانی رومی تھے۔مسلمان ہونے کے بعد کلمہ پڑھ کر آغوشِ اسلام میں آنکھ کھولتے ہی انہوں نے ابوسفیان جیسے دشمن اسلام کی اولاد کو اسلام اور رسول اسلامؐ کے بہروپ میں دیکھا اور بدقسمتی سے انہیں کو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا نمائندہ سمجھا۔فرزندان ابی سفیان نے اسلام کی غلط تصویر و تفسیر پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ علیؑ اور اولادِ علیؑ پر سب و شتم کی منحوس رسم ڈالی۔چنانچہ شام علیؑ' اولادِ علیؑ اور اسلام کے خلاف غلط اور گمراہ کن تبلیغاتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ اہل بیتؑ سے مانوس نہ تھے۔

بصرہ

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام کی جغرافیائی حیثیت کا مطالعہ کرتے وقت ایک مقام جس کا خاص اہمیت کے ساتھ ذکر آتا ہے وہ بصرہ کا شہر ہے۔ اس شہر کے ذکر کی وجوہات اور اس شہر سے مربوط دیگر واقعات اور مسائل پر گفتگو سے پہلے ہم بصرہ کا ایک خاکہ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سرزمین عرب میں بصرہ نام کے دو شہر ہیں۔ ایک عراق میں اور دوسرا مغرب میں لہٰذا بصرہ کو تثنیہ کے صیغہ میں بصرتان بھی کہتے ہیں۔ تثنیہ کے صیغہ میں جب بصرتان کہتے ہیں تو اس سے مراد بصرۂ عراق اور بصرۂ مغرب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بصرتان سے مراد کوفہ و بصرہ بھی ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ والی بصرہ کچھ بصرہ میں رہتا تھا اور کچھ کوفہ میں۔

ابن انبار لکھتے ہیں کہ عربی لغت میں بصرہ اس سخت غلیظ زمین کو کہتے ہیں جس کے پتھر چوپایوں کے سم کو توڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ بعض کے نزدیک بصرہ اس نرم زمین کو کہتے ہیں جس میں سیاہ پتھر ہوں لیکن ابن اعرابی نے پہلی توجیہ کو ترجیح دی ہے کہ بصرہ سخت غلیظ پتھر کو کہتے ہیں۔ شرقی ابن قطامی نے اس شہر کو بصرہ کہنے کی توجیہ یوں بیان کی ہے۔

''جب مسلمان اس شہر میں وارد ہوئے اور ان کی نظر یہاں پتھروں پر پڑی تو انہوں نے بے ساختہ کہا کہ ارضِ بصرہ ہے۔''

صاحبِ منجد نے لکھا ہے کہ بصرہ شط العرب پر واقع ہے جو فرات اور دجلہ سے مل کر بنا ہے۔ یہ سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ جنگِ جمل جو امیر المومنین امام علی علیہ السلام اور ام المومنین حضرت عائشہ کے درمیان لڑی گئی۔ یہیں پر واقع ہوئی تھی۔

اہل بصرہ کے متعلق جو کلمات مولیٰ امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ان کو سید رضی نے نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۳ میں یوں بیان فرمایا ہے۔

''(اے اہل بصرہ) تمہارا اخلاق پست ہے' عہد شکنی تمہارا شیوہ ہے' تمہارا دین منافقت پر مبنی ہے' تمہارا پانی شور ہے' تمہارے درمیان زندگی گناہ کا سبب ہے' تمہاری سرزمین خدا کی سرزمین میں غلیظ

ترین جگہ ہے۔ یہ پانی سے بہت نزدیک اور آسمان سے بہت دور ہے۔ یہاں شر تو گنا ہے۔''

اسی طرح خطبہ نمبر ۱۴ میں ہے کہ۔

''تمہاری سرزمین پانی سے نزدیک اور آسمان سے دور ہے تمہاری عقل خفیف اور حلم کمزور اور سفاہت پر مبنی ہے۔ تم تیر مارنے والوں کے لئے ہدف' شکاری کے لئے شکار اور کھانے والوں کے لئے تر لقمہ ہو۔''

یہاں کے لوگ عموماً حضرت علیؑ سے عناد رکھتے تھے۔ تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ اہل بصرہ کی غالب اکثریت عثمانی العقیدہ تھی۔ یہ تجزیہ اس لحاظ سے صحیح نظر آتا ہے کہ جب طلحہ اور زبیر نے حضرت علیؑ کے خلاف محاذ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اسی شہر کا انتخاب کیا۔

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام و انقلاب کے لئے بصرہ کا کیوں انتخاب نہیں کیا اور اس کو کیوں نظر انداز کیا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔

(الف) ایک وجہ تو یہ تھی کہ بصرہ کے لوگ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اہلِ بیتؑ سے چنداں مانوس نہ تھے لہٰذا امام حسینؑ کو وہاں عوامی تائید حاصل نہیں تھی۔

(ب) دوسری وجہ یہ تھی کہ یہاں عبید اللہ ابن زیاد جیسا شقی انسان مسلط تھا اور بصرہ پر اس کا کنٹرول تھا۔

☆ آپؑ کے قیام و انقلاب کے سلسلے میں اس شہر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہی شہر ہے جس کے رؤسا میں سے پانچ بڑی شخصیات مالک بن مسمع بکری' احنف بن قیس' قیس بن ہیثم' منذر ابن جارود اور یزید ابن مسعود نہشلی کے نام امامؑ نام مکہ سے خط لکھا جس کا مضمون یوں ہے۔

''معبود نے محمدؐ کو اپنی مخلوق ؐ میں منتخب فرمایا اور نبوت و رسالت کا درجہ تفویض کیا اور جب وہ انسانوں کی ہدایت اور اپنے فریضہ منصبی کو انجام دے چکے تو پھر انہیں اپنی بارگاہ میں بلالیا...... ہم ان کے اہل بیتؑ' ولی' وصی اور وارث ہیں' ہم طبوری ملت میں قیادت و رہبری کے دوسروں سے زیادہ اہل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک گروہ ہم پر سبقت لے گیا اور ہمیں ہمارے حق سے محروم کر دیا۔ ہم لوگوں نے بھی

اپنی عظمت ومنزلت، علم وآگہی کے باوجود خاموشی اختیار کرلی تا کہ ملتِ اسلامیہ اختلاف وانتشار سے بچ سکے اور اسلام کا شیرازہ بکھرنے سے رہ جائے، میں نے مسلمانوں کے آرام واطمینان کو اپنے حقوق پر مقدم رکھا۔ ہمارا قصد تمہارے سامنے ہے ..... میں تمہیں کتابِ خدا وسنتِ رسولؐ کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ بتحقیق سنت مٹ چکی ہے اور بدعت زندہ ہوچکی ہے۔ اگر تم میری بات کو قبول کروگے اور میری اطاعت کروگے تو میں تمہیں رشد وہدایت کی طرف لے جاؤں گا۔"

امام علیہ السلام نے اپنے اس خط کے ذریعے اہل بصرہ کے ذمہ دار افراد پر مندرجہ ذیل نکات کو واضح اور روشن کیا ہے۔

☆ خلافت اور حکومت میں اہل بیتِ اطہارؑ کا مقام۔

☆ شریعت کی بقاء اور امت کی وحدت کے لئے خاندانِ رسالت کی قربانیاں۔

☆ اس وقت امت کا کردار اور ذمہ داری۔

☆ وہ مسئولیت اور ذمہ داری جس کے بارِ سنگین کو آپؑ نے اپنے دوشِ مبارک پر اٹھایا ہے۔

☆ آپؑ کے قیام وانقلاب کے سلسلے میں بصرہ کی اہمیت ان شہداء اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے بھی نمایاں ہے جو اس شہر نے امامؑ کی نصرت ومدد میں پیش کیں۔

بصرہ میں لوگوں نے یزید ابن مسعود نہشلی اور دیگر ذرائع سے جب یہ سنا کہ امامؑ ہمیں اپنی نصرت کے لئے بلا رہے ہیں تو وہ لوگ کہ جو اپنے دل میں اہل بیت علیہم السلام کے لئے عشق ومحبت رکھتے تھے ان کے دل امامؑ کی نصرت کے لئے تڑپ اٹھے۔ ان جانثارانِ امامؑ میں سے ایک شخص یزید ابن نبیط العبدی ہے یہ دیگر دوستدارانِ اہل بیتؑ کے ہمراہ ماریہ بنت منقذ نامی ایک مومنہ کے گھر جمع ہوئے۔ نبیط العبدی اہلِ بیتِ اطہارؑ سے انتہائی عشق وولا رکھتے تھے۔ ان کے دس بچے تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد میں سے دو لڑکوں عبداللہ اور عبیداللہ کو امامؑ کی نصرت پر آمادہ کیا اور اس مومنہ ماریہ بنت منقذ کے گھر میں موجود لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں تو امامؑ کی نصرت کے لئے نکل رہا ہوں، تم میں سے کون میرے ساتھ

چلنے کو تیار ہے۔ نبیط عبدی کو بھی اپنے اس ارادے سے باز آنے کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ کسی ناکہ بندی اور خوف وہراس کی پروا کئے بغیر اپنے مصمم عزم وارادے پر قائم رہے۔ جن لوگوں نے امامؑ کی نصرت میں نکلنے میں نبیط عبدی کا ساتھ دیا ان میں اس کے دو بیٹوں عبداللہ اور عبیداللہ کے علاوہ عامر ابن مسلم عبدی، موئی عامر، سیف بن مالک عبدی اور ادھم بن امیہ عبدی شامل ہیں جو تمام مشکلات کے باوجود ناکہ بندی توڑ کر بصرہ سے نکلنے میں کامیاب ہوئے اور یزید ابن مسعود نہشلی اور دوسرے رؤساءِ قبائل کو بصرہ میں تیاریوں میں مصروف چھوڑ کر خود کو امامؑ کی خدمت میں پہنچایا۔ جوں ہی انہوں نے اپنے آقا اور مولیٰ امام حسین علیہ السلام کو دیکھا تو خوشی کے مارے قرآن کی یہ آیت ان کی زبان پر جاری ہوئی۔

"قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذا لک فلیفرحوا"

"خدا کے فضل ورحمت سے ہمیں یہ سعادت نصیب ہوئی پس ہمیں ایسی سعادت پر خوش ہونا چاہئے۔" (سورہ یونس۔ آیت ۵۸)

یمن

یمن کا پرانا نام "سبا" ہے جہاں ملکہ بلقیس کی حکمرانی تھی۔ یہ شہر کعبہ کے دائیں جانب واقع ہے جب کہ شام بائیں جانب۔ کہتے ہیں کہ جب مکہ میں قبائل کا اژدحام بڑھ گیا تو کعبہ کے دائیں جانب رہنے والے وہاں سے کوچ یعنی زمین کے مرکز میں ہے اور اس کے جوانب میں دائل یا بائیں کا تصور نہیں ہے بلکہ سورج کے دائیں طرف واقع ہے۔ کعبہ کے چار گوشے ہیں جس میں ایک گوشہ کا نام رکنِ یمانی ہے۔ یہ ایک مجرو مستجاب الدعا رکن سمجھا جاتا ہے۔

امام حسینؑ کے قیام وانقلاب کے سلسلے میں "یمن" کا ذکر دو حوالوں سے آتا ہے۔

☆ ایک یہ کہ جب آپؑ نے مکہ چھوڑ کر کوفہ کا ارادہ کیا تو محمد حنفیہ اور عبداللہ ابن عباس نے مشورہ دیا کہ آپؑ کوفہ کی بجائے یمن چلے جائیں کو وہاں آپؑ کے پدرِ بزرگوار کے شیعہ موجود ہیں اور وہاں آپؑ کے لئے محفوظ مقامات ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب عام انسان تو ایک طرف، بڑی بڑی شخصیات تک امام

حسین علیہ السلام کے لئے یزید کی حکومت کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہی تھیں اور وہ لوگ آپؑ کو کسی ایسے محفوظ مقام پر جانے کا مشورہ دیتے تھے جہاں یزید کی رسائی ممکن نہ ہو۔لیکن اس کے برخلاف امام حسین علیہ السلام اپنی ذات سے زیادہ اسلام اور شریعت کے لئے خطرہ دیکھ رہے تھے اس لئے آپؑ اپنی ذات کو چھوڑ کر اسلام اور شریعت کو بچانے کی فکر میں تھے۔

☆ اس کے علاوہ امام حسینؑ کے قیام و انقلاب کے سلسلے میں یمن کا ذکر اس حوالے سے آتا ہے کہ جب آپؑ وادی تنعیم پہنچے تو آپؑ نے دیکھا کہ اسی یمن سے ایک قافلہ اونٹوں پر لدے ہوئے تحفہ تحائف یزید کے لئے لے کر شام جا رہا تھا تو آپؑ نے ان تحائف کو اپنے قبضہ میں لیا اور قافلہ والوں سے کہا کہ "تم میں سے جو واپس جانا چاہتا ہے واپس جا سکتا ہے ہم اسے یہاں تک کی اجرت دیں گے اور جو ہمارے ساتھ چلنا چاہیں ہم انہیں کا حق دیں گے۔

جابرس یا جابلص

یہ ایک شہر ہے جو شرق کی آخری حدود میں واقع ہے۔یہودیوں کا کہنا ہے کہ طالوت اور جالوت کی جنگ کے موقع پر حضرت موسیٰؑ کی کچھ اولاد بخت نصر سے فرار ہو کر یہاں پہنچی تا کہ ان کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔وہ دن رات سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچ اور پھر یہیں انہوں نے سکونت اختیار کر لی۔ان کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں۔یہودیوں میں کوئی اگر ادھر جائے تو یہ لوگ اسے قتل کر دیں۔

یہ لوگ بندگانِ خدا ہیں۔غیر یہودیوں کا کہنا ہے کہ یہ لوگ قومِ ثمود کے بچے ہوئے افراد ہیں۔

جابلق

زحاک نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جابلق ایک شہر ہے جو مغرب کی آخری حدود میں واقع ہے یہاں بسنے والے قومِ عاد کے بچے ہوئے لوگ ہیں۔

جابرس اور جابلق دونوں وہ مقامات ہیں جن کا ذکر امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے سامنے اپنے خطبے میں کیا۔اپنے کربلا کے خطبے میں امامؑ نے فرمایا کہ تم جابرس سے لے کر جابلق تک اگر تلاش کرو

تو تمہیں دختر پیغمبرؐ کی اولاد میں میرے اور میرے بھائی کے سوا دوسرا کوئی نظر نہیں آئے گا۔اس کے علاوہ امام حسنؑ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں معاویہ کے سامنے یہی بات کہی تھی۔

آخر میں ہم ائمہ سے مروی اس دعا پر کتاب کا اختتام کرتے ہیں کہ خدایا ہمیں ہر اس چیز میں شامل فرما جس میں تو نے آلِ محمدؐ کو شامل کیا ہے اور ہر اس چیز سے دور فرما جس سے تو نے آلِ محمدؐ کو دور رکھا ہے ۔اگر تو زندگی عنایت کرے تو زندگی آلِ محمدؐ عنایت فرما اگر موت دے تو مماتِ آلِ محمدؐ عنایت فرما' ہمارے صحیح کلمات کے صلے میں ہمیں دینِ مقدسِ اسلام' مکتبِ اہلِ بیتؑ اور راہِ حسینؑ کی خدمت کی توفیق عطا فرما اور جو غلطیاں' خطائیں' لغزشیں ہم سے سرزد ہوئی ہوں انہیں اپنے قلمِ عفو سے محو فرما دے۔آمین۔

مصادر و مواخذِ کتب

(۱)۔ قرآن و حدیث

قرآن کریم

معجم الفاظ قرآنی

نہج البلاغہ

معجم الفاظ نہج البلاغہ

شرح نہج البلاغہ ابن الحدید

الحج فی القرآن

وسائل الشیعہ

میزان الحکمہ

خطبہ حسین ابن علیؑ در منیٰ — محمد صادق نجمی

الدین و تاریخ الحرمین الشریفین — الحاج عباس کرارہ

الحج — ڈاکٹر عبداللہ بن محمد بن احمد اللیار

مجموعہ مقالات فی الحج	اوقافِ حج وزیارات ایران
الحاج ہمہ و رموز	ظفر الاسلام خان
مکہ	ڈاکٹر شیخ محمد ہادی امینی
الحج فی الکتاب والسنہ	اوقاف حج وزیارات ایران
الحج فی القرآن	اوقاف حج وزیارت ایران
حج الانبیاء الائمہ	اوقافِ حج وزیارات ایران
الکعبہ والحج	ابوالقاسم زین العابدین
کتاب الایضاح فی مناسک الحج والعمرہ	عبدالفتاح حسین
تفصیل الشریعہ (کتاب الحج)	آیت اللہ محمد فاضل لنکرانی
مناسکِ حج مراجع عظام	

(۲)۔ قاموس، معاجم اور لغت

قاموس الرجال	آیت اللہ العظمیٰ شیخ محمد تقی التستری
تاج العروس من جواہر القاموس	سید محمد مرتضیٰ الحسینی الزبیدی
لسان العرب	ابن منظور
معجم مقاییس اللغہ لابی الحسین	احمد بن فارس بن زکریا
دائرۃ معارف القرآن العشرین	محمد فرید وجدی
معجم ما استعجم من اسماء البلاد والمواضع	عبداللہ بن عبدالعزیز البکری اندلسی
مختار الصحاح	محمود خاطر
معجم قبائل العرب القدیمہ والحدیثہ	عمر رضا کحالہ
معجم البلدان	للشیخ الامام شہاب الدین ابی عبداللہ

مفردات الفاظ القرآن	علامہ راغب الاصفہانی
المنجد فی الاعلام	
مستدرک سفینۃ البحار	الحاج شیخ علی نمازی الشاہرودی
قاموسِ نہج البلاغہ	محمد علی شرقی
فرہنگِ عاشورا	جواد محدثی
قاموسِ قرآن	سید علی اکبر قرشی
فرہنگِ لغاتِ قرآن	ڈاکٹر محمد قریب

(۳)۔ کتبِ تاریخ

تاریخ طبری	
مروج الذہب	
تاریخ دمشق	
تاریخ یعقوبی	
تاریخ اسلام	
سیمائی کوفہ	تالیف غلام رضا گلی زوارہ
تاریخ الکوفہ	السید حسین بن السید احمد البراقی النجفی
تاریخ الدولۃ الامویہ	شیخ محمد الخضری بک
الامامہ والسیاسہ	ابن قتیبہ الدینوری
جولہ تاریخیہ فی عصر الخلفاء الراشدین	ڈاکٹر محمد سید وکیل
البدء والتاریخ	مطہر بن طاہر مقدسی
تذکرۃ الخواص	سبط ابن جوزی

مقاتل الاموین	محمد الحسینی
دول الاسلام	حافظ شمس الدین ابی عبداللہ ذہبی
تجارب الامم	ڈاکٹر ابوالقاسم امامی
تراث کربلا	سلمان ہادی الطعمہ
اخبارِ مکہ	ابی الولید محمد بن عبداللہ بن احمد ازرقی
اخبارِ مدینہ	ابی الولید محمد بن عبداللہ بن احمد ازرقی
حیاتِ اجتماعی مدینہ منورہ	السید یاسین احمد یاسین الخیاری
الکامل لابن اثیر	
تاریخ الاسلام	شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبی
تاریخ الاسلام	الدکتور حسن ابراہیم حسن
تذکرۃ الخواص	ابن جوزی
کتاب تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی
وفیات الاعیان	ابن خلکان
اسد الغابہ	ابن الاثیر
جرح و تعدیل	شیخ الاسلام رازی
تہذیب المقال	سید محمد علی موحد الطحی
قاموس الرجال	شیخ محمد تقی تستری
معجم الرجال الحدیث	آیت اللہ الخوئی
البدایہ و النہایہ	ابن کثیر
سیر اعلام النبلاء	امام شمس الدین محمد بن احمد عثمان الذہبی

(۴)۔ کتبِ مقاتل

وسیلۃ الدارین فی انصار الحسینؑ	آیت اللہ سید ابراہیم موسوی زنجانی
واقعۃ الطف ابی مخنف	تحقیق شیخ محمد ہادی یوسفی غروی
موسوعۃ کلمات الامام الحسینؑ	مرکزی تحقیقات باقر العلوم سازمان تبلیغاتِ اسلام ایران
تاریخ زندگانی امام حسینؑ (دو جلدیں)	عماد زادہ
مقتل الحسینؑ لابی مخنف	تحقیق حسن غفاری
بطل العلقمی (تین جلدیں)	عبد الواحد مظفر
حسینؑ فی فکر المسیحی	انطون بارا
مبعوث الحسینؑ	محمد علی عابدین
الامام الحسینؑ ثار اللہ	عباس جعفر
عاشورا امتداد الحرکۃ الانبیاء	آیت اللہ سید محمد تقی مدرسی
مقتل الحسینؑ	عبد الزہرا الکعبی
نہضت الحسینؑ	سید حسین فانی
کتاب عاشورا	ہادی مدرسی
ادب الحسینؑ حماسۃ	احمد صابری ہمدانی
المواکب الحسینیہ	ابوالحسن نقوی
محاظرات فی الثورۃ الحسینیہ	آیت اللہ سید محمود ہاشمی
علی بن الحسین الاکبر	محمد علی عابدین
الامام الحسین الحسین بن علی الشہید	عبد الودود الامین

مقتل الحسینؑ	شیخ فاضل عباس حیاوی
پیام عاشورا	آیت اللہ سید باقر میر دامادی
سفیر الحسین مسلم بن عقیلؑ	عبدالواحد شیخ احمد ظفر
ابناء الرسول فی کربلا	خالد محمد خالد
الدوافع الذاتیہ لانصار الحسینؑ	محمد علی عابدین
قیام عاشورا در کلام و پیام امام خمینی	آثار نشر امام خمینی
مقتل الحسین للخوارزمی	تحقیق علامہ شیخ محمد ساوی
مجموعہ مقالات کنگرہ بین الملل	
امام خمینی و فرہنگ عاشورا (حصہ دوم)	آثار نشر امام خمینی
انصار الحسینؑ	آیت اللہ محمد مہدی شمس الدین
نہضت الحسینؑ	آیت اللہ ھبہ الدین حسینی شہرستانی
لواعج الاشجان فی مقتل الحسینؑ	آیت اللہ محسن امین آملی
العیون العبری فی مقتل سید الشہداء	سید ابراہیم میانجی
ثورۃ الحسینؑ	آیت اللہ محمد مہدی شمس الدین
الماتم الحسینیہ	علی مخلص
اسرار عاشورا	سید محمد مجتبیٰ یزدی
الشعائر الحسینیہ بین الوعی والخرافہ	سید کامل ہاشمی
ابصار الحسینؑ فی انصار الحسینؑ	محمد بن شیخ طاہر سماوی
یوم الطف	ہادی نجفی
حسینؑ نفسِ مطمئنہ	آیت اللہ محمد علی

الامام الحسینؑ	ابن عساکر
الامام الحسینؑ فی حلہ البرفیر	سلیمان کتانی
عوالم الامام الحسینؑ البحرانی	شیخ عبداللہ بحرانی
عاشورا	شیخ کاظم احمد الاحسائی النجفی
حیاتِ امام حسینؑ (تین جلدیں)	باقر شریف قرشی
الملحمۃ الحسینیہ	آیت اللہ مرتضیٰ مطہری
نفس المہموم	آیت اللہ شیخ عباس قمی
حسینؑ مظہر آزادگی	سید جواد افتخاریان
سیاستہ الحسینیہ	آیت اللہ شیخ محمد حسین کاشف الغطا
سلام بر حسینؑ	محمود شتی
حسینؑ کیست	فضل اللہ کمپانی
خصائصِ حسینیہ	آیت اللہ شیخ جعفر شوشتری
دروس من ثورۃ الحسینؑ	عباس علی موسوی
عاشورا	آیت اللہ شیخ محمد مہدی شمس الدین
مع الحسینؑ فی نہضتہ	اسد حیدر
الشہید والثورۃ	ہادی مدرسی
فی رحاب کربلا	شیخ حسین کورانی
مقتل الحسینؑ	آیت اللہ سید محمد تقی بحر العلوم
نہج الشہادۃ	سید مرتضیٰ سید محسن حسینی
ماساۃ احدی وستین وثورۃ الخالدین	عبدالحسین نور الدین

واقعہ کربلا	شیخ الرکابی
مقتل الحسینؑ	عبدالرزاق مقرم
مقتل الشمس	محمد جواد صاحبی
شہید جاوید	صالحی نجف آبادی
زندگانی امام حسینؑ	سید ہاشم رسولی محلاتی
الحسین الشہید	حسین شاکری
عرفان وحماسہ	آیت اللہ جواد آملی
الامام الحسین	عبداللہ العلائلی
قامعۃ احل الباطل بدفع شبہات المجادل	شیخ علی بن عبداللہ بحرانی
مقتل حسینؑ	مترجم انصاری
چشمہ خورشید	مجموعہ مقالات کنگرہ بین المللی امام خمینی
اندیشہ عاشورا	مجموعہ مقالات کنگرہ بین المللی امام خمینی
الحسینؑ سماتہ وسیرتہ	محمد رضا حسینی
الحسینؑ فی طریقہ الی الشہادۃ	علی بن حسین ہاشمی
نیم رخی از حسین ابن علیؑ دربارۂ انقلاب خونین	سید علی اصغر احدی
ویژگیھائی امام حسینؑ	آیت اللہ شیخ جعفر شوشتری
قیامِ حسینی در آئینۂ اسنادِ تاریخی	عبدالکریم حسینی قزوینی
لولو ومرجان	آیت اللہ محدث نوری
رسالۃ الحسینؑ (مجلہ)	مرکز دراساتِ نہضتِ حسینؑ قم
مجلاتِ ثقافۃ الاسلامیہ	رایزنی جمہوری اسلام دمشق

مجلات الرصد	رایزنی جمہوری اسلامی لبنان
مختارِ حسینؑ	محمد صادق نجمی
شہر حسینؑ	محمد باقر مدرس
فوائد المشاہد	شیخ جعفر التستری
بحار الانوا	علامہ مجلسی
مقاتل الطالبین	ابوالفرج اصفہانی
اللھوف علی قتلی الطفوف	السید الجلیل ابن طاؤسؒ

أولاً: بنوهاشم

۱. علي بن أبي طالب.

۲. جعفر بن أبي طالب.

۳. أم الفضل بنت الحارث.